ہمارا رسماً تعارف ہوا۔ اب شیری نے ماہر شجریات کا روپ دھار کر میرے خاندانی شجرے کا ذکر چھیڑا۔ یہ سن کر کہ میں شاکردرانی کی بیٹی ہوں مصطفےٰ تھوڑا سا ٹھٹھکا۔ یہ ویسا معاملہ تو نہیں تھا جیسے رومیو اور جولیٹ کے خاندانوں میں سخت دشمنی تھی لیکن پھر بھی اس پر تھوڑا سا گراں گزرا۔ بھٹو صاحب نے میرے والد کے ساتھ بہت سخت رویہ اختیار کیا تھا اور انہیں جیل تک بھجوا دیا تھا۔ اُن دنوں مصطفےٰ کھر بھٹو صاحب کا دست راست تھا۔ وہ قطعی طور پر ایسا شخص نہ تھا جس کے میرے والدین صورت دیکھنے کے بھی روادار ہوں۔ "مجھے امید ہے آپ کے والدین بخیر ہوں گے۔ سیاست میں ناانصافیاں بھی ہوتی ہیں۔ آپ کے والد کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس میں ذاتی رنجش کو کوئی دخل نہ تھا۔" میرے سننے میں کچھ اور ہی آیا تھا۔

اس کے گرد جمع عورتوں نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے پرکھا تولا۔ مصطفےٰ اور میں آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہے۔ کوئی آفر نہیں آئی۔ میں اس پر پھسلی تک نہیں۔ میرے دل کی دھڑکن ذرا بھی تیز نہ ہوئی۔ مصطفےٰ نے مجھ پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا۔ غالباً اس بات کا احساس اسے خود بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھ پر ڈورے ڈالنے کا اسے فوری طور پر مزید موقع ملے۔

اس تمام عرصے میں انیس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب وہ نمودار ہوا۔ بڑا خوش تھا جیسے کوئی میدان مار کر آیا ہو۔ اس نے میزبان پر دیرپا اثر چھوڑا تھا۔ ہم دونوں سے خاص طور پر کہا گیا کہ کاک ٹیل پارٹی کے بعد ٹھہرے رہیں اور ڈنر کھا کر جائیں۔ انیس بہت ہی سادہ لوح تھا۔ میری کوئی حس مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں چلے جانا چاہیے۔ انیس ایسی نامعقول حرکت کرنے کا کبھی خواب میں بھی تصور نہ کر سکتا تھا۔ ہم اہم لوگوں کے درمیان تھے۔ رابطے بڑھ رہے تھے۔ مزید وزٹنگ کارڈ ہاتھ آنے کو تھے جنہیں جوڑ جوڑ کر کاغذی قلعے تعمیر کیے جا سکتے تھے۔ ہم ٹھہر گئے۔

اس رات رکھ رکھاؤ کی باریکیوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ڈنر کی میز پر مصطفےٰ میرے سامنے بیٹھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس جیسے آدمی اپنی جگہ آپ چنتے ہیں۔ یہی ہوا بھی۔ کھانے کے دوران ہم "یہ کیجیے نا، وہ دیجیے نا" قسم کی ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ اس نے مجھ سے میرے والدین کے بارے میں سوال کیے۔ پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے، وہ کہاں ہیں، وہ کیا کر رہے ہیں۔ میں اس کی طرف مائل ہوئی تو اس میں ہماری بات چیت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی آنکھوں نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ وہ شفاف ہو کر دمک رہی تھیں اور وہ انہیں کچھ زیادہ ہی تواتر سے جھپک رہا تھا۔ پھر وہ کانچ کے بنٹوں سے مشابہ ہو گئیں۔ بعد میں اس کی آنکھوں کی یہ کیفیت دیکھنے کے مواقع مجھے بارہا ملے۔ آنکھوں

میں یہ شیشے کی سی چمک صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی عورت اُسے پرکشش نظر آئی۔

ڈنر ختم ہوا تو ہم اٹھ کر کونیاک اور شراب کے لیے سٹنگ روم میں منتقل ہو گئے۔ مردوں نے سگریٹ اور سگار سلگا لیے۔ بعض خواتین نے بھی تقلید کی۔ مصطفےٰ کو بالکل واضح طور پر سردار کا رتبہ حاصل تھا۔ باقی سب لوگ اچھوت تھے (اور وہ بھی زیادہ تر نلل بیگی)۔ اس کا شاہانہ دبدبہ میرے تجسس کو گدگدائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کبھی کوئی چیز آپ طلب نہ کرتا تھا۔ وہ خود بخود اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ ابروؤں کی ذرا سی جنبش، کلائی کی غیر محسوس حرکت دیکھتے ہی لوگ تعمیلِ ارشاد کے لیے اچھل کھڑے ہوتے۔ اس کا جام کبھی خالی نظر نہ آتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں موجود تمام مردوں کے درمیان اس کے جام کو پُر کیے رکھنے کا مقابلہ جاری ہے۔ بظاہر وہ اس کی پینے کی رفتار اور پسند ناپسند سے آگاہ تھے۔ کھر خاموش دُھن بجا رہا تھا اور لوگ اس کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ ایک بار مصطفےٰ نے جیسے ہی نپولین برانڈی سے بھرا اپنا جام خالی کیا تین آدمی اس کی طرف بڑھے۔ مصطفےٰ نے مشاق انگلیوں کی مدد سے اپنے سگار کو گھمایا۔ بیسیوں آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے سگار کو ہونٹوں سے لگایا ایک سگار تراش نمودار ہوا۔ سگار کا سرا کترے جانے کی دیر تھی کہ بجلی سے چھ لائٹر جل اٹھے۔ بادشاہ سلامت کے لیے یہ باتیں روزمرہ کا معمول تھیں۔ میں مزے لے لے کر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

ہم رخصت ہوئے۔ انیس پر سرور طاری تھا۔ اقتدار کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔

اگلی صبح ہمارے نام فون آیا۔ فون مسٹر آغا جمال اور ان کی بیگم پروین نے کیا تھا۔ وہ مصطفےٰ کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ دوپہر کا کھانا ہم ان کے ہاں کھائیں۔ انیس کہیں اور جانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس کا بس چلتا تو جھنجلاہٹ کے مارے اپنا سر دیوار میں دے مارتا۔ "کوئی مسئلہ نہیں" فون پر سنائی دینے والی مصر آواز نے کہا۔ "ہم رات کا کھانا ساتھ کھا لیں گے۔" میں حیران ہوئی کہ انہوں نے دوپہر کا کھانا کیا صرف اس لیے منسوخ کر دیا تھا کہ ہم اس میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

اس رات ہم اس جادو بھرے حلقے کے رکن بن گئے۔ ہماری جس ٹولی سے ملاقات ہوئی اس نے ہمیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ان سب لوگوں میں ایک بات مشترک تھی۔ مصطفےٰ کھر۔

میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے کھینچے لیے جا رہا ہے۔ کچھ زیادہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ واقعی کوئی زیریں رو مجھے کھینچ رہی تھی یا یہ محض میرے تخیل کی کارفرمائی

تھی۔ میں نے ابتدا میں اسے بیزاری اور اکتاہٹ کا نتیجہ قرار دیا۔ میں چاہتی تھی کہ میرے ساتھ کوئی انہونی بات پیش آئے۔ میری آرزو تھی کہ زندگی میں کوئی رونق کا سامان ہو۔ تاہم مصطفےٰ شادی شدہ مرد تھا۔ اس کی بہت دلکش بیوی تھی جو بظاہر اس پر جان چھڑکتی تھی۔ میں صرف بائیس برس کی تھی۔ وہ بیالیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے مزاج میں آتی پختگی تھی۔ میں کسی بے طرح بگڑی ہوئی رومان زدہ لڑکی کی سی حرکتیں کر رہی تھی۔ آپس میں الس بڑھے تو تجسس کو بھی پر لگ جاتے ہیں۔

مصطفےٰ کھر ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ ہماری زندگیوں نے اس شخص کے گرد گھومنا شروع کر دیا۔ جلد ہی ہماری. تقریباً روزانہ دوپہر اور رات کے کھانے پر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں سمجھتی تھی کہ زیادہ لوگوں کی موجودگی تحفظ کی ضامن ہوتی ہے۔ مجھ پر جلد ہی انکشاف ہوا کہ آدمی بھیڑ میں بھی تنہا ہو سکتا ہے۔ ان دعوتوں میں ہر کوئی اپنی اپنی بیگم کے ساتھ آتا۔ ان میں چھڑا چھانٹ کوئی نہ تھا۔ نہ ان میں سے کوئی کسی دوست لڑکی کو ساتھ لے کر آتا۔ گفتگو زیادہ تر شکار کے گرد گھومتی اور ہر کسی کے پاس سنانے کے لیے کوئی نہ کوئی من پسند کہانی ہوتی۔ مرد شکار کی اگلی مہم کا منصوبہ تیار کرنے یا پچھلی بار کی زبردست شکاری مہم کے دوران پیش آنے والے واقعات کا باریکی سے جائزہ لینے میں مگن رہتے۔ خواتین بڑے فخریہ انداز میں ان کی باتیں سنتیں اور ان کے میک اپ سے آراستہ چہروں پر بیزاری کے کوئی آثار تک نظر نہ آتے۔ وہ سب کی سب اپنے شوہروں کا ساتھ نبھانے والی بیویاں تھیں۔ شکاریوں کی بیویاں۔ ایک آدمی کے سوا۔ انیس واضح طور پ اس گروہ میں کسی طرح فٹ نہ ہوتا تھا۔ یہی حال میرا تھا۔ گفتگو میں تو ہم حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اس لیے بڑے شوق سے ان کی باتیں سنتے رہتے۔

کبھی کبھار گفتگو کی تان آ کر مجروں پر ٹوٹتی۔ مرد حضرات، اپنی بیگمات کے جذبات کو قطعی طور پر فراموش کر کے، کسی نہ کسی ناچنے گانے والی کے حوالے سے وجد میں آ جاتے۔ بیویاں بڑی احتیاط سے اپنے احساسات پر پردہ ڈالے رکھتیں اور اپنے مردوں کی ان خیالی عیاشیوں کو، جن سے وہ آنکھیں سینکتے رہتے تھے، بے ضرر سے مردانہ دل بہلاوے کے سوا کچھ نہ سمجھتیں۔ ہمارے سننے میں آتا کہ فلانی کے جسم میں یوں "لچک" ہے اور ڈھمکانی یوں "بھاؤ" بتاتی ہے اور فلاں جو ہے وہ رات بھر کی اتنی خرچی لیتی ہے۔ یہ سب باتیں میرے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ معاشرے کے یہ چیدہ افراد، مستطیق ہونے کے ناتے، اسطرح کے قدرے خلاف تہذیب موضوعات سے نمٹ سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس نوعیت کی بات چیت کی میرے والدین کے گھر میں بالکل اجازت نہ تھی۔ ہمارے ان

دوستوں" کو درانی گھرانے کی طرف سے کوئی سنہرے حاشیوں سے سجا دعوت نامہ کبھی موصول نہ ہو سکتا تھا۔ ان کے اس انداز میں کہ اپنے جیسے منتخب روزگار افراد کے سوا کسی سے ملنے ملانے کی ضرورت نہیں سمجھی زیادہ تک چڑھا پن پایا جاتا تھا۔

ایک اور موضوع، جو تواتر سے زیر بحث آتا، دسترخوان تھا۔ میں نے ان سب چیزوں کو ملاجلا کر دیکھنا چاہا۔ شکار اور دسترخوان کا تو ربط بنتا تھا۔ لیکن مجرے؟ اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ جاگیردارانہ ذہن میں عورت بھی شکار ہے۔ اس کی جھانجریں بجتی ہیں اور لہراتے ہوئے کرلسی نوٹ چارا۔

اس طرح مل جل کر رہنے سے ہمیں منفرد مقام حاصل ہو گیا۔ ہمارے گروہ کا برم جمعہ رہنے لگا۔ مصطفےٰ کھر کے حوالے سے تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی بحث چھڑی رہتی تھی۔ اب ہم بھی اسی کے گروہ میں شامل تھے۔ چنانچہ ہم بھی متنازعہ قرار پائے۔ لوگ انیس کو اور مجھے مصطفےٰ کے بارے میں خبردار کرنے لگے۔ ہمارے سامنے اس کے وہ کارنامے دہرائے گئے جو وہ پنجاب کے عظیم ڈون جوان کے طور پر انجام دے چکا تھا۔ "وہ عورت باز ہے۔ اسے روز نئی عورت چاہیے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ انیس یار اس سے بچ کر رہو۔ خبیث آدمی ہے۔ تمہیں نقصان پہنچا کر رہے گا۔"

انیس پر ان تنبیہوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ جاگیردار نہیں یا شکار نہیں کھیلتا۔ وہ مصطفےٰ کا دوست ہے۔ مصطفےٰ میں بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ کبھی اس کے دن بھی پھریں گے۔ تب یہ یارانہ سودمند ثابت ہو گا۔ آج بوؤ کل کاٹو۔ وہ بڑی آسانی سے یہ بھول گیا کہ نلائی بھی کرنی ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کی جوان بیوی ہے۔ وہ اس اہمیت کے مزے لوٹنے میں مو تھا جو اسے تازہ تازہ نصیب ہوئی تھی۔ مصطفےٰ نے اس کا دل موہ لیا تھا۔

یہ بنکے چھبیلے شہری باؤ اور دیہاتی کے تضاد کی کلاسیکی مثال تھی۔ انیس کو کبھی دیہاتی ذہن سے سابقہ نہ پڑا تھا جو بیشتر وقت سازشوں اور چال بازیوں کا جال بچھانے میں مصروف رہتا ہے۔ شہر کا رہنے والا عادت پرست ہوتا ہے۔ قانون کا لحاظ اس کی عادات و اطوار کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ چیزوں اور معاملوں کی ظاہری حالت ہی کو ان کا اصل سمجھتا ہے اور اسی حوالے سے قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جاگیردارانہ ذہن ہر وقت عیارانہ جال بچھانے کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ انیس سمجھتا تھا کہ مصطفےٰ سوز آدمی ہے۔ قدرتی طور پر اسے مصطفےٰ سے لگاؤ ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ ہی نہ سکا کہ مصطفےٰ کی ذات میں ایک فریب کار سرگرم عمل ہے۔ اتنی باریک بینی انیس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے بہلا پھسلا کر صید گاہ کی طرف لایا جا رہا تھا اور اسے مطلق خبر نہ تھی کہ

شکار کا آغاز ہو چکا ہے۔ شکار مجھے کیا جانا مقصود تھا، بھینٹ انیس نے چڑھنا تھا۔ ہمارے گروہ کے مراسم پورے آٹھ مہینے قائم رہے۔ یہ مدت مصطفےٰ کے لیے کافی تھی۔ اسے ہماری راہ میں کنویں کھودنے کے لیے خاصا وقت مل گیا۔

کسی براہِ راست سلسلہ جنبانی کی نوبت نہ آئی۔ میں صرف قیاس دوڑاتی اور انتظار کرتی رہ گئی۔ مصطفےٰ نے مجھ سے کوئی ایسی بات کبھی نہ کی جس پر ذرا سا گمان بھی ہو سکتا کہ مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرے ساتھ وہ رسمی انداز اختیار کیے رہا لیکن اس انداز میں کوئی روکھا پن نہ تھا۔ رویہ دوستانہ تھا مگر درمیان میں بڑی احتیاط اور توجہ سے فاصلہ رکھے ہوئے۔ اس نے کبھی کوئی چکر چلا کر مجھ سے تنہائی میں ملنے کی کوشش نہ کی۔ چاہے جانے کے اس اسلوب سے میرا تجسس دوچند ہو گیا۔ تقریباً ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مصطفےٰ اپنی شہرت پر لگے تمام داغ دھبے دھونے میں مصروف ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے بارے میں ازسرِنو کوئی رائے قائم کروں۔ اس کا ہر فعل پکار پکار کر یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ دیکھو میں عورت باز نہیں، میں اوباش نہیں۔ مجھے غلط سمجھا گیا ہے۔ وہ میرا احترام کرتا رہا۔ میں کوئی فاحشہ نہ تھی جس سے شہوانی خواہشات پوری کرنے کا کام لیا جانا مقصود ہو۔ وہ آرزومند تھا کہ میرا دل ہوس پرستی کے ذریعے نہیں بلکہ عشق جتا کر جیتے۔ بائیس برس کی انیلی عورت ہوتے ہوئے بھی مجھ سے اکل کھرا پن ضرور پھوٹا پڑتا ہوگا۔ مصطفےٰ تھوڑا تھوڑا مجھ سے مرعوب ہوا۔ وہ میری مزاحمت کی سختی کو کم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے جیتنے کے لیے خوب سوچ سمجھ کر جو منصوبے تیار کیے تھے ان کی تکمیل کے لیے میری موجودگی اشد ضروری تھی۔

گفتگو کے دوران جب بھی سیاست کا موضوع چھڑتا تو مصطفےٰ کا جوش و خروش دیدنی ہوتا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ سوشلسٹ ہے۔ وہ تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھا جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ وہ معاشرے کے غریب اور مراعات سے محروم طبقوں کا ذکر چھیڑتا۔ رکشا چلانے والوں اور کسانوں اور مزدوروں جیسے عام آدمیوں کے بارے میں خلوص سے بات کرتا۔ ان کے دکھ درد کو محسوس کرتا۔ ان کی ضرورتوں کو سمجھتا۔ وہ ان کا قائد تھا۔ اس نے انھیں پسینہ بہاتے دیکھا تھا۔ اس پسینے کی بُو آج تک اس کے نتھنوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اجلاف کا، رذالوں کا، نیچ لوگوں کا رہنما تھا۔ اس جیسے آدمی کو میرے والدین اور ان کے امیرانہ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ نفرت کا پرچار کرنے والے جھوٹی امیدوں کا بازار لگا کر امیروں اور غریبوں کے درمیان حائل خلیج کو عریض تر کر رہے تھے۔ انھوں نے روزافزوں توقعات کے جن

کو بوتل سے باہر نکال دیا تھا۔ اعلیٰ سماج والے ان کی صورت دیکھنے کے روادار بھی نہ تھے۔

میرے لیے یہ باتیں خون گرمانے والی تھیں۔ مصطفےٰ ان خیالات کو زبان عطا کر رہا تھا جو بچپن سے میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ میں کبھی ان کو کوئی واضح شکل نہ دے پائی تھی۔ میں ایسی باغی تھی جسے ناانصافیوں کے خلاف، کمزوروں پر ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے کسی کاز کی تلاش تھی۔ مصطفےٰ میرے لیے اس کاز کے تمام پہلوؤں کا تعین کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میری دلچسپی اس سے چھپی نہ رہی ہوگی۔ وہ گفتگو کا رخ سیاست کی طرف پھیرنے کا اہتمام کرنے لگا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں کانٹا نگلنے ہی والی ہوں۔

میں نے اسے سراپا شرافت پایا۔ عورتیں اس کی نظر میں قابلِ تعظیم ہستیاں تھیں۔ وہ ہماری ٹولی میں تمام خواتین کے ساتھ احترام اور خوش خلقی سے پیش آتا۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی کوئی خاتون کمرے میں قدم رکھتی وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور کرسی کھینچ کر اسے بیٹھنے کی دعوت دیتا۔ وہ خلیق اور تمیزدار تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ خوبیاں اس میں فطرتاً موجود ہیں۔ اس میں سطحی پن کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ مشہور تھا کہ وہ اکھڑ اور اوچھا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ آتش خو ہے اور رحم کھانا نہیں جانتا۔ مجھے تو اس کی روح میں رتی بھر سنگینی نظر نہ آئی۔ وہ مجھے اچھی تربیت کی اعلیٰ مثال معلوم ہوا۔ اس کے بارے میں مجھے تجسس رہنے لگا۔ وہ میرا موضوعِ خیال بن گیا۔ سیاست کے بارے میں مصطفےٰ کے جوشیلے رویے نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میری ازدواجی زندگی میں جو خالی پن تھا وہ مجھ پر اب بوجھ نہ رہا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے لہو کو رگ و پے میں کسی ایسے مقصد کی خاطر دوڑتے محسوس کیا جو محض چاہے جانے کی خواہش سے بہت آگے کا معاملہ تھا۔

جب ازدواجی زندگی میں بدمزگی راہ پاتی ہے تو بڑی ہلچل مچتی ہے لیکن انیس کو اور مجھے اس کا کوئی تجربہ نہ ہوا۔ ہم پر بھولپن طاری رہی۔ لڑنے جھگڑنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئی۔ بے وفائی کے جھکڑوں نے آ کر ہمارے بیزار کن سکون کو کبھی تہ و بالا نہ کیا۔ انیس کو اس تبدیلی کی سرے سے کوئی خبر نہ تھی جو میری زندگی میں در آئی تھی۔ کوئی زیادہ حساس مرد ہوتا تو ان چھوٹے چھوٹے اشاروں کو دیکھے بغیر نہ رہ سکتا جن کے ذریعے زناکاری پر آمادہ عورت بڑی ڈھٹائی سے اپنا عندیہ ظاہر کرتی رہتی ہے۔ انیس ہمارے باہمی تعلقات کی ادھوری کیفیت سے آگاہ نہ تھا۔ اس نے شک کو کبھی اپنے ذہن میں کلبلانے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس مکمل طمانیت اور آسودہ خاطری سے میں چڑ سی گئی۔

میں کہتی کہ، الٰہی، کاش اس کی آنکھیں کھل جائیں۔ کاش کہ وہ رعب ڈال کر مجھے، جو
تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی، دوسری طرف جا گرنے سے روک لے۔ جو نشیب
میرے سامنے تھا وہ مجھے پھسلا کر اپنی طرف بلا رہا تھا۔ گھبرا کر اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔
میں جانتی تھی کہ میں اس میں جا گروں گی۔

جب انیس اور میں پہلی بار مصطفیٰ اور اس کی بیگم، شیری سے ملنے گئے تو ہمیں
ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کی منصوبہ بندی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ وہ دونوں مری جانے
والے تھے۔ جس طرح سامان پیک ہو رہا تھا اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ شاید کسی
"سفاری" کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ شیری ایک جہازی پیٹی پر جھکی ہوئی اسے مصطفیٰ
کے کپڑوں اور جوتوں سے بھرے چلی جا رہی تھی۔ یہ اسی قسم کی پیٹی تھی جس میں موسم
گرما کی ابتدا ہوتے ہی لحاف رضائیاں سنگوا دی جاتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کپڑوں اور
جوتوں کی شاید ہی کوئی قسم ہو جو موجود نہ ہو۔ ابھی ململ کا کرتا رکھا گیا تو اس کے فوراً
بعد ایک نہایت جگادری کوٹ کی باری آئی جو جنگِ عظیم کے دوران میں انتہائی شاندار
لگتا۔ اس کے علاوہ ٹی شرٹیں، بشرٹیں، کلف لگی ہوئی قمیضیں، دھاری دار قمیضیں، چار
خانوں والی قمیضیں اور جوتے جن میں ویلنگٹن شوز سے لے کر مگرمچھ کی کھال کے بنے
ہوئے جوتوں تک ہر قسم کا نمونہ موجود تھا۔ جتنی بھی قسموں کی پتلونوں اور قمیضوں کا
تصور کیا جا سکتا ہے ان سب کا پیٹی میں قرینے سے انبار لگا ہوا تھا۔ کیا پیٹی تھی کہ اس
کا پیٹ بھرنے میں نہ آ رہا تھا۔ مجھے بڑا تجسس ہوا۔ "کیا آپ لوگ بہت دنوں کے
لیے جا رہے ہیں؟" میں نے شیری کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا جس پر طاری
کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ کام میں پوری طرح منہمک ہے۔ وہ اپنی فہرست میں چیزوں
پر صاد کا نشان لگانے میں مشغول تھی۔ "نہیں" اس نے نظر اٹھا کر دیکھے بغیر جواب
دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے سوال کی وجہ سے اس کا حساب گڑبڑ ہو گیا ہے۔ اس نے
آنکھیں سکیڑیں اور تمام توجہ سختی سے کام پر مرکوز کر دی۔ اپنی مساعی سے مطمئن ہو کر
اس نے ایک بڑا سا لکڑی کا صندوق طلب کیا۔

اس صندوق میں دوائیاں بھری ہوئی تھیں۔ فارمافون، ملٹی وٹامن گولیاں، کھانسی
کے شربت، کوڈوپیرو کیپسول، لسٹرین، تھروٹ پینٹ، ایوڈین، جگر کے لیے لٹروسین،
الکاسیلٹزر، بلڈپریشر کی گولیاں، بھانت بھانت کی سپرینیں، پٹیاں، بینڈایڈ قینچیاں،
آنکھوں میں ڈالنے کی دوائیاں، ناک میں ڈالنے کی دوائیاں، تھرمامیٹر اور کسی بھی قسم
بلکہ ہر قسم کی ہنگامی حالت سے نمٹنے کے لیے تریاق اثر ادویات اس میں جمع تھیں۔ یہ
نہایت بڑھیا قسم کا محافظ جان کٹ تھا۔ ایک بار پھر میں نے شیری سے سوال کیا۔ اس

بدحواس باختہ ہو کر۔ "کیا مصطفیٰ اس قدر بیمار ہیں؟" اس نے نظر اٹھا کر میری طرف
دیکھا اور اپنے شوہر کی صحت کے بارے میں میری فکرمندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے
یہ پُراسرار جملہ کہا۔ "نہیں۔ لیکن یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کس وقت وہ کیا مانگ بیٹھیں۔"

اس وقت تو یہ جملہ میرے بالکل ہی پلے نہ پڑا۔ مصطفیٰ سے بہتر طور پر واقف
ہونے کے بعد میں اس جملے کے اسرار و رموز سمجھنے کے قابل ہو سکی۔ پرانے وقتوں
کے سکاؤٹوں کی طرح ہم نے اس مقولے کو اپنا لیا تھا: "تیار رہو۔" ہمیں معلوم تھا کہ
ناقص منصوبہ بندی کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

میرا ذہن ایک پکچر گیلری تھا۔ مصطفیٰ کی زندگی کے مختلف ادوار کی آہستہ آہستہ
نمائش جاری تھی۔ میں نے اس کی زندگی سے اکا دکا واقعات اور سانحات چن کر مسٹر کھر
نامی سیاست دان، دوست، عاشق اور شوہر کے معاشقوں اور زندگیوں کا تجزیہ شروع کیا۔
میری توجہ اس کی شادیوں پر مرکوز ہو گئی۔ میں اضطرار کے عالم میں یہ جاننا چاہتی تھی
کہ میں جو قدم اٹھانے والی ہوں اسکے نتیجے میں آگے چل کر میرے ساتھ کیا پیش آ سکتا
ہے۔

مصطفیٰ نے اپنے والد کے اصرار پر اپنی رشتے دار وزیرہ سے شادی کی۔ یہ
جاگیردارانہ رسموں اور روایتوں کے عین مطابق تھا۔ بیوی کی عمر مصطفیٰ سے کہیں زیادہ
تھی۔ مصطفیٰ اُس وقت بمشکل سترہ برس کا تھا۔ زناشوئی کا رشتہ قائم ہو گیا اور وزیرہ کے
بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ مصطفیٰ کا دم گھٹنے لگا۔ وہ گاؤں سے بھاگ گیا۔ اصل میں وہ
ازدواج سے بچنے کے لیے فرار ہوا تھا۔ بیوی کو چھوڑ کر بھاگ جانے پر اس کے والد نے
طیش میں آ کر اسے خوب برا بھلا کہا اور عاق کر دینے کی دھمکی دی۔ مصطفیٰ ان پڑھ بیوی
کے پاس لوٹنے کو تیار نہ تھا۔ اس میں وزیرہ کا کوئی قصور نہ تھا۔ انھیں ایک بے لوچ
نظام نے بیاہ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ خود مصطفیٰ بھی کوئی خاص پڑھا لکھا یا باخبر
نہیں تھا۔ اس نے جو زندگی گزاری تھی اس میں دوسروں سے ملنے ملانے کے مواقع
بہت کم تھے۔ وہ ابھی ایک جگہ ٹک کر گھر بار کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار نہ
تھا۔ اسے جوانی کے مزوں کا نیا نیا پتہ چلا تھا اور وہ انھیں لوٹنے کے لیے بے تاب ہو
رہا تھا۔ وہ بھاگ کر پہلے ملتان آیا اور شہر کو چھان مارا۔ اس کے بعد اس نے لاہور کا رخ
کیا۔ لاہور دیکھ کر کوٹ ادو سے آنے والے دیہاتی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جب
وہ دیکھتا کہ عورتیں، فیشنی انداز میں بال سجائے، کاروں میں سٹیرنگ وہیل سنبھالے
بنی ٹھنی ہوئی ہیں تو بس ہونقوں کی طرح تکتا ہی رہ جاتا۔ ابھی اس میں اتنی مجلسی
شائستگی نہیں آئی تھی کہ ان سے بات چیت کر کے اپنے طور پر یہ جان سکتا کہ عورتیں

محض شوق پورا کرنے کی چیزیں نہیں۔ نہ ان کی حیثیت ایسے دم چھلوں کی ہے جن سے بس ایک خاص کام لینا منظور ہو۔ وہ ابھی صرف دور دور سے ان کے بارے میں ہوس ناک باتیں سوچ سکتا تھا یا یہ امید کر سکتا تھا کہ ایک روز وہ بھی ان برفاب دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں ہوگا۔

مصطفٰے کا مری سے گزر ہوا جو ہل سٹیشن بھی ہے اور سیاحوں کی تفریح گاہ بھی۔ وہاں پہنچ کر اسے نہ صرف میدانی علاقوں سے بلکہ یکسانیت کی شکار زندگی سے دامن چھڑانے کا موقع ملا۔ اس کا ایسی عورتوں سے رابطہ قائم ہوا جو رقم کے عوض اپنی دلفریبیوں کا سودا کرتی تھیں۔ نوجوان گھر نے ان کے پاس پہنچ کر چین کا سانس لیا۔ اس میل جول کا وہ پہلو جس کا تعلق بھاؤ تاؤ کرنے سے تھا مصطفٰے کو راحت آمیز معلوم ہوا۔ وہ منڈیوں کو چھان مارتا، مال کا جائزہ لیتا اور خدمات کرائے پر حاصل کرتا۔ کسی کو غیر مشروط طور پر خرید لینے سے ابھی وہ ڈرتا تھا۔ اسے اپنی آزادی عزیز تھی۔ عورتوں کو یہ نوجوان جاگیردار بڑا پیارا لگتا جو اپنی نامراد شادی کی دکھ بھری کہانی سنانے پر تلا رہتا تھا۔

بیوی غریب چپ چاپ دکھ سہتی رہی۔ جب خاندان کے بڑوں نے اسے مصطفٰے سے طلاق دلوا کر کہیں زیادہ نوجوان دیور سے بیاہ دیا تو اس کی رسوائی دوچند ہو گئی۔ وہ مطلقہ کی حیثیت سے میکے واپس جانے کی اہانت سے بچ گئی۔ جسے جاگیردارانہ نظام میں موت سے بھی بدتر حشر سمجھا جاتا ہے۔

سیلانی بیٹا گھر سے دُور دُور ہی رہا۔ اسے اپنے کیے پر شرمندگی تو تھی لیکن سمجھتا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ اپنی زندگی کے عظیم ترین مفاد میں کیا ہے۔ جب وہ سماجی سیڑھی پر مستقل مزاجی سے قدم بہ قدم اوپر چڑھتا جائے گا تو گلے پڑی بیوی بوجھ ہی ثابت ہوگی۔

مری میں مصطفٰے کو فردوس مل گئی جو اس کے ایک نئے نئے بنے دوست شفیع کی داشتہ تھی۔ فردوس حاملہ تھی۔ شفیع رفوچکر ہو چکا تھا۔ فردوس سے شادی کرنے کی پکی قسم کھانے کے بعد اب وہ اپنے قول قرار سے منکر ہو گیا تھا۔ صدمے کی وجہ سے لڑکی کی بری حالت تھی۔ اسے کسی کے کندھے کی ضرورت تھی جس پر وہ سر رکھ کر رو سکے۔ مصطفٰے نے اپنا کندھا پیش کیا۔ وہ فردوس اور اس کی ماں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ غلط فہمی کی بنا پر ہمدردی کو محبت سمجھ لیا گیا۔ مصطفٰے نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اس طرح کی حرکت تھی جو آدمی جوش میں آ کر بیٹھتا ہے۔ لڑکی حاملہ تھی۔ اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا۔ شکل کی اچھی تھی اور تھوڑی سی پڑھی لکھی بھی تھی۔ وہ

نسبتاً زیادہ مہذب تھی۔ مصطفٰے کے لیے معیاروں کا تعین ابھی دیہات کی انھیں عورتوں کے حوالے سے ہوتا تھا جن سے پیچھا چھڑا کر وہ بھاگ آیا تھا۔ مصطفٰے کو اس بنا پر کچھ پریشانی نہ تھی کہ فردوس شفیع کی داشتہ رہ چکی تھی۔ اسے یہ پروا بھی نہ تھی کہ فردوس کی مال چھوٹا موٹا سا چکلا چلا رہی ہے۔ اس کی نظر میں فردوس ایسی عورت تھی جس کی آبرو لُٹ چکی تھی مگر جو تھی دل کی کھری۔ وہ معاشرے کی ستائی ہوئی تھی۔ فردوس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ مصطفٰے نے اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔ فردوس جلد ہی دوبارہ حاملہ ہو گئی۔ بچو نے جنم لیا۔ مصطفٰے ان سب باتوں سے سٹپٹا سا گیا۔ کسی نہ کسی وجہ سے اسے زچگیوں سے چڑ تھی جیسے بچے جننے والی عورت اس کے ساتھ کوئی دشمنی نکال رہی ہو۔ ان مواقع پر اس کی سرشت کا بدترین پہلو سامنے آ جاتا تھا۔ جونہی کوئی عورت اس کے نطفے کو پیٹ میں پالنا شروع کرتی وہ اس سے متنفر ہو جاتا۔ ابھی فردوس ہسپتال میں زچگی کے بعد سنبھالا لے رہی تھی کہ مصطفٰے نے اسے طلاق کے کاغذات بھجوا دیے۔ اس نے ایک بار پھر غلط وجہ سے شادی کی تھی۔ رحم اور ترس پروان چڑھ کر محبت کا روپ نہ دھار سکے۔

گاؤں اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ مصطفٰے واپس چلا گیا اور بزرگوں نے اسے معاف کر دیا۔ اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور انتخابات میں طاقتور گرمانی خاندان کے ایک نوجوان چشم و چراغ کو ہرا دیا۔ اب وہ قومی اسمبلی کا رکن تھا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں۔ اسے ابھی تک ایسی عورت کی تلاش تھی جو اس کی نظر میں مثالی ہو۔ اس کی ابھی یہ حیثیت نہ ہوئی تھی کہ کسی کو اپنے آپ چن سکتا۔ وہ ٹھکرائے جانے سے ڈرتا تھا اور ہمیشہ کسی ایسی عورت پر اکتفا کر لیتا جسے اور جو چاہے سمجھا جائے بہترین انتخاب ہرگز نہ کہا جا سکتا۔ نچلے طبقے تک رسائی آسان تھی۔ اپنے آدرش تک پہنچنے کے لیے وہ اپنے اعتماد میں بتدریج اضافہ کر رہا تھا۔ میں اس کی غلطیوں کو سمجھ اور پہلی دو شادیوں کو معاف کر سکتی تھی۔

اس کی نئی محبوبہ لاہور کے ایک کالج کی طالبہ تھی۔ بہت سال بعد مصطفٰے نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ اسے محبت ہوئی تھی تو بس اسی لڑکی سے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کی محبت کی تکمیل نہ ہو سکی۔ مجھے اس وقت تک پتہ چل چکا تھا کہ مصطفٰے اپنی عورتوں سے اکتا جاتا ہے۔ انھیں ہر وقت ہوا میں تنے ہوئے رسے پر چلنا پڑتا تھا۔ وہ لڑکی بہت سیدھی سادی تھی۔ اس نے مصطفٰے کے دکھ درد کو جان لیا اور وہ سہارا فراہم کر دیا جس کے لیے وہ بلک رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اس سے والہانہ محبت بھی کرتی تھی۔

انھوں نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ملتان جاتے ہوئے اثنائے راہ میں

پکڑے گئے۔

جاگیردارانہ روایت ان پریمیوں کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ وہ کسی اور کی منگیتر تھی۔ اپنے رشتے زاد کی۔ لڑکی کا باپ غصے کے مارے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے مصطفےٰ کو سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ قومی اسمبلی کا نوجوان رکن اپنی پہلی پکی محبوبہ سے دست بردار ہو گیا اور کسی آج کے زمانے کے رانجھے کی طرح اپنے آنسو پی لیے۔ لڑکی اپنے قول قرار پر قائم رہی۔ اس نے اصرار کیا کہ پہلے مصطفےٰ شادی کرے۔ ہتھیلیوں کو مہندی لگا کر اپنی قسمت کی لکیر وہ صرف تبھی مٹائے گی جب مصطفےٰ کی شادی ہو چکے گی۔ وہ بحران کے دن تھے۔ لڑکی کے باپ نے مصطفےٰ کی منت کی کہ شادی کر لے۔ اس نے اپنی پگ اتار کر نوجوان جاگیردار کے قدموں میں رکھ دی۔ جاگیردارانہ نظام میں پگ عزت آبرو کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ مصطفےٰ کو جھکنا ہی پڑا اور اس نے بڑے میاں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی التجا بر لائے گا۔ ایک بار پھر مصطفےٰ دردمند انسان کے روپ میں سامنے آیا۔ وہ بے رحمی کہاں گئی جس کی داستانیں مشہور تھیں؟ میں نے محسوس کیا کہ میری نظر میں مصطفےٰ کی توقیر بڑھ گئی ہے۔ یہ شخص تو اصل میں ایسا ولی صفت انسان تھا جسے غلط سمجھا گیا تھا۔

قومی اسمبلی کے رکن کے طور پر مصطفےٰ سفر میں رہتا۔ طیاروں کے ذریعے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ جلد ہی اس کی صفیہ نامی ایک ایرہوسٹس سے ملاقات ہو گئی۔ مصطفےٰ قومی اسمبلی کے سیشن میں شرکت کرنے ڈھاکے جا رہا تھا۔ طیارے پر کھانا پیش کیا جانے لگا۔ مصطفےٰ نے دیکھا کہ دو پیارے پیارے ہاتھ بڑے چمچے سے اس کی پلیٹ میں کری ڈال رہے ہیں۔ نظر اٹھائی تو سبز رنگ میں ملبوس ایک صورت دکھائی دی جس پر چھلاوے کا گمان ہوا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مصطفےٰ سماجی سیڑھی پر اوپر کی طرف گامزن تھا۔ تیس ہزار فٹ خاصی بلند ہوتی ہے۔ طیارے سے اترتے وقت وہ ترنگ میں آ کر مڑا اور صفیہ سے دریافت کیا کہ کیا دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ صفیہ نے لجا کر اثبات میں سر ہلایا۔

ڈھاکے میں اگلے دو دن صفیہ کے ساتھ گزرے۔ مصطفےٰ کو پتہ چلا کہ اس کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور وہ اپنے خاندان کو سہارا دینے کے لیے ملازمت کر رہی ہے۔ جاگیردارانہ پس منظر سے تعلق رکھنے والے مردوں کو ایسی عورتوں سے ملنے ملانے کا موقع شاذ ہی ملتا ہے جو آزادانہ زندگی گزار رہی ہوں۔ وہ تو ایک ایسی دنیا میں سانس لیتے ہیں جہاں مردوں کو سراسر بالادستی حاصل ہے۔ عورتوں سے پارٹیوں یا پکنکوں پر یا کلبوں میں ملاقات کرنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ ایرہوسٹسیں انھیں پراسرار معلوم ہوتی

ہیں جیسے وہ انتہائی رومانی رنگ میں ڈوبی ہوئی سرطراز پتلیاں ہوں۔ اس پس منظر سے تعلق رکھنے والے مردوں کے لیے ایسی عورتوں کے عشق میں مبتلا ہونا اور ان سے شادی کر لینا بہت عام سی بات ہے۔ شادی کے بعد ان سے ملازمت چھڑوا دی جاتی ہے اور وہ کلی طور پر اپنے خاوندوں کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایرہوسٹسیں ان کے لیے سرخاب کا پر ثابت ہوتیں۔ دوسرے جاگیرداروں کو رشک آتا کہ خوب ہاتھ مارا ہے۔ ایرہوسٹیس کو کسی نہ کسی لحاظ سے ان معمولی اور سادہ گھر والیوں سے بالاتر سمجھا جاتا جو انھیں اپنے دیہات میں میسر تھیں۔ ان شادیوں میں مہم جوئی کا سا مزہ تھا۔ جب صفیہ اور مصطفےٰ کراچی لوٹے تو انھوں نے شادی کر لی۔ شادی کی اطلاع اس نے سب سے پہلے اپنی کالج والی محبوبہ کو دی۔ اطلاع دینے کا مطلب یہ تھا کہ اب تم بھی شادی کرنے کے لیے آزاد ہو۔ صفیہ سے شادی کی بدولت کسی اور کو بھی ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا پروانہ مل رہا تھا۔ شادی کرنے کی یہ وجہ بھی غلط تھی، میں نے سوچا۔ ایک اور غلطی۔

شادی ہونے کی دیر تھی کہ مصطفےٰ پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ جاگیردار بالعموم ہوا کرتے ہیں۔ اس نے صفیہ کی ان تمام خوبیوں کو جن پر وہ مرمٹا تھا، کچل ڈالا۔ اسے برقع پہنا کر کوٹ ادو چلتا کر دیا گیا۔ جو بیچاری گنوارن نہ تھی اس سے توقع کی گئی کہ وہ گنوارنوں کے اطوار اپنا لے گی۔ کتابوں پر پابندی لگ گئی اور گوشہ نشینی کو معمول کی حیثیت حاصل ہوئی تاکہ شہر کے برے طور طریقوں کی ہوا تک نہ لگے۔ صفیہ نے کوٹ ادو میں سات برس گزارے۔ ان سات برسوں کو طاقِ نسیاں کی طرف ایک طویل اور اکتا دینے والی پرواز سمجھیے۔

اس کا شوہر اب نہایت سنجیدہ قسم کی سیاست میں مصروف تھا۔ ایوب خاں کی حکومت کا تختہ الٹنے کی جدوجہد میں وہ بھٹو صاحب کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس لڑکی کو یاد کرنے کا وقت اسے مشکل ہی سے ملتا تھا جسے اس نے آسمان سے جھپٹ کر مظفرگڑھ کے کوردہ کی نذر کر دیا تھا۔ انتہا یہ کہ اس کا نوزائیدہ بیٹا، بلال، بھی اسے بس کچھ دیر کے لیے اپنی طرف راغب کر سکا۔ صفیہ کے بطن سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو کوٹ ادو میں طبی سہولتوں کے فقدان کے باعث اسہال کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی۔

سیاست اب زوروں پر تھی۔ تیز فہم تجزیہ نگار بھانپ گئے کہ پی پی پی اقتدار سنبھالنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ مصطفےٰ بھٹو صاحب کا معتبر دست راست بن کر سامنے آیا۔ اب لوگ ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے۔ لوگوں نے یہ سوچ کر اس سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیے کہ اس میل جول سے آگے چل کر فائدہ اٹھائیں گے، مال بنائیں گے۔ مصطفےٰ ڈنر پارٹیوں کے کے پیچاپیچ میں الجھ کر رہ گیا۔ کل کے

سوشلسٹ کو اب سوشل حلقوں میں قبول کیا جانے لگا۔ چکنے چپڑے بڑی ٹیم ٹام والے بھڑوے ادھر ادھر سے نمودار ہو گئے۔ ڈنر پارٹیاں سوقیانہ محفلیں تھیں۔ عورتوں کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا تاکہ جس شخص کی مدد سے مستقبل میں کام نکلوانا مقصود تھا وہ ان میں سے کسی کو چن لے مشہور ہو گیا کہ مصطفیٰ کو مجرا سننے کا شوق ہے۔ پھر کیا تھا ایسی محفلوں کا بندوبست کرنے والوں میں آپس میں ٹھن گئی۔ سب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے۔ ان میں سے ایک کا تکا لگ گیا۔ اس نے مجرے پر نوبہار کو بلالیا۔

نوبہار کے سامنے آنے تک وہ ایک عام سی محفل تھی۔ نوبہار نے مشہور صوفی شاعر، خواجہ غلام فرید کی سرائیکی کافی گائی۔ مصطفیٰ چونک اٹھا۔ لڑکی کیا تھی سراپا ترغیب گناہ تھی۔ وہ آنکھوں، پلکوں، بھنوؤں، ہونٹوں بلکہ انگ انگ سے ڈورے ڈال رہی تھی۔ نوبہار کے ٹھیٹ طوائف ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ وہ ہیرامنڈی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا پیشہ ہی دل چرانا تھا۔ مصطفیٰ اس کی ہر ہر ادا پر مر مٹا۔ وہ جال میں پھنس چکا تھا۔ اس کے دوستوں نے اہتمام کیا کہ وہ نوبہار کو کبھی بھولنے نہ پائے۔ جو معاملہ رات گئی بات گئی سے آگے نہ بڑھتا وہ سرمستی بھرے رت جگوں میں تبدیل ہو گیا۔ ہر رات کوئی نہ کوئی واقف کار محفل کا اہتمام کرتا۔ نوبہار وہاں موجود ہوتی۔

نوبہار کا بھی دل آ گیا۔ پیشہ ور ناچنے گانے والی لڑکیاں عمر بھر کسی ایسے مرد کا خواب دیکھتی رہتی ہیں جو انہیں جسم فروشی کی ہولناکی سے نجات دلا دے۔ مصطفیٰ کی ذات میں اسے ایسا ہی مرد نظر آیا۔ مصطفیٰ میں عشق کی حرارت تھی۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ کہ اس میں معاشرے سے ٹکر لینے کا حوصلہ بھی تھا۔ کوئی دلیر آدمی ہی طوائف سے شادی کر سکتا ہے۔ مصطفیٰ نے کہا کہ ناچنا گانا چھوڑ دو۔ نوبہار نے حامی بھر لی۔ مصطفیٰ نے گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر لی۔ نوبہار کو وہاں ٹھہرا دیا گیا۔ اب وہ بلاشرکت غیرے اس کی جاگیر تھی۔ اس کی داشتہ۔ انہوں نے چوری چھپے نکاح پڑھا لیا۔ لیکن نوبہار نے اس راز کو راز نہ رہنے دیا۔

جب پی پی پی کی حکومت نے کٹے پھٹے، کرلاتے پاکستان میں اقتدار سنبھالا تو مصطفیٰ کھر پنجاب کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ سرخ روئی کا دن تھا۔ سرخ بتی والے ایریا میں جشن برپا ہو گیا۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں اور طوائفیں اپنے کوٹھوں سے اتر کر گلیوں میں ناچنے لگیں۔ ان کے جنوائی نے صوبے کا نظم و نسق سنبھال لیا تھا۔

حلف برداری کی تقریب کے بعد نوبہار سرکاری لیموزین میں اپنے جدی پشتی محلے گئی۔ لوگوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ جس بڑے سے بڑے شکار کا تصور کیا جا سکتا

تھا وہ کھولٹ بیٹی نے پھانس لیا تھا۔ نوبہار پر ان تمام چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو رشک آ رہا تھا جو ابھی اپنی جھانجریں جھنکانا سیکھ رہی تھیں۔ یہ سار بات بھٹو صاحب کے علم میں آ گئی۔ انہوں نے مصطفیٰ کو دارالحکومت طلب کر لیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ نہ سمجھے کہ کھلے بندوں اس طرح کا رویہ اپنا کر وہ مکافات سے بچ سکتا ہے۔ پنجاب کا گورنر کسی عام ناچنے والی کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ نوبہار کو چلتا کرنا پڑے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مولویوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مصطفیٰ سے کہا گیا کہ اسے گورنری یا نوبہار میں سے کسی ایک کو چننا پڑے گا۔ حقیقت میں مصطفیٰ کے پاس چناؤ کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

نوبہار کی طلبی ہوئی۔ مصطفیٰ گورنر کے خاص کمرے میں ڈیسک کے اوپر ٹانگ پر ٹانگ رکھے اپنی نشست پر براجمان تھا۔ نوبہار آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ مصطفیٰ نے ٹانگوں کے درمیان بن جانے والی V میں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے نوبہار پر واضح کر دیا کہ شادی کا قصہ ختم ہو چکا ہے۔

خاتون پر جیسے بجلی گر گئی۔ وہ پنجاب کے سب سے زیادہ طاقتور مرد پر چیخی چلائی، دہاڑی۔ وہ بت بنا رہا۔ پھر نوبہار جھنجھلا اٹھی اور ہوتے ہوتے بالآخر اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے، گڑگڑا کر کہا کہ مصطفیٰ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرے۔ مصطفیٰ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ نرا بوجھ تھی۔ اسے جانا ہی پڑے گا۔ نوبہار کے آنسو تھم گئے۔ اب وہ ایسی عورت تھی جسے نہایت حقارت سے ٹھکرایا جا چکا تھا۔ اس نے مصطفیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کوسا۔ یہ ٹوٹے ہوئے دل کی پکار تھی: مصطفیٰ کھر، جتنا دکھ تم نے مجھے پہنچایا ہے کاش اتنا ہی دکھ تمہیں بھی پہنچے۔ کاش تمہیں بھی پتہ چلے کہ حقارت سے ٹھکرا دیے جانے پر دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ اس ملک کی گلی گلی میں تمہاری اولاد رلتی پھرے۔ تم جس پتھر کو اٹھاؤ اس کے نیچے سے تمہارا بچہ نکل آئے۔ تمہیں کبھی چین نصیب نہ ہو گا۔ جس طرح تم نے مجھے برباد کیا ہے اسی طرح تمہیں بھی کوئی عورت برباد کر کے چھوڑے گی۔"

یہ ایک چھوٹا سا رومانی واقعہ تھا اور بس۔ جب امورِ مملکت اس کی توجہ کے طالب ہوتے تو ظاہر ہے وہ انہیں کو اولیت دیتا۔

اب صفیہ گورنر ہاؤس میں اٹھ آئی۔ اس شادی کی بھی بس راکھ ہی باقی رہ گئی تھی۔ سلگتے انگاروں کو وقت نے کبھی کا بجھا ڈالا تھا۔

مصطفیٰ کے بھائی گورنر ہاؤس اس سے ملنے آئے۔ اسے بتایا گیا کہ صفیہ نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ "اب آپ گورنر ہیں۔ یہ آپ کی عزت کا معاملہ ہے۔ صفیہ نے

آپ کے چھوٹے بھائی، غلام مرتضیٰ، سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ہم اس بات کو آپ سے مزید نہیں چھپا سکتے۔"

مصطفیٰ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلی عورت تھی جس نے اس کی عزت میں بٹا لگانے کی جرأت کی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ اس نے صفیہ کی زندگی برباد کر دی تھی یا نوبہار سے شادی کر لی تھی یا پچھلے چھ ماہ کے دوران صرف چند گھنٹے کے لیے اس کے پاس گیا تھا یا اسے صفیہ سے محبت کبھی تھی ہی نہیں۔ جاگیردارانہ قانون کی رو سے مرد کو یہ سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔ عورت اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔ یہ عظیم ترین گناہ ہے۔ اس سے مرد کی مردانگی کو زک پہنچتی ہے۔ اگر مرد کو پتہ نہ ہو کہ اس کی بیوی کسی اور کے ساتھ دادِ عیش دے رہی ہے تو لوگ اس کی طرف انگلیاں اٹھا کر دبی دبی آواز میں ہنستے اور سرگوشیاں کرتے ہیں۔ مصطفیٰ نے شکستہ دل ہو کر اپنے کمرے کی خلوت میں پناہ لی۔

اس نے صفیہ کو بے دردی سے مارا پیٹا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس نے صفیہ اور دائی عائشہ دونوں کے اندام میں پسی ہوئی لال مرچیں بھی ٹھونسیں۔ دونوں کو ہسپتال لے جانا پڑا۔ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مصطفیٰ نے دائی عائشہ کو تو تقریباً جان سے مار ڈالا جسے اس معاملے کا شروع سے علم تھا۔ اس نے اپنی صفائی میں سیدھی سی بات کہی: "میں آپ کو بتانے کی جرأت کیسے کرتی۔ میری وجہ سے خاندان میں فساد پڑ جاتا۔ آپ کا بھائی مجھے مار ڈالتا۔ وہ میری بوٹیاں ابال کر اونٹوں کو کھلا دیتا۔" اس ہولناک بیان کی حقیقت کی تاریخ شاہد ہے۔ قتل کیے جانے والوں کا گوشت اکثر اونٹوں کو کھلا دیا جاتا تھا۔ جاگیردار دنیا کے سامنے اپنا یہ امیج پیش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے نر مرد ہیں۔ اس امیج کو بڑی احتیاط سے بناتے سنوارتے رہتے ہیں۔ لیکن بیوی بر جائی نکل آئے تو یہ امیج ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے۔ مصطفیٰ پر تو پہاڑ گر پڑا۔ وہ اسلام آباد پرواز کر گیا تاکہ اپنے پیرومرشد، بھٹو صاحب، سے ملے۔ وہی اسے ڈھارس دے سکتے تھے۔

پاکستان کا صدر اور پنجاب کا گورنر، ملک کے دو سب سے طاقتور آدمی، دونوں رات گئے تک بیٹھے شراب پیتے رہے۔ جب نشے نے اپنا اثر دکھایا تو گفتگو میں فلسفیانہ رنگ در آیا۔ مصطفیٰ نے جی بھر کر خود پر ترس کھایا اور آنسو بہائے۔ اس نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اس عظیم بے وفائی کے بعد اس کے لیے امورِ مملکت پر توجہ مرکوز کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اسے اپنے پر اعتماد نہیں رہا۔ بھٹو صاحب نے، جو اب خود بھی خوب چہک گئے تھے، مصطفیٰ کمر کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا: "میرا خیال ہے ہم دونوں کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ ہمیں یہ حکومت چھوڑ دینی چاہیے۔ اس میں نفرت اور بے وفائی

کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اگر تم نے استعفیٰ دیا تو میں بھی تمہاری پیروی کروں گا۔ میں اکیلا کام نہیں چلا سکتا۔ تمہارے دکھ کو میں نے اپنے دکھ کی طرح محسوس کیا ہے۔ لعنت بھیجو، چلو کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ان سب باتوں سے بہت دور۔"

جوں جوں رات گزری پاکستان پر راج کرنے والے ان دونوں آدمیوں کی رقیق القلبی بڑھتی گئی۔ اگلی صبح جب شراب کے نشے سے چھا جانے والی دھند تر بتر ہوئی تو بھٹو صاحب نے پٹڑی بدل لی۔ مصطفیٰ سے کہنے لگے کہ احمق نہ بنو۔ جذباتی باتیں مت کرو۔ ہم زبردست تقدیر کے مالک ہیں۔ ہمیں چن لیا گیا ہے۔ پاکستان میں تبدیلیاں ہم لے کر آئیں گے۔ اگر ہم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے گی۔ اور یہ سب کچھ محض ایک عورت کی وجہ سے۔ صفیہ کی وجہ سے۔ پھر بھٹو صاحب نے خباثت آمیز انداز میں مصطفیٰ کی طرف دیکھا اور مکمل سنجیدگی سے فرمایا: "میں نے کہا، تم صفیہ کو ٹھکانے کیوں نہیں لگا دیتے؟"

بھٹو صاحب ایسی باتیں کچھ زیادہ ہی کرتے تھے۔ روا روی میں کہی گئی اسی طرح کی ایک بات نے انہیں تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ جن لوگوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کی جاتیں وہ انہیں کبھی نہ بھولتے۔ جب پی پی پی سے منحرف ہو جانے والے ایک رکن، احمد رضا قصوری، کے والد گولی لگنے سے ہلاک ہوئے تو ایسے مخبر سامنے آتے دیر نہ لگی جنہوں نے قسم کھا کر کہا کہ انہوں نے بگوشِ خود بھٹو صاحب کو اپنے گرگوں سے کہتے سنا تھا کہ اس شخص کو مزہ چکھا دیا جائے۔

جب مصطفیٰ نے یہ سارا واقعہ مجھے سنایا تو میں خاصی پریشان ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ صفیہ کا کام تمام کر دیا۔ وہ چپ ہو گیا۔ پھر کہنے لگا: "نہیں۔ اسلام میں یہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی کو کسی مرد کے ساتھ دیکھو اور غصے سے اندھے ہو کر بیوی کو مار ڈالو تو یہ جرم نہیں۔ خدا تمہیں بخش دیتا ہے۔ جب تم سے جرم سرزد ہوا تو تم غصے کے مارے اپنے آپ سے باہر تھے۔ لیکن اگر قتل کا منصوبہ تیار کیا گیا ہو اس پر پہلے سے خوب غور کر لیا گیا ہو تو وہ ناقابلِ معافی ہے۔ میں اس طرح کی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بجائے میں نے صفیہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا۔" اس نے اپنے بھائی کو بھی انگلینڈ جلاوطن کر دیا۔ گاؤں میں اس کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اسے اپنے بھائیوں اور والدہ تک سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے برادری سے دھتکار کر نکال دیا گیا۔

بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ مصطفیٰ ایک بار اور شادی کرے۔ ان کا بڑا دل چاہتا تھا کہ گورنر ہاؤس میں مصطفیٰ کے ساتھ کوئی خاتون ہونی چاہیے جو میزبانی کے فرائض انجام

دے سکے۔ ان کی خواہش تھی کہ مصطفیٰ کوئی ایسی عورت تلاش کرے جو آنے والی معزز شخصیتوں کی خاطر مدارات کر سکے اور مثالی گورنس (کوئی بہتر لفظ نہیں ملتا تو یہی سہی) ثابت ہو۔ لازمی طور پر کوئی جدید وضع قطع کی آزاد خیال خاتون درکار تھی۔

بطور صدر بھٹو صاحب پہلی بار ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دورے پر روانہ ہونے والے تھے۔ دورے سے قبل ایسی عورت کی تلاش جاری تھی۔ اتفاقاً کہیں سے شہرزاد نظر میں آ گئی۔

وہ بھٹو صاحب کے وزیر تعلیم، حفیظ پیرزادہ کی بیوی، سعدیہ پیرزادہ کی بھتیجی تھی۔ اس کا تعلق متوسط طبقے کے ایسے خاندان سے تھا جس پر معاشرے میں بلند سے بلند تر مقام حاصل کرنے کی دُھن سوار تھی۔ خاندان بہت زیادہ مغربیت زدہ تھا۔ شہرزاد کی بہت اچھی تربیت ہوئی تھی اور وہ نہایت خوبصورت تھی۔ انگریزی اچھی بولتی تھی اور اس کی پور پور سے اعتماد جھلکتا تھا۔

مصطفیٰ نے اس پر نظر ڈالی۔ پھر اس نے شہرزاد کو گورنر ہاؤس میں ڈنر پر مدعو کیا اور چند جام شراب پینے اور دل ہی دل میں معاملے کے سب پہلوؤں کا حساب لگانے کے بعد محسوس کیا کہ شیری (شہرزاد) سے کام چل جائے گا۔ وہ مثالی ساتھی ثابت ہوگی۔ مصطفیٰ کی تیزرفتار جمع تفریق اور جوش میں آ کر اچانک کوئی فیصلہ کر بیٹھنے کی عادت، دونوں کا اس موقع پر جوڑ مل گیا۔ وہ امریکہ کے درپیش دورے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا ہی غضب کا منظر ہوگا جب وہ اس جیسی شائستہ اور دلربا خاتون کا ہاتھ تھامے وہائٹ ہاؤس میں قدم رکھے گا۔ اس نے ایک مثالی ہمراہی کے تصور کو بیوی کے تصور سے گڈمڈ کر کے شادی کی تجویز پیش کر دی۔

شیری نے کہا کہ مصطفیٰ کو اس سلسلے میں اس کے والد سے بات کرنی چاہیے۔ مصطفیٰ جواب میں انکار سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ "نہیں۔ اپنے والد کو تم قائل کرو۔ میں ان سے صرف اس وقت بات کروں گا جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ وہ ہاں کر دیں گے۔ میرے مطالبے کے جواب میں وہ نہیں کہیں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

شیری مسکرائی۔ اس نے مصطفیٰ سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ نو دن بعد ان کی شادی ہو گئی۔ مصطفیٰ کو میزبان خاتون مل گئی۔

بھٹو صاحب شادی کے حق میں نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میاں بیوی کے تہذیبی پس منظر میں جو بُعد ہے اس کی وجہ سے آگے چل کر شادی میں بدمزگی پیدا ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ شیری اپنے میاں کو سمجھ ہی نہ پائے گی۔ مصطفیٰ کسی قسم کے سماجیاتی استدلال پر کان دھرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ بھٹو صاحب کے پاس اتنا اختیار نہ تھا کہ وہ

اس بات میں دخل دے سکتے کہ مصطفیٰ کس سے شادی کرے، کس سے نہ کرے۔ مصطفیٰ اپنی بات پر اڑا رہا اور یہی سمجھا کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جب میں مصطفیٰ سے زیادہ قریب ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ مستحکم ازدواجی زندگی گزارنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ شادی کرنے کی جو وجوہ اس کے ذہن میں تھیں سب کی سب غلط تھیں۔ مصطفیٰ کا تعلق ایسے پس منظر سے تھا جس میں باقی دنیا سے ربط ضبط کے مواقع انتہائی محدود تھے۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہ تھا۔ اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع اسے بہت زیادہ عمر گزر جانے کے بعد ملا تھا۔ اس نے نک چڑھے پن کا جو رویہ اپنایا وہ بھی الٹا پلٹا تھا۔ اپنے سے کمتر لوگوں سے جھک کر ملتا اور امیر کبیر آدمیوں سے اکڑ کر۔ پرانے زردار ان نودولتیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جو روپے پیسے کے بل بوتے پر ان چیزوں کی کمی پوری کرنے کے لیے مرے جا رہے تھے جو انہیں اچھی تربیت اور عالی نسبی سے محروم رہ جانے کی وجہ سے نصیب نہ ہو سکی تھیں۔ اس نے جتنی بار بھی کسی کو چنا غلط ہی چنا۔ اگر اسے صحیح وقت پر صحیح عورت مل جاتی تو وہ اچھا شوہر بنکر قاعدے قرینے سے گھر بسا لیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں سے چلتے پھرتے شادیاں کرتا رہا تھا۔ اس کی شخصیت تمام وقت پختہ سے پختہ تر ہو رہی تھی اور اس کی عورتیں ابھی گھر میں بس کر قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہوتی تھیں کہ وہ اور زیادہ پختہ ہو کر انہیں بہت پیچھے چھوڑ جاتا۔ ان کے قدم جمانے کی یہ کوششیں ہی مصطفیٰ کے اضطراب کا سبب تھیں۔

میں نے شیری سے مصطفیٰ کے تعلق کو فعال تجسس کی خوردبین کی مدد سے دیکھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس تعلق میں توازن بالکل نہیں۔ مصطفیٰ سرتاج بھی تھا، دماغ بھی تھا، ذہن بھی تھا۔ شیری اس سے مرعوب تھی۔ وہ شاید ہی کوئی ایسی بات کہتی جس پر مصطفیٰ کی سوچ کا ٹھپا لگا نہ ہوتا۔ اس میں مصطفیٰ کے نقطہ ہائے نظر سے اختلاف کرنے کی جرأت ہی نہ تھی۔ وہ ہمیشہ چاپلوسی میں لگی رہتی۔ ایسی باتیں کرتی جنہیں سن کر خوش ہو اور ہر وقت داد حاصل کرنے کی فکر میں مبتلا نظر آتی۔ وہ اس کی ہمجولی بن کر رہ گئی تھی یا جی حضور کہنے والی عورت اور یہ صورتحال مصطفیٰ کے حق میں ٹھیک نہ تھی۔ مصطفیٰ کی انا کی ہر وقت مٹھی چاپی کی جاتی۔ اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس عمل کا نتیجہ بہتر نکلے گا یہ بدتر۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت غیرصحت مندانہ بات ہے۔ اس طرح مصطفیٰ میں صرف اس وجہ سے اچھے برے میں تمیز کرنے کا وقوف پیدا نہ ہوگا کہ اس کی بیوی چیزوں کو معروضی انداز میں دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔

یہ بالکل واضح تھا کہ مصطفیٰ کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے احساس کی

شدت سے بھرپور، بہت ہی ذہین آدمی ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھا جو ڈانگ کا کام دے کر اپنے شوہر کی شخصیت کا رنگ چوکھا کرنے کی اہل نہ تھی۔ وہ مصطفےٰ کے حق میں بہت ہی نحس تھی۔ کوئی چیلنج پیش نہ کر سکتی تھی۔

شیری لوگوں کے سامنے جو امیج پیش کرتی تھی وہ اس کی نجی زندگی کے بالکل الٹ تھا۔ وہ بڑی طنطنے والی اور مغرور عورت نظر آتی تھی۔ افواہ ساز فیکٹریوں نے ایسی کتنی ہی کہانیاں گھڑ کر پھیلا دی تھیں کہ مصطفےٰ گھر پر اسے مارتا پیٹتا اور رسوا کرتا رہتا تھا اور اس کے باوجود وہ یہی تاثر دینا چاہتی تھی کہ مصطفےٰ اس سے پیار کرتا ہے اور وہ مصطفےٰ کی زندگی میں سب سے اہم ہستی ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ پنجاب کی خاتونِ اول کے رتبے پر اچانک سرفراز ہو جانے سے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اس نے اپنی تمام پرانی سہیلیوں اور دوستوں سے تعلقات بگاڑ لیے تھے جن کے لیے اس کی شخصیت کا نیا روپ خاصا ناقابل برداشت تھا۔

ہم سب کو معلوم تھا کہ بطور بیوی شیری کو خوب مار پڑتی ہے۔ یہ کھلا راز تھا۔ گھر کے پُرتشدد مناظر کا وہ مجھ سے اکثر ذکر کرتی۔ مصطفےٰ پر تشدد پر اتر آنے کے دورے پڑنے کی جو وجوہ اس نے بیان کیں وہ میرے دل کو نہ لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے سامنے پوری حقیقت بیان نہیں کر رہی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جو وجوہ شیری پیش کرتی ہے وہ کسی مرد کو تشدد کرنے پر کیسے اکسا سکتی ہیں۔

بھلا اتنی سی بات پر کوئی مرد اپنی بیوی کو مار مار کر نیلو نیل کیسے کر سکتا ہے کہ وہ ملازم سے یہ کہنا بھول گئی تھی کہ گیزر چالو کر دیا جائے؟ بھلا وہ بیوی کی طرف اس وجہ سے دھنائی کیسے کر سکتا ہے کہ اسے کپڑوں پر استری کرنی یاد نہ رہی تھی؟ یہ کچھ زیادہ ہی انوکھی سی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شیری حقیقت کو جان بوجھ کر چھپا رہی ہے۔ مصطفےٰ مجھے غیر معقول آدمی نہ لگتا تھا۔

ایک بار شیری ہمارے ساتھ تھی۔ ہم فرنیچر کی کسی دکان سے کار میں واپس آ رہے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ کھانے پینے کی ایک جگہ رک کر کھانے کے لیے کچھ لے چلتے ہیں۔ شیری نروس ہو گئی۔ "ہم یہاں نہیں رک سکتے"۔ وہ بولی۔ "کیوں نہیں رک سکتے؟" میں نے پوچھا۔ "اس لیے کہ میں نے مصطفےٰ کو نہیں بتایا تھا کہ ہم کھانے کے لیے کچھ لینے یہاں رکیں گے۔" "پھر کیا ہوا؟" "میں نہیں رک سکتی۔ میں نے ان سے اجازت نہیں لی۔ وہ بہت ناراض ہوں گے۔" "تو ان سے بس یہ کہہ دینا کہ ہم نے یہاں رکنے کا فیصلہ اچانک کر لیا تھا" "نہیں۔ وہ بہت خفا ہوں گے۔ وہ مجھے ماریں گے۔ اگر میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی کام کروں، تو وہ میری ٹھکائی کرتے ہیں"۔ اس

گفتگو کے بعد ہمارے کہیں رکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مجھے متنبہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن میں اتنی آگے نکل گئی تھی کہ اس طرح کے انتباہوں پر دھیان نہ دے سکتی تھی۔

شیری نے مصطفےٰ کے بعض دوسرے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا۔ اسے اپنے والدین سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے میکے جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ شیری کی ماں، مشترکہ دوستوں کی مدد سے، اپنی نواسی، امینہ، کے لیے چوری چوری ملبوسات بھجواتی رہتی۔ مصطفےٰ کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ لباس کہاں سے آتے ہیں۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ آیا شیری کی باتیں مبالغے پر مبنی ہیں یا وہ کوئی درشت حقیقت بیان کر رہی ہے۔

میں نے پوچھا کہ والدین سے ملنے پر پابندی کس لیے لگائی گئی ہے۔ "وہ کہتے ہیں کہ میرے گھر والے ان سے رشتے داری کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو یہ بتا کر کہ پنجاب کا گورنر ان کا داماد ہے اپنے کام نکلواتے رہتے ہیں"۔

مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں یہ ایک عام روش ہے۔ کسی کے اقتدار پر فائز ہونے کی دیر ہے، موقع پرست رشتے داروں کے جھول کے جھول پیدا ہو جاتے ہیں۔

شیری نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اسے گورنر ہاؤس میں لا بٹھایا گیا تھا۔ اب وہ قیدی تھی۔ مصطفےٰ نے اسے اندر دھکیل کر باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں رہی۔ جو مصطفےٰ کی مرضی وہی اس کی۔ وہ بالکل بے رنگ اور لایعنی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ مصطفےٰ کا مدھم سا عکس بن کر رہ گئی۔ مصطفےٰ کے محور سے دور ہٹتے ہی وہ ماند پڑ جاتی۔

اس تمام معاملے میں مصطفےٰ تحمل پسند اور ہمدرد آدمی کے روپ میں سامنے آیا۔ میں اس سے کہہ سکتی تھی کہ میرے خیال میں درست کیا تھا اور غلط کیا۔ وہ میری رائے سننے کے لیے خاصا آمادہ نظر آتا اور اکثر میرے نقطۂ نظر کے مطابق عمل کرتا۔ وہ کسی طرح کے کمپلیکس کا مارا ہوا نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی بے قراری کے عالم میں کسی ایسی ساتھی کی تلاش میں تھا جو خواہ اس کے ناز اٹھانے کی بجائے اسے چیلنج کر سکے۔

میں نے سوچا کہ ایسی شادی جس میں محبت کے بجائے خوف کا غلبہ ہو زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔ مصطفےٰ بظاہر شیری کی ذرا عزت نہ کرتا جس کی حیثیت پائیدان سے زیادہ نہ رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کرتا۔ وہ بھی لوگوں کے سامنے۔ وہ دوستوں میں بیٹھ کر شیری کے ساتھ قطعاً بدتمیزی سے پیش آتا۔ ایک موضوع جسے وہ بار بار دہراتا یہ تھا کہ شیری کو چننے میں اس سے غلطی ہوئی ہے اور اب وہ کسی مثالی بیوی کی تلاش میں بازار کے چکر لگا رہا ہے۔ شیری اس توہین پر ذرا بھی جز بز نہ ہوتی۔ وہ اپنی

بے عزتی کو ہنسی میں ٹال دیتی۔ شاید اسے یہ امید تھی کہ یہ سب باتیں سنجیدگی سے نہیں کہی جا رہیں۔ تاہم دل کی گہرائیوں میں اسے بھی پتہ تھا کہ مصطفےٰ کی نظر بھٹکنے لگی ہے اور مصطفےٰ کو اپنے ساتھ تھی رکھنے کے لیے جس دلربائی یا چتر کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہیں۔ شیری دل ہی دل میں اپنی نااہلی کی قائل ہو چکی تھی۔ اس صورت حال میں جھوٹ موٹ کچھ اور سوچنے کی تمک تھی بھی نہیں۔

میرا ذہن اب تجزیوں کے سیلاب کی زد میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ مجھے اس آدمی کا بہت خیال رہنے لگا ہے جس کی نیت کو کبھی ٹھیک طرح سمجھا نہ گیا تھا، جو محبت کا جویا تھا اور اس تلاش کے دوران میں ہر قسم کی غلط عورتوں میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ شاید یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے زیادہ ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفےٰ ہی اس طرح کا مرد ہے جس کے ساتھ میں تعلق پیدا کرنا پسند کروں گی۔ مجھے یقین سا آ گیا تھا کہ میں ہی وہ ابھی تک ہاتھ نہ آنے والی عورت ہو سکتی ہوں جسے وہ ڈھونڈتا رہا تھا۔

نہ کچھ کہنے سننے کی نوبت آئی نہ چوری چوری آنکھیں چار کی گئیں۔ تاہم ہمارے درمیان ایک ان کہی سی موافقت موجود تھی۔ اس وجہ سے میں گڑبڑا سی گئی۔ کبھی کبھار میں بالکل بوکھلا جاتی۔ میں چاہتی تھی کہ اس بات کی کسی طرح تصدیق ہو جائے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف راغب ہیں۔ مصطفےٰ بغور میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ انتخاب کے صحیح ہونے کے بارے میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک جوش میں آ کر کچھ کر گزرنے کی عادت پر قابو پا لیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں نروس ہوں اور کچھ بدی پر مائل بھی۔ یہ خیالات کیا تھے؟ میرے سر میں کیوں گردش کر رہے تھے؟ کیا کسی اور کو ان کی خبر ہو گئی ہے؟ انیس کو؟ دوسری بیگمات کو؟

ہمارے ٹولے کی بیگمات، منہ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک کے مصداق، بظاہر زیادہ دور تک نظر دوڑانے کی زحمت نہ کرتی تھیں۔ وہ ہر وقت ملبوسات، زیورات اور اندرونی آرائش و زیبائش کی باتیں کرتی رہتیں۔ کبھی کبھار وہ اپنی اولاد، ان کی پڑھائی کا ذکر اور اس عزم کا اظہار کرتیں کہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھجوائیں گی۔ چھوٹے چھوٹے پُرلطف قصے یہ بتانے کی غرض سے مسلسل دہرائے جاتے کہ ان کے بچوں کی دلچسپیاں کیا ہیں یا وہ کتنے ذہین ہیں یا پاکستان میں سکول کتنے ہولناک ہیں۔ وہ اس ادھیڑ بن میں گزرتے کہ شام یا رات کو کیا لباس پہنا جائے۔ میں ان سے مختلف نہ تھی۔ اب میں مصطفےٰ کی نظروں میں جچنے کے لیے لباس زیب تن کرتی۔ جب وہ میرے اس پر توجہ نہ دیتا تو میں رنجیدہ ہو جاتی اور جب وہ نظر بھر کر میری طرف دیکھ لیتا تو

آپ ہی آپ اترانے لگتی۔ میں نے ان سب ملبوسات کو آزمانا شروع کر دیا جن پہ وارڈروب میں پڑے پڑے، گرد کی تہہ جم چکی تھی۔ جہیز میں مجھے فرانسیسی شفون کی ڈھیر ساری ساڑھیاں ملی تھیں۔ اب ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میں اچھی لگتی ہوں۔ میں یہ بھی بتا سکتی تھی کہ مصطفےٰ کو میرے اندازے سے اتفاق ہے۔ میرے لیے تحسین اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔

پکنک پارٹیاں اور شکار ہمارے زندگیوں کا حصہ بن گئے۔ پورے کا پورا ٹولہ جیپوں اور کاروں میں لد کر، ایک ساتھ سیر و شکار کو نکلتا۔ خیمے لگائے جاتے، الاؤ روشن ہوتے۔ عورتیں بیٹھ کر راہ دیکھتیں کہ مرد کب شکار مار کر لائیں۔ بہت ہی مزے کا زمانہ تھا۔ کس قدر رومان پرور دن تھے۔

مصطفےٰ کو کھانا پکانے کا بڑا چاؤ تھا۔ ہم دن رات تیتر اور جنگلی مرغابیاں کھاتے رہتے جو وہ مار کر لاتا۔ جنگل میں سوؤروں کا شکار بھی کھیلا جاتا۔ یہ خطرناک درندے جنگل میں اچانک سامنے آ جاتے اور جیپوں کو ٹکر مارنے دوڑتے۔ بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے ان سے کچھ بن نہ پڑتا اور وہ گولیوں سے بچنے کے لیے نہ تو پلٹ سکتے نہ دائیں بائیں مڑ پاتے۔ مارنے کے بعد انہیں وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ سؤر حرام جو ٹھہرے۔ انہیں کون کھاتا۔

میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ چاہتا ہے کہ میں بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لوں۔ یہ بات اس کی نظر میں بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ ہمیشہ مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ لیکن رعب جمانے کی کوشش کے لیے بڑا لطیف پیرایہ اختیار کیا جاتا۔ مجھے اپنی طرف راغب کرنے کا جو انداز اس نے اپنایا تھا اس میں کوئی بات کھلی ڈلی نہ تھی۔ میں اس شخص کی طرف اور مہم جوئی کی اس فضا کی طرف کھنچی چلی گئی۔ جب وہ شکار سے لوٹتا تو اس کے چہرے پر ایک خاص کیفیت ہوتی۔ کوئی کارنمایاں کرنے کا احساس۔ وہ مجھے ڈھونڈ نکالتا اور چاہتا کہ میں اسے سراہوں۔ شکار کے لباس میں شکار کے لوازمات سے لدا پھندا وہ بہت بھلا لگتا۔

ایک بار میں نے اسے اس حلیے میں دیکھا: سر پر ماؤ کیپ، ایک ہاتھ میں رائفل، خاکی پتلون کے پائنچے ویلنگٹن بوٹوں میں اڑسے ہوئے۔ وہ جھک کر پانی میں سے ایک جنگلی مرغابی اٹھا رہا تھا جو اس نے ابھی ماری تھی۔ دھوپ کی پہلی کرنوں نے اسے نیم رخ چھوا۔ اس نے نظر اٹھا کر عین میری طرف دیکھا۔ آخر کار میرا دل دھک سے رہ گیا۔

کھانا وہ کھلی جگہ میں جلتی ہوئی آگ پر پکاتا۔ اس کا خاص خیال رکھتا کہ کس قسم کا

گوشت پکنا چاہیے۔ گوشت لازمی طور پر پٹھوں کا ہوتا۔ وہ اس بارے میں انتہائی احتیاط برتتا کہ گوشت کو بہت دیر تک نہ پکایا جائے۔ وہ غذائیت کے بارے میں لیکچر دیتا اور بتاتا تھا بہت دیر تک پکاتے رہنے سے ہم گوشت کے اصل ذائقے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں سوال کرتی اور مجھے پتہ چلتا کہ کھانا پکانے کے فن میں وہ طاق ہے۔ اسے اپنے فن پر ناز تھا۔ وہ کمال پسند تھا۔ بیوقوفوں کو بالکل برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اگر کوئی یہ چکر چلانا چاہتا کہ کھانا صحیح وقت کے بجائے کسی طرح کم وقت میں تیار ہو جائے تو ایسی ہر کوشش کو فوراً کچل دیا جاتا۔ طباخی اس کے لیے مہم جوئی کا، جوکھم کا درجہ رکھتی تھی۔ میرے لیے طباخی دریافت کے مترادف تھی۔

کسی لحاظ سے اس پچ میل بھیڑ بھاڑ میں مصطفےٰ اور میں دو ایسی روحیں تھیں جن کے تار آپس میں ملے ہوئے ہی نہیں گتھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں اکیلے تھے۔ دونوں کو دنیا والوں نے غلط سمجھا تھا۔ دونوں فنکار تھے۔ دونوں کسی ایسے کاز کو تلاش کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے جس کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر سکیں۔ دونوں کو کسی ایسے فرد کی جستجو تھی جو ہمارے دلوں میں برپا ڈراؤنے ہیجان کو سمجھ سکے۔ اب تک کوئی ہمارے ذہنوں کے اندر نہ اتر سکا تھا۔×

اس آدمی کے ساتھ میرا تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ میں اسے بہتر طور پر جاننے کی آرزومند تھی اور محسوس کرتی تھی کہ بیشتر لوگوں سے کہیں بہتر انداز میں اس کی ناقابل یقین توانائی کو سمجھ سکتی ہوں، اس کی اس خواہش کا احترام کر سکتی ہوں کہ وہ جیسا ہے اسے بجنسہٖ اسی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ میں بے رحمی اور شقاوت کی اس رکاوٹ کو جو غلط فہمیوں کی بنا پر اس کے سامنے کھڑی کر دی گئی تھی، ڈھانے میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔ اس کی ذات سے مجھے اتنی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی کہ میری تمنا تھی کہ کسی طرح اسے کھل کر باتیں کرنے پر راضی کر لوں۔ کوئی چیز مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ یہ نوشتۂ تقدیر ہے۔ مجھے اعتماد تھا کہ صرف میں ہی مثبت انداز میں اس کا تجزیہ کر سکتی ہوں اور جس سہارے یا ہمدردی کے لیے وہ اتنے کھلم کھلا انداز میں ترس رہا ہے وہ اکیلی میں ہی اسے فراہم کر سکوں گی۔

جو آدمی میرے سامنے بیٹھا بڑی خردہ کاری سے تیتر کو سیخ پر چڑھانے کی تیاری میں منہمک تھا اس کی ایک بات پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ وہ رائے عامہ کو قطعاً خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اگر وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تو اس میں بالکل بیہودہ اور نامعقول رویہ اپنانے کا حوصلہ بھی تھا۔ یہ ایک ایسی خصلت ہے جو صرف غیر معمولی انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ رسم و رواج پر مصطفےٰ تھوکتا بھی نہ تھا۔ وہ دل کی دل میں رکھنے کا قائل

کبھی نہ ہوا۔ قیادت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ روایت کی انگلی تھام کر نہ چلتا تھا۔ اپنے لیے نئی راہیں نکالتا رہتا تھا۔ یہ فیصلہ خود کرتا تھا کہ کس سمت میں اور کس راستے پر چلنا ہے۔ لوگوں کا اس کی حرکتوں کے بارے میں کیا خیال ہے، اس بات کو اس نے اپنے لیے کبھی بوجھ نہ بننے دیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ انہیں مجبور کر دے گا کہ وہ جیسا ہے اسے ویسے کا ویسا قبول کیا جائے۔ اس کی کارگزاریوں کی تہہ میں اعتماد کارفرما ہوتا تھا اور اس اعتماد کی بدولت اس نے بہت سے مخالفین سے بھی یہ منوا لیا تھا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ اس پر جو بھی کیچڑ اچھالا جاتا وہ پھسل کر نیچے جا گرتا۔

قاعدہ ہے کہ سیاست دان، کم از کم اپنی نجی زندگی کی حد تک، محتاط ہوتے ہیں۔ مصطفےٰ اس قاعدے سے مستثنیٰ تھا۔ اس کی شادیوں اور طلاقوں کا چرچا ڈرائنگ روم میں ہونے والی گپ شپ تک محدود نہ تھا۔ ان کی گونج ملک کی گلی گلی اور بازار بازار میں سنائی دیتی تھی۔ اس کا بہت شادیاں کرنے والے مرد کا جو امیج بن چکا تھا اسے جھٹلانے کی اس نے کبھی کوشش نہ کی۔ اس ضمن میں اسے ایسے معاشرے کی وجہ سے سہارا ملا جس میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کو برا نہیں سمجھا جاتا اور جو طلاق کو ناکام ہو جانے والی شادی کا منطقی انجام سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ لوگ اس کے جوشِ عشق کو معاف کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے بڑی فراست سے اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اور رومانی خوش وقتیوں کو ترازو میں تول کر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ اول الذکر میں کہیں زیادہ وزن ہے۔ وہ عوام کا آدمی تھا۔

بھٹو صاحب کے ساتھ سیاسی ناچاقی بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ مصطفےٰ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی عزت آبرو کو عزیز رکھتے ہیں۔ جب آزمائش کی گھڑی آئی تو اس نے مصالحت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اعلیٰ عہدے کے حوالے سے میسر آنے والی تمام مراعات کو اپنے آدرشوں پر قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اقتدار سے اقتدار کی خاطر چمٹے رہنا اس کے مسلک میں نہ تھا۔ وہ جی حضور کہنے والوں کی صف میں شامل ہونے کے بجائے سیاسی بن باس لینے پر راضی تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں کے کام آنے میں دلچسپی رکھتا تھا جنہوں نے ووٹ دے کر اسے مسندِ اقتدار تک پہنچایا تھا۔ وہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دے گا چاہے اس کا مطلب اپنے پیر و مرشد اور دوست، بھٹو صاحب کے قہر و غضب کو دعوت دینا کیوں نہ ہو۔

بھٹو صاحب نے لوگوں سے جو قول قرار کیے تھے ان پر قائم نہ رہے تھے۔ انہوں نے خود کو اپنی طاقت کے سرچشمے یعنی عام آدمی سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ وہ

خوشامدیوں کے فن کا شکار ہو گئے تھے اور اب انہیں ایسے دوستوں اور آستین کے سانپوں نے گھیر رکھا تھا جو ان کی آنکھ[illegible] باندھنے کے لیے پٹی تیار کر رہے تھے۔ یہ پٹی بھٹو صاحب کی آنکھوں پر تختہ الٹ جانے تک بندھی رہی۔ مصطفٰے کو خوب علم تھا کہ کرپشن کا زور ہے اور پارٹی کو گھن لگ چکا ہے۔ وہ پارٹی کے منشور سے غداری کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ سیاست دان کا کام حکم چلانا نہیں، خدمت بجا لانا ہے۔ مجھے اس کی آراء عالی ظرفانہ اور موقف راستبازانہ معلوم ہوا۔

ہم لکھوکھا تاروں کی چھاؤں تلے محبت میں گرفتار ہوا چاہتے تھے۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا۔ مصطفٰے نے اس لمحے کو جس میں محبت کا اظہار کیا جانا تھا، اور اس اظہار سے پیدا ہونے والے تناؤ کو التوا میں ڈالے رکھا۔ وہ کب پہل کرے گا؟ وہ پہل کرے گا بھی؟ مجھے یقین تھا کہ میرا ذہن شعبدے بازی پر اتر آیا ہے۔ میں پھولوں کی پنکھڑیاں توڑ توڑ کر گنتی رہی۔ اسے مجھ سے محبت ہے۔ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ خنک شام تھی۔ الاؤ دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن اس شخص نے، جس کے بارے میں شہرہ تھا کہ ناقابل اصلاح عورت باز ہے، چھوا نہیں مارا۔ کیا شائستگی کا ثبوت دیا جا رہا تھا؟ یا یہ سب کچھ میرے تخیل کا کھیل تماشا تھا؟

مصطفٰے کی رہائش گاہ پر گھر کا گمان نہ ہوتا تھا۔ وہ کوئی چٹیچر سی جگہ لگتی تھی۔ جیسے میلی چکٹ ہو۔ جیسے گندی ہو۔ پراگندگی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ شیری ان عورتوں میں سے نہ تھی جنہیں اپنے گھر پر ناز ہوتا ہے۔ وہ اسی پراگندگی میں، بے فکری سے، گھومتی پھرتی رہتی۔ میں نے اس بے ترتیبی پر نظر ڈالی اور پھر ذہن میں اپنے ذوق کے مطابق گھر کو نئے سرے سے آراستہ کیا۔ میں اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھ رہی تھی۔ میں تو ہرگز یہ گوارا نہ کرتی کہ کھانا اس طرح پڑا رہے اور مکھیاں اس پر بھنبھنائیں۔ میں اس طرح بے نیازی سے ہاتھ ہلا کر کیڑے مکوڑوں کو کبھی نہ بھگاتی۔ میں پتہ چلا کر رہتی کہ کیڑے مکوڑے اور مکھیاں آتی کہاں سے ہیں۔ میں اس کا اہتمام کرتی کہ گھر میں ایک بھی مکھی نظر نہ آئے۔ یہ سب تو حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے ٹھیک نہیں۔ میں نے سوچا شیری ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھی رہتی ہے؟ پھول کہاں ہیں؟ گل دان کیوں خالی پڑے ہیں؟ کیا اس نے کبھی گھر کے اندر لگائے جانے والے پودوں کا نام نہیں سنا؟ یقیناً کسی گھر کے حسن کو قائم رکھنا اتنا مشکل کام بھی نہیں۔ شیری میں کیا خرابی ہے؟ گھر کوئی ہوٹل یا ایسا لاؤنج تو نہیں ہوتا جہاں آدمی آتے جاتے تھوڑی دیر کے لیے ستا لے۔ اس گھر میں عورت کے سلیقے کی جھلک نظر کیوں نہیں آتی؟

میں نے اس کے گھر کا چکر لگایا۔ میری ناقدانہ صلاحیتیں پوری طرح بیدار ہو چکی

تھیں۔ برآمدوں کی حالت خستہ تھی۔ کرسیاں آدھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ان کا پینٹ جھڑ رہا تھا۔ کرسیوں اور صوفوں کے گدے اور غلاف خاصے ہی بوسیدہ دکھائی دیتے تھے۔

مجھ پر اچانک یہ عقدہ کھلا کہ شیری کو تو اپنی شادی برقرار رکھنے کے سوا کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ اس نے شادی کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ شیری کی توجہ صرف ان جذبات پر مرکوز تھی جو بالآخر مصطفٰے کے موڈ پر اثر انداز ہو کر اس کی بدمزاجی کو ہوا دیتے تھے۔ مصطفٰے کو اس کی پروا نہ تھی کہ وہ ایسے گھر میں رہتا ہے جو گندگی میں ڈنگر خانے سے مشابہ ہے۔ اس سے بہتر گھر میں رہنے کا اسے اتفاق ہی کب ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ شیری آ کر گھر کو چار چاند لگا دے گی۔ وہ ناکام ہو گئی تھی۔ وہ اپنی نجی زندگی میں اتنی غیر محفوظ تھی کہ اس کے لیے اپنے گرد و پیش پر توجہ دینا ممکن ہی نہ تھا۔ بغیر جانے بوجھے اس نے خود کو ایسی چیز بنا لیا تھا جسے برتنے برتانے کے بعد ایک طرف پھینک دیا جائے۔ وہ مصطفٰے کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی۔ خود مصطفٰے کو بھی ٹھیک طرح علم نہ تھا کہ وہ شیری سے کس قسم کی توقعات رکھتا تھا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ جو کچھ دیکھنے میں آیا ہے وہ اس کے آدرش کا پاسنگ بھی نہیں۔ اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے ان نگاہوں کو پا لیا۔ وہ گھر مند تھیں۔ میری طرف سے انہیں مثبت جواب ملا۔ میں اس کی تلاش کو کامیابی سے اختتام تک پہنچا سکتی تھی۔ میں اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس شخص کو دریافت کرنے کے عمل کے دوران یکایک میں نے خود اپنی ذات کا سراغ پا لیا تھا۔

مصطفٰے کی طرف سے آخر کار ایک عید ڈنر کے موقع پر، جو تاج الملک کے گھر پہ دیا جا رہا تھا، سلسلہ جنبانی کا آغاز ہوا۔ ناچ کا اہتمام تھا۔ میزبانی کے فرائض مصطفٰے انجام دے رہا تھا۔ اس طرح کی پارٹیوں میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ جب وہ حسیناؤں کے جھرمٹ میں ہوتا تو اس کے چہرے پر رونق آ جاتی۔ وہ سرتاپا راجا اندر بنا نظر آتا۔

وہ گھر خود بھی رومان آفرینی کے لیے سازگار تھا۔ پرانا گھر تھا، انگریزی راج کے دنوں کا بنا ہوا، اور اس میں چکیلے فرش والی ایک عجوبہ رقص گاہ تھی۔ پرانی وضع کے ترشے ترشائے شیشوں والے جھاڑ فانوس چھت سے آویزاں تھے جن سے گئے گزرے وقتوں کی سی دلربائی پیدا ہو گئی تھی۔ آغازِ عشق کے لیے اس سے موزوں ماحول خیال میں نہیں آ سکتا۔ اس طرح کے گرد و پیش کو تو کسی عام سی تجویز پر بھی عرضِ تمنا کا گمان ہو سکتا ہے۔

مصطفٰے نپے تلے قدم رکھتا ہوا میری طرف آیا۔ مصمم ارادے کے ساتھ۔ مجھ سے کہنے لگا کہ آئیے، ناچیں۔ میں کہاں ناچ سکتی تھی۔ علاوہ ازیں، انیس۔۔۔۔ مصطفٰے اس

کے لیے تیار تھا۔ اس نے نادر شاہی انداز میں شیری کو حکم دیا کہ وہ میرے میاں کے ساتھ رقص کرے۔ یہ بڑی فیاضانہ ادا تھی۔ انتہائی زبردست خراج تحسین تھا۔ ایک جاگیردار اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ رقص کی اجازت دے رہا تھا۔ اس عزت افزائی پر انیس پھولا نہ سمایا۔ وہ فرش پر جا ڈٹا۔ کہنا چاہیے کہ فرش بلکہ چت ہو گیا۔ اس نے اشارتاً مجھ سے کہا کہ مصطفےٰ نے اپنے ساتھ رقص کرنے کی جو پیشکش کی ہے اسے رد نہ کروں۔ میں نے اپنے میاں کو شیری کے ساتھ ناچتے دیکھا۔ وہ اتنا خوش نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ اتنی فطری سی بات معلوم ہوتی تھی۔ آٹھ مہینے خود کو اسی لمحے سے دوچار ہونے کے لیے تیار کرنے میں گزرے تھے۔ اس وقت کی سرمستی آنے والے مزوں کے خیال میں چپکے چپکے گھل مل گئی۔

مصطفےٰ نے ایک آہستہ خرام دُھن کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں جان لوں کہ وہ مجھ پر تصرف حاصل کر چکا ہے۔ تصرف اور ملکیت ہم معنی لفظ تھے۔ وہ بڑے اعتماد سے ایسے کوچے میں قدم رکھ رہا تھا جہاں آنے جانے کی اسے اجازت نہ تھی۔ میں نے مزاحمت نہ کی۔

ہم نے ابھی رقص کے چند ہی پینترے بدلے تھے کہ مصطفےٰ نے یونہی سا پرے ہٹ کر کہا: "مجھ سے شادی کرو گی؟" نہ کوئی تمہید باندھی، نہ کوئی تشبیب نہ گریز، سیدھے سبھاؤ شادی کی تجویز سامنے رکھ دی۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مجھے اس طرح کے سوال کی توقع ہی نہ تھی۔ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "لیکن۔۔۔ مگر۔۔۔ میں تو پہلے ہی۔۔۔ شادی شدہ ہوں۔" "یہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔"

یکایک ہمیں احساس ہوا کہ رقص گاہ میں دوسرے جوڑے بھی موجود ہیں۔ مجھے لگا کہ مصطفےٰ کی تجویز ہر کسی نے سن لی ہے۔ مجھ پر اضطراب اور احساسِ جرم طاری ہو گیا۔ ہم جو رقص کی غرض سے ہم آغوش تھے الگ ہو کر لمحے بھر کے لیے، جو ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا، فرش پر کھڑے رہے۔ وہ مجھے سہارا دے کر میری کرسی تک چھوڑنے آیا۔ نروس تو مصطفےٰ بھی نظر آ رہا تھا لیکن خاصا مطمئن بھی کہ جو بوجھ آٹھ طویل مہینوں سے وہ سینے پر اٹھائے پھر رہا تھا اتر گیا ہے۔ اس نے یہ پانچ لفظ بول کر کہ "مجھ سے شادی کرو گی" اپنی محبت اور نیت کا اظہار کر دیا تھا۔

میری زندگی میں اب تک اس سے زیادہ فیصلہ کن لمحہ کوئی نہ آیا تھا۔ ان پانچ لفظوں نے میری کایا کلپ کر کے مجھے اکائی ہوئی، معمولی سی گھر والی کے بجائے ایسی عورت بنا دیا جس نے پندرہ سال تک مصطفےٰ کھر کو برداشت کیا اور آخرکار سیاسی حریف بن کر اس کے سامنے آ ڈٹی۔

پینڈو "رات میں اجنبی" کی دھن بجا رہا تھا۔ یہ گیت بھٹو صاحب کو بہت پسند تھا اور مصطفےٰ کا پسندیدہ گیت بن چکا تھا۔ میں اب "رات" کو سوچ رہی تھی کہ بھلا کیا ہو گا۔ دل کے کیا پیار کریں گے دونوں۔ اس سے پہلے کہ گزر جائے یہ رات۔" فرینک سناٹرا کے بول مصطفےٰ کے دل میں اتر گئے تھے۔ ان پر عمل اس نے "اپنے انداز" میں کیا۔ ہمارے درمیان کس قیامت کا جذب باہم تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان سب لوگوں نے، جو وہاں رنگ رلیاں منانے جمع ہوئے تھے، اہتزاز کی اس رو کو محسوس کر لیا ہو گا جو ہمارے مابین جاری و ساری تھی۔ اگر انہوں نے محسوس کر لیا تھا تو اپنے محسوسات کو بڑی عمدگی سے چھپا گئے۔ ہمارے خفیہ معاہدے پر مہرِ تصدیق ثبت ہو چکی تھی۔ میں تو بس اتنا چاہتی تھی کہ اس کے گہرے خاکستری سوٹ، ہلکی نیلی قمیض اور گھڑیال کی کھال کے بنے کالے جوتوں کی یاد ذہن میں محفوظ کر لوں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے بھی ہمیشہ میرا اس وقت کا حلیہ یاد رہے گا۔ میرے ماتھے پر الماسی بندیا دمک رہی تھی۔ ایک ایسی کہانی شروع ہو چکی تھی جس میں پریوں کی کہانیوں کا سا انوکھا پن تھا۔

جھجک دُور ہونے کی دیر تھی کہ مصطفےٰ زیادہ بے دھڑک ہو کر مجھ سے پینگ بڑھانے لگا۔ ہم ٹیلی فون پر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ اس نے مجھ سے منوا لیا کہ انیس کے ساتھ میری شادی ختم ہو چکی ہے اور میرا مستقبل اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ وہ فون پر بہت اچھی گفتگو کرتا تھا۔ ہم اکثر ملتے اور اپنے جذبات کے ولولوں کو ہوش و حواس پر حاوی آ جانے دیتے۔ ہم دیوانہ وار محبت میں مبتلا تھے۔ احتیاط، اخلاقیات اور تمیزداری کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔

مصطفےٰ کو ہر وقت مجھ سے کوئی نہ کوئی تقاضا رہتا۔ وہ احتیاط کا قائل نہ تھا۔ میں سہمی رہتی تھی کہ کہیں اوروں کو خبر نہ ہو جائے۔ احساسِ جرم مجھے ڈستا رہتا۔ مصطفےٰ مکمل طور پر پُرسکون نظر آتا۔ کبھی کبھی تو میں باور کر لیتی کہ وہ چاہتا ہے کہ ہماری خفیہ آشنائی کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹ جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس معاملے سے متعلق باقی دو لوگوں یعنی شیری اور انیس کو بھی ہمارے تعلقات کا پتہ لگنا چاہیے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہماری شادیوں کا ٹنٹا ختم ہوتا کہ ہم آزاد ہو کر ساتھ رہ سکیں۔

جو دل میں آ جائے اسے فوراً کر ڈالنے کی عادت۔ مصطفےٰ فون کر کے کہتا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ ابھی ابھی۔ انیس گھر پر ہے۔ ملنے میں بہت خطرہ ہے۔ مصطفےٰ کو کوئی پروا نہ تھی۔ وہ مجھ سے ملنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیتا۔ ہماری ان ملاقاتوں کا ایک مزاحیہ پہلو بھی تھا لیکن اب ان گزری باتوں پر غور سے نظر ڈالتی ہوں تو وہی پہلو بے دردی اور بے حسی سے عبارت معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے لیے اب ایک دوسرے سے

الگ رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ فیصلہ کرنے کی گھڑی آپہنچی تھی۔

مصطفےٰ نے فون کیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ فی الفور۔ کہنے لگا کہ میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ "لیکن کیسے؟ انیس گھر پہ ہے۔ تم نہیں آ سکتے۔" "فکر مت کرو۔ میں اسے گھر سے دفان کیے دیتا ہوں۔ چٹکی بجاتے میں۔"

دو منٹ بعد فون بجا۔ گورنر ہاؤس سے فون تھا۔ انیس کے لیے۔ میں نے ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ سنتا اور سر ہلاتا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "مجھے گورنر ہاؤس جانا ہے۔ مصطفےٰ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ گورنر کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہے۔" وہ چلا گیا۔ اس قدر عجلت کے ساتھ جو زیب نہیں دیتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مصطفےٰ آ موجود ہوا۔ "انیس کہاں ہے؟" میں نے سانس روک کر پوچھا۔ "تیر رہا ہے۔" مصطفےٰ نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

انیس گورنر ہاؤس پہنچا۔ مصطفےٰ نے اس سے ملاقات کی۔ پھر اس نے انیس سے کہا کہ وہ ذرا نہانے کے تالاب میں ڈبکی لگائے کیونکہ اسے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ وہ جلد ہی لوٹ آئے گا۔ انیس کو مصطفےٰ کے دوست، رؤف خاں، نے نہانے کا جانگیا دیا اور دھکیل دھکیل کر تالاب میں اتار دیا۔ اس کا دل بڑھاتے رہے تاکہ وہ تیرتا ہی رہے۔ جب وہ باہر آتا تو رؤف اسے کھینچ کھانچ کر دوبارہ تالاب میں لے جاتا۔ وہاں وہ زبردستی ادھر سے ادھر تیرنے میں مشغول تھا یہاں مصطفےٰ اور میں ساتھ تھے۔ فون بجا۔ فون گورنر ہاؤس سے آیا تھا۔ "جناب، ہم اب اسے زیادہ دیر پانی میں ٹھہرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ گھٹن کے مارے بیہوش ہو جائے گا۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا ہے اور وہ تنگ آ چکا ہے۔" "پانچ منٹ بعد باہر نکال دینا۔ کہنا کہ میرا ابھی ابھی فون آیا تھا۔ میں پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔" ہم بے رحمانہ انداز میں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مصطفےٰ کو اپنے کیریر میں دوسری مرتبہ پنجاب کے گورنر کے طور پر پوری مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع ملا تھا۔ میں نے اس کی حلف برداری کی تقریب میں شرکت کی۔ تقریب کے دوران پورے وقت میری آنکھیں ڈبڈبائی رہیں۔ ہر کوئی شیری کو مبارک باد دے رہا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ میں پریشان اور بدحواس تھی۔ اس وقت بھی، جب مصطفےٰ نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھا، ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں خود کو تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ اُسی دن بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ کوئی سرکاری عہدہ اس محبت پر فوقیت نہیں رکھ سکتا جو اسے مجھ سے ہے۔ اسے والہانہ عشق

اگر کسی سے ہے تو صرف مجھ سے۔

امور مملکت کا تقاضا بڑھا۔ مصطفےٰ کو بھٹو صاحب کے ساتھ پنجاب کے دورے پر نکلنا پڑا۔ اچانک لاہور میں کوئی آب و تاب نہ رہی۔ میں فرار ہو جانا چاہتی تھی۔ دوبارہ سوچنا چاہتی تھی۔ صورتحال کو پرکھنا چاہتی تھی۔ نکل بھاگنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

پنجاب کے اندرون میں واقع کسووال میں میری ایک عزیزہ رہتی تھیں۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ میں آ کر کچھ دیر ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایسی جگہ درکار تھی جس تک مصطفےٰ کی رسائی نہ ہو سکے۔ میں اس کے بغیر زندگی گزارنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔ کسووال مثالی مقام تھا۔ نہ سڑکیں۔ نہ بجلی۔ نہ ٹیلی فون۔ میں اپنی شیر خوار بچی، تانیا، کو ساتھ لے کر کسووال چلی گئی۔

مصطفےٰ لاہور لوٹا۔ یہ پتہ چلنے پر کہ میں شہر چھوڑ کر چلی گئی ہوں وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے وہی کیا جو فوری طور پر دل نے سمجھایا۔ اس نے گورنر کے طیارے کو حکم دیا کہ اسے اوکاڑہ پہنچایا جائے۔ اپنی سرکاری مرسیڈیز، پانچ سو ایس ای ایل، اس نے سڑک کے راستے اوکاڑہ بھجوا دی۔ جب وہ اوکاڑہ اترا تو کار اس کی منتظر تھی۔ وہ تاج الملک اور پائلٹ کو ساتھ لے کر کسووال میں وارد ہوا۔

عجیب منظر تھا۔ پنجاب کا گورنر، کسی پیشگی اعلان کے بغیر، پروٹوکول کے بغیر، کسووال پہنچا ہوا ہے۔ اس دنیا جہان سے الگ تھلگ، اجڑی پجڑی جگہ کے رہنے والے غریب غرباء حیران بھی ہوئے اور مرعوب بھی۔ مصطفےٰ کسووال کے تنگ گلی کوچوں میں اکٹھے ہونے والے حیرت زدہ ہجوم کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا رہا۔ پی پی پی کے لیے مزید ووٹ یقینی ہو گئے۔ گورنر کو صوبے کے اندرون کا خیال ہے۔ یہ خبر قومی پریس میں آ گئی۔ یہ کسی کو پتہ نہ تھا کہ اس نے صرف ایک عورت کی خاطر اس ویرانے تک جانے کا جوکھم اٹھایا تھا۔

شور و غوغا سن کر میں تو حواس باختہ ہو گئی۔ میں نے کار کے آنے کی آواز سنی۔ چق اٹھا کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ "تمہیں لاہور واپس چلنا ہوگا۔ ابھی۔ میں تمہارے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔"

رشتے داروں کے سامنے بہانے بنانے کے سوا چارہ کیا تھا۔ میں نے کہا کہ پنجاب کا گورنر میرے میاں کا دوست ہے۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔ وہ میرے خیالوں پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے عزیز و اقارب کو خدا حافظ کہا جو بہت مرعوب ہو چکے تھے اور ابھی سے اس مشہوری کے خیال سے ہونٹ چاٹ رہے تھے جو گھر پر گورنر کی آمد سے ان کے حصے میں آنے والی تھی۔

ہم، میری بچی، مصطفٰے اور میں، ایک ساتھ رخصت ہوئے۔ ہم اوکاڑہ پہنچے۔ میرے لیے اس طرح سفر کرنا ضروری تھا کہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ میں نے بستر کی سفید چادر سے کام چلاؤ سا پردہ تیار کیا، ایسی چادر جس میں سے صرف میری آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم گورنر کے طیارے پر سوار ہوئے اور لاہور روانہ ہو گئے۔

مصطفٰے طیارے سے اترا، سرکاری کار میں بیٹھا اور سائرنوں کے شور میں، موٹر سائیکل سوار جلوداروں کے ساتھ، گھر کا رستہ لیا۔ میں بھیس بدل کر باہر آئی۔ ایک اور کار میں سوار ہوئی جس میں رنگین شیشے لگے تھے اور پیچھے پیچھے چل پڑی۔

میرے شوہر کو مصطفٰے نے ایک انتہائی خفیہ مشن پر پشاور چلتا کر دیا تھا۔ اسے وہاں ایک اہم "صرف آپ کے پڑھنے کے لیے" خط کسی کو پہنچانا تھا لیکن اسے مکتوب الیہ سے ملانے میں ٹال مٹول سے کام لیا گیا تاکہ وہ پشاور میں مجبوراً رکا رہے۔ مصطفٰے کا دوست، رؤف خاں، اسے ہوائی اڈے پر چھوڑ کر آیا تھا تاکہ اس کی روانگی کے بارے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ وہ اپنا مشن مکمل کیے بغیر واپس نہ آ سکتا تھا۔ ادھر مصطفٰے بدنصیب انیس کو واپس بلانے سے پہلے خود اپنے مشن کو یقینی طور پر تکمیل تک پہنچانے کے لیے تلا بیٹھا تھا۔

ہم گورنر ہاؤس پہنچے۔ میری بچی اور اس کی انا میرے ساتھ تھی۔ ہمیں صدارتی سُوٹ میں ٹھہرایا گیا۔ مصطفٰے نے ڈنر میرے ساتھ تناول کیا۔ اس کے چہرے پر کمال کی مسکراہٹ تھی۔ شرارت بھری۔ میں گھبرائی ہوئی تھی۔ اگر شیری کو پتہ چل گیا تو؟

مصطفٰے نے مجھے بتایا کہ شیری ہمیں پریشان نہیں کرے گی۔ وہ شیری سے کہہ آیا ہے کہ وہ نیچے کی منزل میں علمائے کرام کی خاطر تواضع میں مصروف ہے۔ علمائے کرام کا مطلب ہے خالص مردانہ محفل۔ مذہبی عالموں کی محفل میں کوئی عورت میزبانی کے فرائض انجام دے، یہ بالکل محال ہے۔ شیری کو اپنے کمرے میں ٹھہرنا ہوگا۔ شیری نے اس من گھڑت پر یقین کر لیا۔

شمعوں کی روشنی میں آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے ہم اپنے باہمی مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔

خاصی رات گزر جانے کے بعد مصطفٰے رخصت ہوا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔ میں اکیلی پڑی کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی۔ احساس جرم کا شکار لیکن ساتھ ہی مطمئن کہ کوئی میرا چاہنے والا بھی ہے۔ میری آنکھ صبح سویرے کھل گئی۔ میں نے اپنے خیالات مجتمع کیے، بچی اور انا کو ساتھ لیا اور گورنر ہاؤس سے چلی آئی۔ اس کے بعد قیامت برپا ہو گئی۔

شیری کو پتہ چل گیا۔ وہ گورنر ہاؤس میں کھانے پینے کی چیزوں پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ اسے بڑا غصہ آیا کہ ایک دن میں اتنا دودھ کیسے خرچ ہو گیا۔ مجرم تو تانیا تھی۔ شیری نے ملازموں پر الزام لگایا کہ دودھ انہوں نے چرا لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بے قصور ہیں اور شیری کو بتایا کہ دودھ ایک چھوٹی بے بی پیتی رہی ہے۔ "چھوٹی بے بی؟ کس کی چھوٹی بے بی؟" "میم صاحب کی بے بی۔ مہمان میم صاحب۔" "کیسا مہمان؟ کون سی میم صاحب؟" "ہمیں نام نہیں معلوم۔ لمبے لمبے سرخ بالوں والی میم صاحب۔" تہمینہ۔

اب شیری جان گئی۔ علمائے کرام کا ذکر تو اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے تھا۔ مصطفٰے بچ بچا اس کے پلنگ کے نیچے (نچلی منزل میں) چھپ کر عشق لڑا رہا تھا۔ میاں بیوی میں ٹھن گئی۔ مصطفٰے نے بڑے اطمینان سے مان لیا کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہے۔ اس نے شیری کو بتایا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ نہ کوئی حیلے حوالے۔ نہ کوئی جھوٹ کپٹ۔

مصطفٰے نے یہ ساری بات مجھ سے چھپائے رکھی۔ شیری مقابلے میں ڈٹ گئی۔ وہ ہمارے ٹولے کی تمام خواتین کے آگے یہ ذکر کر بیٹھی۔ مجھے اچانک یہ محسوس ہوا جیسے ہر طرف شر پھیل گئی ہو۔ خواتین نے مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف رہا میری طرف دیکھنا تک چھوڑ دیا۔ میں گھر بگاڑنے والی قرار پائی۔ اس رویے سے نمٹنا میرے لیے بہت مشکل ہو گیا۔ مصطفٰے کے عاشقانہ تیور اور اندازِ گفتگو زیادہ نڈر اور واضح ہوتا گیا۔ مجھ سے خواتین کی مخاصمت کچھ اور بڑھ گئی۔

گورنمنٹ ہاؤس میں ممتاز بھٹو کے اعزاز میں دیے جانے والے ایک ڈنر کے موقع پر میرے ٹولے کی عورتیں جان بوجھ کر مجھ سے دُور رہیں اور بات کرنے سے اجتناب کیا۔ شیری کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں طلیعہ در انداز تھی۔ لیلی۔ لفنگن۔ میں دیدہ دلیری سے مصطفٰے کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ میں بڑی بہادری سے میدان میں ڈٹی رہی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، پھیلی پڑ جانے والی سسکی میں کوک سے بھرے گلاس کو بڑی سختی سے پکڑے ہوئے تھی۔ جذبات سے بے قابو ہو کر آنسو بہانے اور اپنی جگ ہنسائی کا سامان آپ کرنے میں سراسر میرا نقصان تھا۔ میں خود کو اس طرح بے نقاب نہ کر سکتی تھی۔ میں تو بس یہی چاہتی تھی کہ کہیں غائب ہو جاؤں۔ کہیں جا چھپوں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں اور سب ہونٹ کینہ آمیز گپ شپ کا طوفان اگلنے میں مشغول ہیں۔ میں داغ دار ہو چکی تھی۔

خواتین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کے خاموش رہنے سے مجھے اتنی تکلیف نہیں

پہنچ رہی جتنی پہنچنی چاہیے۔ انھوں نے مجھے چڑانا شروع کر دیا۔ وہ آپس میں زور زور سے باتیں کرنے لگیں۔ انھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی گفتگو مجھے سنائی دے رہی ہے۔ وہ ایک فرضی بیاہی عورت کا ذکر کرنے لگیں جو شادی شدہ مردوں سے یارانے گانٹھتی پھر رہی تھی۔ انھوں نے اس طرح کے کرتوت کی مذمت کی اور کہا کہ ایسی عورتوں کا سماجی سطح پر بائیکاٹ کر دینا چاہیے۔ زانیہ کو سنگسار کرنے کا عمل انھوں نے نگاہوں میں اور زہر میں بجھی زبانوں کی مدد سے کر دکھایا۔ میں نے طے کر لیا کہ ان ستانے والیوں سے میں آپ قطع تعلق کر لوں گی۔ ہم نے ضیافتوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔ ایسی دعوتوں سے بہت زیادہ ناخوشگوار یادیں وابستہ ہو چکی تھیں۔

سوشل منظر سے ہمارے غائب ہو جانے پر لوگ چونکے۔ مصطفےٰ کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ ہم اس ڈنر میں شریک نہ ہوئے تھے جو گورنر ہاؤس میں بیگم نصرف بھٹو کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ وہ ہماری غیر حاضری کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ بضد تھا کہ وجہ بتائی جائے۔ میں نے ساری بات اسے بتا دی۔ وہ ہنستا رہا۔ اور پھر اس نے کہا کہ وہ اس کا تدارک کر کے رہے گا۔ "سب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

اگلے دن میں شیری کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے برسرِ مطلب آنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ کہنے لگی کہ اسے مصطفےٰ نے بھیجا ہے۔ "مجھے تمہارے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔ میں صورتحال کو قبول کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے میاں اور تم ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو---- وہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ہاں دعوتوں میں شریک ہوا کرو۔ میں تمہاری موجودگی کا برا نہیں مانوں گی۔ نہ دوسری خواتین کو کوئی رنج ہو گا۔"

میں بہت جھینپی، بہت گھبرائی۔ شیری واضح طور پر پریشان معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی سہیلی، گگو کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ غیر اخلاقی سہارے کے طور پر۔ "سنو میں یہاں آئی ہوں تو اس لیے کہ مصطفےٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ یہاں آؤں اور یہ پیغام پہنچا دوں۔ میں طوعاً و کرہاً یہاں آئی ہوں۔ میں اپنا سہاگ بچانا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم آئندہ اس سے نہ ملو۔ اگر تم نے اس سے ملاقات کی تو میں---- تو میں خودکشی کر لوں گی۔ میری زندگی سے نکل جاؤ۔ مصطفےٰ کی زندگی سے نکل جاؤ۔ وہ بہت ٹیڑھا آدمی ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہو چکی ہوں۔ تمہیں اس کے بارے میں خاک علم نہیں۔ وہ تمہارے لیے ٹھیک نہ رہے گا۔ تمہاری زندگی برباد کر دے گا۔"

اس کے بعد اس نے میرے سامنے اس سلوک کا مبین نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جو مصطفےٰ نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ "یہ تمام ہولناک حرکتیں وہ میرے ساتھ کر چکا ہے۔ لیکن میں نے ٹھان لی ہے کہ اس شادی پر آنچ نہ آنے دوں گی۔ میں حالات سے نپٹنا جانتی ہوں۔ مجھے بھی کسی نہ کسی طرح گزارا کرنا ہے۔ تم پر لازم ہے کہ میری زندگی سے لاتعلق ہو کر میرا ہاتھ بٹاؤ۔ مہربانی ہو گی۔"

میں نے عہد کیا کہ شیری کے شوہر سے کوئی تعلق نہ رکھوں گی۔

یہ عہد چند روزہ ثابت ہوا۔ مصطفےٰ میرا پیچھا چھوڑتا ہی نہ تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ شیری میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ شیری نے کہا کیا تھا۔ لیکن میں نے مصطفےٰ پر واضح کر دیا کہ ہمارا یارانہ ختم ہو چکا ہے۔ اسے جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ ہماری وجہ سے بہت زیادہ لوگوں کو دکھ پہنچے گا۔

چار دن بعد مصطفےٰ مجھ سے ملنے آموجود ہوا۔ پیچھے پیچھے شیری، جیسے کھینچ کر لائی گئی ہو۔ جو مکالمہ اسے رٹوایا گیا تھا وہ اس نے یوں ادا کیا جیسے اپنے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ شیری نے اپنے کرب اور تلخی پر پردہ ڈالے رکھا۔ وہ درماندہ اور شکست خوردہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے میری منت کی کہ میں ان کے حلقے میں لوٹ آؤں۔ میں پھندے میں آ گئی۔ یہ شخص اپنی محبوبہ کو منانے کے لیے خود اپنی بیوی کو استعمال کر رہا تھا۔ یہ کج روی تھی لیکن جہاں مصطفےٰ ہو وہاں عجیب و غریب معاملات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔

ہم ایک بار پھر سوشل حلقوں کا حصہ بن گئے۔ مخاصمت دب گئی مگر ابھی موجود تھی۔ بیشتر ڈنر جب ختم ہوتے تو مرد ایک طرف جا کر بیٹھ جاتے اور عورتیں دوسری طرف۔ میں ان عورتوں سے ملنے جلنے پر مجبور ہو جاتی جنھیں مصطفےٰ سے میری اٹھکیلیاں ناگوار گزری تھیں۔ یہ میرے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تعلقات منقطع کر کے غائب ہو جاؤں۔ مصطفےٰ نے کچھ اور ٹھان رکھی تھی۔

شیری میرے استفادے کے لیے مصطفےٰ کے ساتھ اپنے مثالی "تعلقات" کا خاص طور پر چرچا کرتی رہتی۔ "مصطفےٰ کہتے ہیں کہ شادی شدہ مردوں سے عشق لڑانے والی عورتیں چھنال ہوتی ہیں۔ ان کی خوب اچھی طرح مذمت کی جانی چاہیے اور انھیں سزا ملنی چاہیے"۔ "مصطفےٰ کہتے ہیں---" گفتگو کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ اس دوران میں صاف پتہ چلتا رہتا کہ دبی دبی ہنسی کی آوازیں آ رہی ہیں، کہنیاں ماری جا رہی ہیں اور واضح طور پر کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ جرم کا احساس آدمی کی حساسیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ آپ کے حواس اتنے تیز ہو جاتے ہیں جتنے پہلے کبھی نہ تھے۔

ایک ڈنر پر ہمارے سربرآوردہ صنعت کاروں کی بیویوں نے طے کیا کہ مجھے مزہ چکھایا جائے۔ انھوں نے میرے بارے میں ایسے توہین آمیز جملے کہے کہ بے بسی کے

مارے میرے آنسو نکل آئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شیری کی سہیلیاں ہیں اور انھیں اکسایا گیا ہے۔ یہ واقعہ مصطفیٰ کے علم میں آ گیا۔ میری زبانی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ فکر مت کرو۔ میں ان عورتوں کو سبق سکھا کر چھوڑوں گا۔

اگلے روز دونوں عورتوں کے شوہروں کو گورنر ہاؤس طلب کر لیا گیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بیگمات جا کر تہمینہ سے معافی مانگیں۔ آج ہی۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو مجھ سے خیر کی امید نہ رکھیں۔ تہمینہ کی بے عزتی کی قیمت آپ لوگ ادا کریں گے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

مصطفیٰ جانتا تھا کہ ان کی بیویاں میرے پاس پہنچیں گی۔ صوبے کے حاکم اعلیٰ کی ناراضگی مول لینا ان کے لیے سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ وہ سیدھے گھر گئے اور ان کی بیگمیں سیدھی میری خدمت میں حاضر ہو گئیں۔ انھوں نے معافی مانگی۔ مصطفیٰ کو پتہ تھا کہ اس نے مجھے مشکل صورتحال سے دوچار کر دیا ہے۔ اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس نے مجھے تحفظ فراہم کیا۔ میں نے اس سے شادی کا جو عزم کیا تھا اسے پختہ تر کرنے کے لیے اس طرح کے تحفظ کی فراہمی ضروری تھی۔ وہ ہر کسی سے ٹکر لینے کو تیار تھا۔ اسے پروا نہ تھی کہ ان باتوں کے اتفاقی مگر منفی نتائج کیا ہوں گے۔ اس پر تو مجھے اپنے تصرف میں لانے کی دھن سوار تھی۔

شیری اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے تھوڑی دیر سستانے کی ضرورت ہے۔ اسے روحانی مدد درکار تھی۔ اس نے عمرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مصطفیٰ اور میں اور زیادہ وقت ساتھ گزارنے لگے۔ میں دن میں اکیلی اس سے ملتی اور رات کو وہ انیس کو اور مجھے ڈنر پر مدعو کر لیتا۔ انہیں چند دنوں کے دوران ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم اذیت کو مزید طول دینے یا اپنے زوج کے ساتھ یہ مسلسل سی چیستان جاری رکھنے کے حق میں نہ تھے۔

شیری عمرہ کر کے لوٹی۔ ہم اسے لینے ہوائی اڈے گئے۔ میں بتا سکتی تھی کہ اس نے کیا دعا مانگی ہو گی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ناپاک ہوں، جیسے میرے بارے میں کچھ بھی چھپا نہ رہا ہو۔ شیری سے تقدس اور طمانیت جھلکی پڑ رہی تھی۔ مجھے تشویش لاحق ہو گئی۔ اللہ اس کی دعائیں قبول کر لے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نے مصطفیٰ ہی کو مانگا ہو گا۔ مصطفیٰ اس کے پاس لوٹ جائے گا۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چل دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول نہ کی۔ ویسے اللہ اپنی پُراسرار مصلحتوں کے تحت، میری التجا سن رہا تھا۔ شاید میری التجا سنی ہی اس لیے گئی کہ اس طرح مجھے سزا دینی مقصود تھی۔ اللہ نے شیری کی درد بھری فریاد سن لی اور اسے چھٹکارا دلانے کے لیے

ایک منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔

میں ابھی ابھی بائیس برس کی ہوئی تھی۔ ہم نے سالگرہ کا جشن منانے کے لیے ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ مصطفیٰ کا رویہ کسی حاسد عاشق کا سا تھا۔ اسے انیس کی موجودگی خار کی طرح کھٹک رہی تھی۔ وہ چاہتا ہی نہ تھا کہ انیس میرے پہلو میں نظر آئے اور جب میں اپنے میاں سے بات کرتی تو تیوری چڑھا کر مجھے گھورنے لگتا۔ اس نے مجھ پر واضح کر دیا کہ مجھے کسی اور مرد کے ساتھ دیکھنا، خواہ وہ میرا شوہر ہی کیوں نہ ہو اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اس مرحلے پر اس کی تصرف پسندی سے میری انا کو بڑی تسکین پہنچی۔

عید سے ایک دن پہلے مصطفیٰ نے فون کیا اور کھڑے کھڑے عید لنچ کی تجویز سامنے رکھی اور اپنے آپ کو لنچ پر خود ہی مدعو کر لیا۔ لنچ مجھے ہاتھ کے ہاتھ تیار کرنا پڑا۔ اس قدر عجلت کے باوجود میں شیمپین اور ویب کے تیار کردہ روپہلے چھری کانٹے چمچے اور مینے کے منقش، بوہیمین گلاس نکالنے نہ بھولی۔ کھانا نفیس روزنتھال کراکری میں پیش کیا گیا۔ کھانا یونہی سا تھا اور مصطفیٰ کو جو خاصا خوش خوراک واقع ہوا تھا، اس کے غیرمعیاری پن کا فوراً اندازہ ہو گیا۔ لمحے بھر کے لیے موقع ملتے ہی اس نے میرے کان میں کہا: "تمہاری سروس کمال کی ہے۔ میرا پکایا ہوا کھانا [illegible]تا ہے۔ میری سروس کا معیار پست ہے۔ تمہارا کھانا واہیات ہے۔ ہم اپنی خوبیوں کو یکجا کیوں نہ کر لیں۔ ہمارے لیے ایک مثالی صورتحال وجود میں آ جائے گی۔" میں سمجھ سکتی تھی کہ مصطفیٰ کی مراد اصل میں کیا ہے۔ اس غیر معمولی تجویز پر ہر کسی نے مجھے جھینپ کر سرخ ہوتے دیکھا ہو گا۔ دیکھنے والوں کے لیے دعوتِ فکر۔

جلد ہی ہم دونوں کی وجہ سے افواہ بازوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ "جیٹ سیٹ" سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے وقت گزاری کا پسندیدہ مشغلہ گپ بازی ہے اور وہ بھی ایسی جس میں دوسروں کی بدنامی کا پہلو نکلتا ہو۔ اس زبردست معاشقے کا چرچا چار سو ہونے لگا۔ لندن میں امی تک بھی خبر پہنچ گئی۔ وہ ہوائی جہاز سے کراچی آئیں اور انیس سے خوب کھل کر بات چیت کی۔ انھوں نے اسے مصطفیٰ سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ "گورنر کی نئی فتح" کا ذکر ساری دنیا کی زبان پر ہے۔ "میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں۔ اس شخص سے ملنا جلنا چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اپنی بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

انیس نے اس تنبیہ کو اس کان سُن کے اُس کان اڑا دیا۔ اسے بہت زیادہ بھروسا اس بات کا تھا کہ وہ مجھ سے عشق کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ خوددار آدمی تھا۔ اس

افواہوں کو کینہ توز گپ بازی قرار دے کر نظر انداز کر دیا اور امی کو بتایا کہ وہ جس سے بھی چاہے گا ملے گا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

ہمارے بارے میں جو افواہیں گرم تھیں وہ ٹھنڈی نہ پڑیں۔ رسالے باتیں چھانٹ کر ہمیں دق کرنے لگے۔ ہمارے معاشقے کی سب کو خبر ہو گئی۔ میری سسرال والوں کو بھی پتہ چل گیا۔ انیس کا بھلا چاہنے والے اسے ہر وقت خبردار کرتے رہتے۔ بیشتر صورتوں میں شوہر کو سب سے آخر میں پتہ چلتا ہے کہ بیوی نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ انیس کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اصل میں وہ کچھ جاننا چاہتا ہی نہ تھا۔

ہماری ملاقاتیں زیادہ تواتر سے ہونے لگیں اور اب غور کرتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم ملنے بھی زیادہ ڈھٹائی سے لگے تھے۔ محبت میں مبتلا ہو کر آدمی انجام اندیشہ بالکل نہیں سوچتا۔ مصطفےٰ دن میں تین تین چار چار بار فون کرتا اور اگر کسی روز مجھ سے نہ مل سکتا تو بجھ کر رہ جاتا۔ محبت کرنے والا رِسک لینے میں بھی بہت ماہر ہو جاتا ہے۔ گھر سے باہر جانے کی وجوہ تلاش کرنا یا بہانہ گھڑنا میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا تھا۔ مجھے بار بار جھوٹ بولتے ہوئے ذرا لحاظ نہ آتا۔ انیس کو شبہ تک نہ ہوتا۔ مجھ میں بہت کٹھورپن آ گیا تھا اور میں محبت میں اس قدر مبتلا ہو چکی تھی کہ مجھے کچھ پروا نہ رہی تھی۔ مصطفےٰ شدید جذبات رکھنے والا آدمی تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم نہ کر سکتا تھا کہ جس عورت سے اسے عشق ہے وہ اس کی نہیں کسی اور کی ہے۔ قانون میں اصل اہمیت ملکیت کی ہے۔ جاگیردار ہونے کے ناطے وہ اس نکتے سے باخبر تھا۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ میں آدھے وقت اس کی کہلاؤں اور آدھے وقت کسی اور کی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں پوری طرح اس کی ہو جاؤں۔

ہمارے تعلقات میں ایک طرح کی تلخی آہستہ آہستہ سرایت کر رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر بیاہی عورت کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ انیس کا نام سنتے ہی مصطفےٰ بھڑک جاتا اور مجھ سے تمام وقت جھگڑتا رہتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کے حصے میں محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خود کو یہ کہنے پر آمادہ نہ کر سکا کہ میں انیس کو چھوڑ دوں۔ یہ تذبذب اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ اس نے کبھی رسماً بھی طلاق کا نام نہیں لیا۔ اس کے باوجود وہ مجھے طلاق کی طرف دھکیل رہا تھا۔ یہ اس کی فراخ دلی تھی کہ اس نے کبھی مجھے بلیک میل نہیں کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنے فیصلے میں آپ کروں۔ یہ اس کا ثبوت ہو گا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ کچھ تو معاشرتی فشاروں کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ میں انیس کو دکھ نہ پہنچانا چاہتی تھی میں ابھی تک ڈانواں ڈول تھی۔

ایک بار زرتنگ میں آ کر وہ گورنر کے طیارے میں مجھے اپنے گاؤں لے گیا۔ شیری ہمارے ساتھ تھی۔ وہاں پہنچ کر شیری نے چارج سنبھال لیا اور مجھے اس کی زمینیں دکھاتی پھری۔ اپنے سائیں کا گھر دیکھ کر مجھے کچھ دھکا لگا۔ وہ نہ تو حویلی تھی نہ کسی زمیندار کی ڈیوڑھی۔ جاگیردارانہ معیاروں سے وہ چھوٹا سا گھر تھا اور وہ بھی خستہ و شکستہ۔ اپنے گردوپیش سے پوری طرح ہم آہنگ۔ غربت نے، کسی اوکٹوپس کی طرح، اپنے لمبے لمبے ہاتھ ہر طرف پھیلا رکھے تھے۔ اس کے خاندان کا ڈھانچہ قبائلی زیادہ اور جاگیردارانہ کم تھا۔ وہ جاگیردار ہونے کی بہ نسبت قبائلی سردار زیادہ تھا۔ درحقیقت اپنے قبیلے کا غالباً وہ پہلا فرد تھا جس نے جاگیردارانہ طرز زندگی اپنانے کی آرزوؤں کو دل میں پالا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے قبیلے کے افراد ابھی تک ذہنی طور پر ہندومت کے غلام تھے۔ ان کی روایات مختلف ادیان کا ملغوبہ تھیں۔ راسخ العقیدگی کو اسلام کی ایک بہت ہی ہند زدہ شکل میں پیوند کر دیا گیا تھا۔ اس طرح عقیدے کی پختگی ڈھیلے پن کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ کون مسلمان تھا اور کس حد تک مسلمان تھا، اس کا کوئی تعین نہ ہو سکتا تھا۔

اور اس کے باوجود مجھے اپنی زمینیں اور پرانے گھر دکھاتے وقت وہ بڑا فخر محسوس کر رہا تھا۔ وہ بظاہر یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہے وہ جگہ جہاں سے ابھر کر میں منظرِ عام پر آیا۔ دیکھو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔ وہ اپنے حسب نسب پر شرمسار نہ تھا۔ ان کی وجہ سے اس کی عظمت کی شان دوبالا ہو جاتی تھی۔ مصطفےٰ نے اپنی اوئی شروعات کو بیساکھیاں بنا کر ہمدردی حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنایا۔ یہ شروعات اس کے لیے حقیقی معنی میں باعث افتخار تھی۔ اس نے اپنے علاقے کو کبھی بھلایا نہیں اور اس پر ان لوگوں کے حالات سدھارنے کا جنون سوار رہتا تھا جن کی وجہ سے اسے اتنا زبردست امتیاز نصیب ہوا تھا۔ وہ کھرا لٹ فرزند تھا۔ اکثر اپنے علاقے کا رخ کرتا۔ مجھ پر اس کی راستبازی نے گہرا اثر چھوڑا۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوئی کہ اس نے اپنی شروعات پر کوئی ملمع چڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس روز میری وہاں موجودگی اس کے نقطۂ نظر سے اہم تھی۔ یہی وہ سیاق و سباق تھا جو مصطفےٰ کو معنویت عطا کرتا تھا۔

ہمارا رومان پروان چڑھتا رہا۔ مصطفےٰ ناقابل علاج رومان پسند تھا۔ وہ مجھے رات کے تین بجے فون کرتا۔ "تہمینہ، میں تم سے ملنے کے لیے مرا جا رہا ہوں۔" "لیکن تم نہیں مل سکتے۔ میں اس وقت تم سے نہیں مل سکوں گی۔" "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ دوں اور تمہارے پاس آ جاؤں۔" "مصطفےٰ، بہت رات جا چکی۔ میں تم سے باتیں نہیں کر سکتی۔ انیس۔۔۔۔" "فون بند مت کرو۔ میں

دس منٹ بعد کار میں تمہارے گھر کے آگے سے گزروں گا۔ جا کے کھڑکی میں کھڑی ہو جاؤ۔ صرف ایک منٹ کے لیے۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ پنجاب کا گورنر کار میں بیٹھا میرے سامنے سے گزرتا۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھتا۔ میں مسکراتی اور پردہ کھینچ لیتی۔

انیس کاروبار کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے سنگاپور چلا گیا۔ میں کراچی میں تھی۔ مصطفےٰ بھی کراچی آ گیا۔ اس نے مجھے سندھ کے وزیرِاعلیٰ کے گھر پر ایک ڈنر میں مدعو کیا۔ میں نے دعوت میں شرکت کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میری ایک سہیلی مجھ سے ملنے گئی۔ ہمارے درمیان اس دیوانگی کی حد کو چھونے والے عشق کا ذکر چھڑ گیا جو مجھے مصطفےٰ سے تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ مصطفےٰ میرے سطحی روپ کی محبت میں گرفتار ہے۔ "وہ تم سے محبت کرتا ہے کیونکہ تم شکل کی اچھی ہو۔ تم خوش پوش ہو۔ تم سے اس کا امیج سنورتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں جیت لے اور اپنی کامیابی پر اتراتا پھرے۔ ایک دفعہ وہ تمہیں اس حال میں دیکھ لے کہ بالوں میں کرلرز لگے ہوئے ہیں یا چہرے پر نائٹ کریم تھپی ہوئی ہے تو تم سے محبت کرنی چھوڑ دے گا۔ وہ تمہاری ظاہری زیب و زینت پر فدا ہے۔ تم اصل میں جیسی ہو اس پر نہیں۔"

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کیا یہ بات سچ ہو سکتی ہے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفےٰ کو آزما کے دیکھتی ہوں۔ میں ثابت کرنا چاہتی تھی کہ چاہے میں پھٹیچر سا لباس پہنوں اور بھیانک نظر آؤں وہ پھر بھی مجھ سے محبت کرتا رہے گا۔

اس رات میں چارخانوں والے ہلکے نیلے گنگھم کا ایک ہولناک سا لباس پہن کر ڈنر پر گئی۔ اس لباس میں جھالروں کی تین پرتیں تھیں جو میرے ٹخنوں تک پہنچ رہی تھیں۔ سامنے کی طرف ایک YOKE تھا جس سے مزید جھالریں آویزاں تھیں۔ بظاہر نرسری میں پڑھائی جانے والی کسی تک بندی کو سامنے رکھ کر یہ لباس وضع کیا گیا تھا۔ لباس کی ہئیت کو مزید بگاڑنے کے لیے اس پر ایک پلاسٹک سٹکر چسپاں تھا جس میں کانچ اور موتی سی دم والی پلی ہوئی گائے کی مدد سے ایک مکمل دیہی منظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ لباس کی پھولی پھولی آستینوں سے مضحکیت کی طرف میرے اس سفر کی تکمیل ہوئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں پرلے درجے کی احمق ہوں۔ اس حماقت میں کوشش اور بناوٹ کا بہت دخل تھا۔ لیکن میں اپنی بات ثابت جو کرنا چاہتی تھی۔

میں نے سندھ کے وزیرِاعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ میں قدم رکھا تو یوں لگ رہی تھی جیسے "تاد، جا" کھیلتے کھیلتے بھاگ کر پناہ لینے آ گئی ہوں۔ مصطفےٰ بیڈروم میں تھا۔ کالے رنگ کا سوٹ ڈاٹے وہ بڑا بانکا لگ رہا تھا۔ مجھ پر نظر ڈالتے ہی اس کا منہ اتر گیا۔

اسے مایوسی اس میں نظر آئی کہ مجھ سے دُور دُور رہے۔ اسے خاصی کراہت محسوس ہوئی۔ دیر اتنی ہو چکی تھی کہ گھر جا کر لباس تبدیل کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ڈنر پر پہنچا۔ ہر کوئی مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ چولیوں بلاؤزوں، چمکتی نافوں اور نیچے تک کٹے گریبانوں سے جھانکتی وادیوں اور شفن کی سرسراہٹوں والی حسین و جمیل عورتیں اس اول جلول لباس پر نظر ڈال کر میری طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ ان کے اور میرے درمیان موجود تضاد ٹھٹھرا دینے والا تھا۔ میرے چہرے کی طرف کسی نے نظر نہ کی۔ انھوں نے رائے دی تو یہی کہ مجھ میں سلیقے کی کمی ہے۔ میں نے ایک فضول چیلنج قبول کر لیا تھا اور وہی چیلنج الٹا میرے گلے پڑ گیا تھا۔ مصطفےٰ تو نباہ کر رہا تھا۔ میں اپنی بچگانہ حرکت پر زیادہ شرمسار تھی۔

میرے دلبر کے نباہ کا انداز یہ تھا کہ وہ نہایت احتیاط سے مجھ سے دُور دُور رہا۔ اس نے مجھ سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ وہ گھومتا پھرتا رہا۔ اس کے اردگرد عورتیں جمع رہیں۔ اس نے ان تمام دلکش عورتوں سے لگاوٹ کی باتیں کیں جن کی ہوشربا دلربائی اپنے اوج پر تھی۔ وہ مجھے سبق سکھا رہا تھا۔

میں وہاں ایک طرف ایسے کھڑی رہی جیسے دیوار پر لگانے والا کاغذ ہوں اور وہ بھی ایسا جو اکھڑ کر گرنے کے قریب ہو۔ چند ایک مرد میرے پاس آئے۔ انھوں نے مجھے رسمی گفتگو میں مصروف کرنا چاہا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ وہ اس رات کے لیے اپنے مجلسی آداب کا کوٹا پورا کر چکے تھے۔

گھبراہٹ کے عالم میں میں نے اپنے لباس پر کوک گرا لیا۔ ہمایوں بیگ محمد میری مدد کو پہنچے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کوکا کولا کو بوتلوں میں بھرنے کا ٹھیکا انھیں کے پاس تھا۔ وہ مجھے جتوئی صاحب کے غسل خانے تک چھوڑ آئے جہاں میں نے دھبے کو دھویا۔ پھر میں ایک ایئرکنڈیشنر سے چمٹ کر دعا مانگتی رہی کہ میرا لباس صرف سوکھے ہی نہیں بلکہ ہوا میں تحلیل بھی ہو جائے۔ اگر کسی سنڈریلا کو منہ بولی پری ماں کی ضرورت تھی تو اسی لمحے تھی۔ پری ماں کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ میں ٹہلتی ٹہلتی واپس لوٹی۔ ابھی تک تربتر اور بہت خفت زدہ۔

میں گلاس کو سینے سے لگائے کھڑی رہی۔ مجھے سخت بے چینی یہ تھی کہ کسی طرح گلاس کی مدد سے سٹکر پر بنی ہوئی گائے کو چھپائے رکھوں۔ لیکن میں چاہے کسی بھی زاویے سے گلاس کو جھکاتی گائے کی دم مجھ سے بازی لے جاتی اور میری ناکام کوشش پر سکھیاں اڑانے کے انداز میں ہلتی رہتی۔ مصطفےٰ نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ مجھے گھر چھوڑ آئے۔

اس رات میں نے رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔ میری بڑی بری حالت تھی۔ سارا قصور میرے لباس کا تھا۔ میری سہیلی ٹھیک کہتی تھی۔ مصطفےٰ مجھ سے صرف اس لیے محبت کرتا تھا کہ میں اچھے ذوق کی مالک تھی۔

اس نے اگلی صبح فون کیا۔ مجھے بتایا کہ لباس پہننے کا سلیقہ معنی رکھتا ہے۔ جو کچھ میں نے کیا تھا وہ سراسر میرے مزاج کے الٹ تھا۔ "تم یہ حرکتیں کیوں کرتی رہتی ہو؟ مجھے بھی خفت اٹھانی پڑتی ہے اور تم بھی شرمسار ہوتی ہو۔ تم اپنے طور پر مجھے پیاری لگتی ہو۔ تم بہت باوقار عورت ہو۔ وقار سے گری ہوئی کوئی حرکت کرنے کی کوشش میں تم خود کو مضحکہ خیز بنا لیتی ہو۔ تم اس طرح کے فضول چیلنج قبول کرتی مت پھرو۔ مجھے تم سے محبت ہے، تم جیسی بھی ہو۔ تمھیں خود کو بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تم کوئی بالکل مختلف فرد بن گئیں تو شاید میں بھی اپنا ذہن بدل لوں۔ سمجھیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

میں نے بسورتے ہوئے کہا "ہاں"۔ "دیکھو، اگر میں کسی مسخرے یا بھانڈ کا لباس پہن کر تمھیں لینے آؤں تو کیا میرا حلیہ تمہارے لیے قابل قبول ہوگا؟ کبھی نہیں۔ مجھے دیکھ کر تم ہنس پڑو گی۔ اس لیے بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ جیسی ہو ویسی رہو۔"

میرے بیہودہ لباس سے قطع نظر، جتوئی صاحب کے ہاں یہ ڈنر پارٹی ایک اور وجہ سے بھی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ میری موجودگی کا نوٹس لیا گیا۔ کراچی والوں سے بھنبھنانے لگا۔ یہ تہمینہ مصطفےٰ کھر کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ ابھی بائیس برس کی تو ہے۔ میاں سنگاپور گیا ہوا ہے۔ یہ دونوں کھلم کھلا جشن لڑا رہے ہیں۔

انیس لوٹا تو یہ سب کچھ اس کے سننے میں آیا۔ اس نے مجھ سے دوبدو بات کی۔ اس کے ساتھ مزید جھوٹ بولتے رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اپنے آپ کو ابتلا سے چھٹکارا دلانے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ انیس کو ابتلا میں ڈال دیا جائے۔ میں نے اسے ہر بات بتا دی۔ میں نے کہا کہ مجھے طلاق دی جائے۔ میں اس سے بے وفائی کرتی رہی ہوں۔ میں نے انیس کو بتایا کہ ہماری شادی کو ختم سمجھو۔ اس بات کی اب کوئی اہمیت نہ تھی کہ مصطفےٰ سے شادی کروں گی یا نہیں کروں گی۔ میں طلاق لینا چاہتی تھی۔ میں ایسے مرد کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی جسے میں نے دھوکا دیا تھا۔

انیس کا ردعمل انیس جیسا تھا۔ بحران کے اس لمحے میں بھی نہایت مہذب۔ اس نے بڑی سمجھ بوجھ اور رواداری کا ثبوت دیا۔ کہنے لگا کہ وہ مجھے طلاق دے دے گا۔ وہ مجھ سے صرف یہ چاہتا تھا کہ ہماری بیٹی تانیا کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ "مجھے تانیا کی ضرورت ہے۔ اس کے سوا میرا ہے کون۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ عورت یاد آتی رہے گی جس سے مجھے محبت ہے۔ تم عدالتوں سے رجوع کر کے تانیا کو واپس لے سکتی

ہو۔ لیکن مہربانی کر کے اس وقت تک اسے میرے پاس رہنے دو جب تک میں اس صدمے سے سنبھل نہ جاؤں۔ تم دونوں میرے پاس نہ ہو گی تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ تم سے میرا بس اتنا ہی تقاضا ہے۔"

اس شخص کی باتوں نے میرے دل پر اثر کیا۔ انیس اچھا آدمی تھا۔ بہت مہربان آدمی تھا۔ محبت کرنے والا باپ تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ اپنی بیٹی اس سے چھین لوں۔ میں نے اس کی درخواست مان لی۔ اس نے مجھے طلاق دے دی۔ میں بائیس برس کی عمر میں مطلقہ ہو گئی۔

کراچی میں میری بہن کا گھر میری اولین پناہ گاہ بنا۔ میرے اہل خاندان کو میری نافرمانی سے سخت صدمہ پہنچا۔ امی پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ والد صاحب کے طیش کی انتہا نہ رہی۔ اس واقعے سے جانے پہچانے سماجی حلقوں میں جو ہلچل مچی اس کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ امی لندن سے فوراً کراچی پہنچیں۔ انھیں یقین تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے پر تلی بیٹھی تھیں کہ مصطفےٰ پر میرا دیوانہ وار فریفتہ ہونا کسی طرح کے ذہنی اختلال کا نتیجہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر ہارون احمد کے پاس لے جایا گیا جو کراچی میں نفسیاتی علاج کے ایک سربرآوردہ ماہر تھے۔ ان سے کہا گیا کہ پتہ چلائیں کہ میں ایک شخص کے عشق میں کیوں مبتلا ہوئی اور جو وجوہ سامنے آئیں ان کا تجزیہ کریں۔

ڈاکٹر ہارون مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ خوش قسمتی سے مجھے کاؤچ پر لیٹنے کے لیے نہیں کہا گیا۔ کہنے لگے کہ انھیں سب کچھ بتایا جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے مجھ سے چند سوال کیے۔ سیشن کے اختتام تک ہم نے سارے تعلق کا تجزیہ کر کے بندی کی چندی کر ڈالی۔ وہ بعض باتیں لکھتے رہے۔ انھوں نے امی کو بتایا کہ میں نارمل ہوں۔ امی مایوس نظر آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ میری بے راہ روی بچپن میں MENINEITIS میں مبتلا ہونے کے اثرات مابعد کا شاخسانہ ہے۔ یہ خیال بالکل غلط تھا۔

ڈاکٹر ہارون نے میرے بگڑنے کا الزام مصطفےٰ پر دھرا۔ انھوں نے فیصلہ سنایا۔ "مصطفےٰ کھر عورتوں کو پھنسانے میں پیشہ ورانہ مہارت رکھتا ہے۔ آپ کی بیٹی اس کے جال میں آ گئی۔"

امی کو نفسیاتی معالجوں پر بڑا اعتقاد تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھ پر مصطفےٰ جیسے "بازاری زندگی" گزارنے والے کا جادو کیسے چل گیا۔ وہ تو "اخلاق باختہ عورتوں" کا، بگڑی ہوئی عورتوں کا شکار کھیلتا تھا۔ اگر اسے مجھ پر ناشائستہ ہونے کا گمان نہ گزرتا تو وہ کبھی مجھے پھانسنے کی کوشش نہ کرتا۔ امی کا کہنا تھا کہ میں نے کسی طرح مصطفےٰ کو یہ باور

کرا دیا تھا کہ میں دستیاب ہوں۔ جس بدنصیبی نے میری شہرت کو داغ دار کیا تھا اس کے لیے قصوروار میں خود تھی۔ یہ سب کچھ اس لیے پیش آیا کہ میں نے کسی خاص اور معنی خیز انداز سے مصطفےٰ کی طرف دیکھا ہوگا۔ "تمہارا انگ انگ کہہ رہا تھا کہ آؤ میں تمہاری دسترس میں ہوں۔ میری کوئی دوسری بیٹی اسے اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیتی۔" ان کا یہ خیال کتنا غلط نکلا۔

نفسیاتی معالج نے مجھے بے قصور قرار دیا تھا۔ میری برت سے امی کی اتنی تسلی تو ہوئی کہ چلو آبرو بحال ہو گئی۔ میں کوئی گئی گزری فاحشہ نہ نکلی۔ مجھے پھسلا کر خراب کیا گیا تھا۔ اب میری باگ ڈور امی نے سنبھال لی۔ وہ میرے جذبات کو قابو میں رکھ کر اس امر کو یقینی بنائیں گی کہ میں راہِ راست سے بارِدگر نہ بھٹکوں۔ جو نقصان ہونا تھا ہو گیا، مزید نہ ہو۔

مجھے لاہور نانی کے پاس بھیج دیا گیا۔ میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ میں اپنی مرضی سے کہیں آجا نہ سکتی تھی۔ مجھے کسی کو فون کرنے یا کسی کا فون سننے کی اجازت نہ تھی۔ اپنی سہیلیوں سے ملنے پر بھی پابندی عائد تھی۔ چنانچہ کسی کو چوری چھپے پیغام بھجوانا بھی خارج از امکان ٹھہرا۔ مجھے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ ایسے حالات میں ذہن کچھ زیادہ ہی فعال ہو کر نت نئی ترکیبیں گھڑنے لگتا ہے۔ مصطفےٰ اور میں کبھی کبھار اس زنے کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتے۔

میری اگلی منزلِ مقصود پشاور تھا۔ صوبۂ پنجاب سے باہر۔ وہاں میں نے اپنے تایا کے پاس قیام کیا۔ پشاور میں بھی حفاظتی انتظامات غیر تسلی بخش پائے گئے۔ چنانچہ مجھے اپنے آبائی گاؤں چارسدہ بھجوا دیا گیا۔ یہاں میں تج مچ قیدی بن کر رہی۔ باہر کی دنیا کا دروازہ، اپنی تمام ترغیبات کے ساتھ مجھ پر مکمل طور سے بند کر دیا گیا۔ میں دن بھر بیٹھی انتظار کرتی رہتی۔ میرے والدین انگلینڈ میں تھے۔

غور کرتی ہوں تو ان سب پابندیوں کو چپ چاپ مان لینے کی صرف یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ میں والدین کے اختیار سے خائف تھی۔ انیس کی بیوی ہوتے ہوئے میں راہِ راست سے بھٹک کر عشق لڑاتی رہی تھی۔ شادی کے وقت اپنے میاں کی وفادار رہنے کے جو قسمیہ وعدے میں نے کیے تھے میرا شوہر، اپنے رعب اور اختیار کے باوجود مجھ سے ان کی پابندی نہ کرا سکا تھا لیکن اپنے والدین کے دوبارہ نمودار ہوتے ہی میں پھر سے ایک چھوٹی لڑکی میں تبدیل ہو گئی۔

انیس مجھ سے ملنے پشاور آیا۔ میں نے خود کو مجرم محسوس کیا۔ میں نے اسے اور خاص طور پر اس کے گھر والوں کو تکلیف پہنچائی تھی جو میرے ساتھ بہت شفقت اور

بت سے پیش آتے رہے تھے۔ گھر والے انیس کی بے حسی پر پریشان تھے۔ اسے الزام دیا جا رہا تھا کہ اس نے مجھے ایک "برے آدمی" کے سامنے کھلا کیوں چھوڑ دیا۔ "وہ تمہارے گھر سکول کی یونیفارم میں آئی تھی۔ وہ بالی بھالی تھی۔ تم نے اسے ایک ایسی صورتحال میں جھونک دیا جو نہ تم سے سنبھالی گئی نہ اس سے۔" یہ الفاظ اس کی والدہ کے تھے۔

میں تو بری الذمہ ٹھہری۔ سارا ملبہ انیس پر ڈال دیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ انصاف نہیں۔ ہر بار جب مصطفےٰ یہ کہتا تھا کہ انیس اتنا مرد آدمی نہیں کہ اپنی بیوی کو قابو میں رکھ سکے تو میں اس طرح دبک جاتی جیسے مار کھانے سے خود کو بچا رہی ہوں۔ اس بات سے "بطور بیوی" میری کچھ اچھی تصویر سامنے نہ آتی تھی۔

انیس پشاور مجھ سے ملنے آیا تو ملاقات کے دوران مجھے اس کی شخصیت کا دوسرا رخ دیکھنے کو ملا۔ میں کوئی چیز ساتھ لیے بغیر گھر سے نکل آئی تھی۔ میرا سارا جہیز، زیورات، جواہرات، کراکری اور کٹلری گھر رہ گئی تھی۔ میں نے مادی اشیاء کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مجھے اداسی تھی تو یہ کہ وہاں سے اٹھا کر ساتھ لانے کے لیے اتنی کم یادیں میرے پاس تھیں۔ انیس کو مادی چیزوں کا زیادہ خیال تھا۔ "تمہارے گھر والے مجھ سے تمہارے سارے سازوسامان کا تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ بہت گری ہوئی بات لگتی ہے۔ اگر میں سب کچھ لوٹا دوں تو میرے گھر میں جھاڑو پھر جائے گی۔ میری رائے میں یہ غیر منصفانہ بات ہے۔" میں اس کا کرب محسوس کر سکتی تھی۔ میں نے اسے تقریباً ہر چیز سے محروم کر دیا تھا۔ میرے لیے کم از کم اتنا تو ممکن تھا کہ اپنی چیزیں اس کے نام کر دوں۔ میں بیٹھ گئی اور اس نے میرے تمام مال ومتاع کی فہرست قلم بند کر ڈالی۔ کہنے لگا کہ میں یہ لکھ کر دستخط کر دوں کہ میں نے اپنی تمام چیزیں اس کے ہاتھ فروخت کر دی ہیں۔ اس نے ہر چیز کے سامنے قیمت درج کر دی تھی۔ میں نے دستخط کر دیے۔ اس نے کبھی ایک دھیلا بھی ادا نہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح اس کے نقصان کی تلافی ہو گئی ہے۔ مجھے یوں لگا کہ میری خطا کا کچھ حصہ دھل کر صاف ہو گیا۔ کتنی ذرا سی بات سے آدمی خوش ہو جاتا ہے۔ کتنی ذرا سی بات سے آدمی کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔

میری نظر میں انیس کی توقیر کم ہو گئی۔ اس کے احترام میں مزید کمی اس وقت آئی جب وہ چاندی کی کٹلری کی قیمت پر بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔ اس پر بحث شروع کر دی کہ کٹلری کی اصل قیمت کیا ہے۔ میں نے اس کی من مانی قیمت پر صاد کر دیا۔ میں حیران تھی کہ جب اس نے ادائیگی مجھے بہرحال نہیں کرنی تو قیمت کی کمی بیشی سے کیا

فرق پڑتا ہے۔ میں تھوڑی سی اداس ہو گئی۔ وہ کاغذ کے ایک پرزے سے لیس ہو کر رخصت ہوا جیسے وہ دخل در معقولات کے شوقین دنیا کی ناک کے آگے نچا سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ تانیا کو میرے پاس بھیج دے گا۔

کراچی میں، میں نے ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرایے پر لیا۔ آزمائش کی اس گھڑی میں فاروق حسن اور ان کی بیگم نے مجھے سہارا دیا۔ ان کی مہربانی کے بارے میں جو کہوں تھوڑا ہے۔ میں فاروق حسن کے پاس، ان کی کنسٹرکشن کمپنی میں، ملازم ہو گئی۔ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت خباثت آمیز بے پر کیوں کا خاص الخاص نشانہ بنتی ہے۔ میں کام کرتی رہی اور گوشہ نشین ہو گئی۔

تانیا میرے پاس تھی۔ اس نے سکول جانا شروع کر دیا تھا۔ کراچی میں رہتے ہوئے پانچ مہینے ہو گئے تھے کہ میرے سننے میں آیا کہ شیری حاملہ ہو چکی ہے! میں نے بڑی سبکی محسوس کی۔ مصطفےٰ سے بات کی تو وہ اپنی بے گناہی کے حق میں دلیلیں پیش کرنے لگا۔ اس کا کیس بہت کمزور تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے رابطہ مکمل طور پر منقطع کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ قصہ ختم ہوا۔

میرے سننے میں یہ بھی آیا کہ مصطفےٰ نے کسی گانے والی سے تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ مصطفےٰ نے اس بات سے بھی انکار کیا۔ میرا جی خاصا برا ہوا۔ ہم نے مزید پانچ ماہ کے لیے تعلقات توڑ لیے۔ رابطے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

مجھے [illegible] کو پاک صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی طلبگار تھی۔ میں نے عمرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں مکہ معظمہ چلی گئی۔

وہاں خانہ کعبہ کے روبرو کھڑے ہو کر میں نے دعا مانگی۔ آنسو بہائے۔ الٰہی، میں نہیں چاہتی کہ "مطلقہ" کہلاؤں۔ میں راہ راست سے بھٹک گئی تھی۔ میں تیری مغفرت کی جویا ہوں۔ مجھے اتنا حوصلہ بخش کہ اپنی آبرو بحال کر سکوں۔ اس آدمی کے ساتھ میرا تعلق "گھٹیا" قسم کا تھا۔ مہربانی فرما کر مجھے سیدھی راہ دکھا۔ ان چار ہاتھ کی زبانوں کو لگام دے جو میرے خلاف زہر اگلتی رہتی ہیں۔ ان انگلیوں کو روک جو میری طرف اٹھتی رہتی ہیں۔

وہاں خدا کے حضور میں کھڑے کھڑے مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ میری بری طرح پامال شدہ نیک نامی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ میں اس آدمی سے شادی کر لوں۔ میرے لیے ایک یہی شریفانہ طریقہ بچا تھا۔ مصطفےٰ کھر نے میرے منہ پر کالک مل دی تھی۔ مجھ پر اس کی چھاپ لگ چکی تھی۔ میں ان بہت سی عورتوں میں سے ایک تھی جن

سے وہ متمتع ہو چکا تھا۔ اس داغ کو صرف شادی کے ذریعے ہی دھویا جا سکتا تھا۔ معاشرہ مجھے صرف اس کی بیوی کے روپ میں قبول کرے گا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ میرے لیے کوئی معجزہ کر دکھائے۔ میں اس شخص سے شادی کرنے کے لیے تڑپ رہی تھی جس نے میرے نام کو بٹا لگایا تھا۔

جیسے ہی میں کراچی پہنچی معجزہ ظہور میں آ گیا۔ مصطفےٰ کا فون آیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ کراچی آنے والا تھا۔ اسے کوئی اہم بات کرنی تھی۔

مصطفےٰ اب گورنر نہ تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے امیدوار کے خلاف ضمنی انتخاب لڑ چکا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کا دشمن نمبر ایک تھا۔ اس کا ہر وقت پیچھا کیا جاتا تھا۔ انٹیلی جنس کی ایجنسیاں اس پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھیں۔ وہ گرفتاری اور قید و بند سے بچتا پھر رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر سیاست میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے وزیراعظم سے ٹکر لی تھی۔ اس کے پاس دل لگانے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

وہ اپنی کار کی ڈگی میں چھپ کر میرے گھر پہنچا۔ یہ عیاری سی آئی ڈی والوں کو چکما دینے کے لیے ضروری تھی۔ کہنے لگا کہ مجھ سے شادی کرو۔ فوراً۔ میں ہچکچائی۔ اس نے کہا کہ وہ جواب میں انکار نہیں سننا چاہتا۔ "میں لاہور واپس جا رہا ہوں۔ تم وہاں پہنچو۔ میں انتظار کر رہا ہوں گا۔ ہم فوراً شادی کر لیں گے۔"

میرے پاس کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے دو دن تھے۔ میں ان دو دنوں میں مصطفےٰ کی اچھائیوں برائیوں کو جمع تفریق کر کے فردِ حساب مرتب کرتی رہی۔ بالآخر میں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ میں چاہتی تھی کہ جس طوفان نے میری زندگی کو گھیرے میں لے رکھا تھا وہ فرو ہو جائے۔ شادی ہی واحد راستہ تھا۔ اس وقت مجھے کیا خبر تھی کہ طوفان میری زندگی کے اگلے پندرہ برس تک اسی شدت سے برپا رہے گا۔

میں بذریعہ طیارہ لاہور پہنچی۔ تانیا کو انیس کے پاس چھوڑ آئی۔ میں نے وعدہ کیا کہ تین دن میں لوٹ آؤں گی۔ یہ ایسا وعدہ تھا جو میں وفا نہ کر سکتی تھی۔

ہم مصطفےٰ کے گاؤں، کوٹ ادو، چلے گئے اور وہاں مکمل رازداری میں، 25 جولائی 1976ء کو ایک قابلِ اعتماد قاضی نے ہمارا نکاح پڑھا دیا۔

مصطفےٰ نہایت خوشگوار موڈ میں تھا جیسے اسے میری دلی جوئی منظور ہو۔ میں اب اس کی ملکیت تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور نہایت خلوص سے ہمارے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ "تہمینہ، تمہیں مجھ سے ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ تم پر لازم ہے کہ ہر معاملے کے بارے میں میرے ساتھ تبادلۂ خیال کرو۔ جب تمہارا دل چاہے۔ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا اور تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آؤں گا۔"

میں بہت خوفزدہ تھی۔ میں نے نامعلوم کی طرف ایک بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔ میں اپنی بیٹی کی وجہ سے سہمی ہوئی تھی۔ مصطفےٰ نے کہا کہ تانیا آ کے ہمارے ساتھ رہ سکتی ہے۔ میرے دل سے بوجھ اتر گیا۔ مصطفےٰ کا رویہ ہمدردانہ تھا اور وہ یہ ثابت کر رہا تھا کہ اسے میری ضرورتوں کا شدت سے احساس ہے۔ ہم بذریعہ کار لاہور چلے آئے۔

میں کراچی میں اپنے نکاح نامے کو ڈھال کی طرح اٹھائے پھری۔ میں نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔ سامان پیک کیا۔ تانیا کو لیا۔ مجھے ایک فیصلہ اور کرنا تھا۔ میں ابھی تک اس بارے میں غیر یقینی کا شکار تھی کہ لاہور میں رہنے سہنے کا کیا بندوبست ہو گا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ آیا ہماری شادی راز رہے گی یا نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شادی کا اعلان ہونے تک تانیا کو انیس کے پاس چھوڑے جاتی ہوں۔ مصطفےٰ نے فون کیا۔ ہمارا الگ الگ رہنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ مجھے اپنے منصوبوں میں قطع برید کر کے واپس لاہور جانا پڑا۔ جو اس کا حکم وہی میری اِچھا۔

انیس کو شادی کا سب سے پہلے پتہ چلا۔ وہ پریشان تو ہوا مگر راضی ہو گیا کہ جب میں گھر بسالوں گی تو اس وقت تانیا کو ساتھ لے جاؤں گی۔ تانیا دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ جب میں طیارے میں لاہور جا رہی تھی تو اس کی سسکیوں کی گونج ابھی میرے ذہن میں باقی تھی۔

ہوائی اڈے پر میاں ساجد پرویز مجھے لینے آئے۔ میں ان کے گھر میں چھپی رہی۔ اگلے دن مصطفےٰ اور میں کار سے ملتان روانہ ہوئے۔ چند ماہ کے لیے میرا پڑاؤ ملتان میں رہا۔ میں بالکل گوشہ نشین رہی۔ نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ گھر کا حلیہ درست کرنے کی کوشش میں وقت گزارتی رہی۔ میں نے کراچی سے اپنا فرنیچر ٹرک کے ذریعے منگا لیا۔ میں کچھ مدت کے لیے ہماری شادی کو خفیہ رکھنے پر آمادہ ہو گئی۔ بھٹو صاحب کے یار دوستوں کو اگر مصطفےٰ کی اس تازہ ترین لگاوٹ کی خبر ہو گئی تو کتنے خوش ہوں گے۔ اس طرح کی خبر ہاتھ آ جائے تو اور کیا چاہیے۔ گھٹیا قسم کی صحافت کو کھلی چھٹی مل جائے گی کہ جو چاہے چھاپے۔ شیری ابھی اس کی بیوی تھی۔ وہ سکینڈل کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔

مصطفےٰ موجی بندہ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے میری زندگی میں معمول کا پیدا ہونا یا ٹھہراؤ آنا کب ممکن تھا۔ وہ یہ کہہ کر لاہور کے لیے روانہ ہوتا کہ ہفتے بھر باہر رہے گا اور اسی رات لوٹ آتا۔ مسلسل سفر کرنے سے اس کی صحت پر اثر پڑ رہا تھا۔ وہ ہماری شادی کو بے نقاب کرنے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ مجھ سے دُور رہنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ میری باتیں سنتا رہتا۔ لاہور روانہ ہوتا اور پھر اسی رات ملتان لوٹ آتا۔ کہتا تھا کہ چھ گھنٹے کا یہ سفر سراسر فائدے کا سودا ہے کہ

پھر تمہارے پاس آ جانے کا موقع ملتا ہے۔

ہم ماہ عسل کی بہار لوٹ رہے تھے کہ رمضان آ گیا۔ دونوں روزے سے تھے۔ مصطفےٰ پلاؤ تیار کر رہا تھا۔ مجھے کھانا پکانے کی تربیت بھی دی جا رہی تھی۔ وہ اپنی طباخی میں پوری طرح منہمک تھا اور تڑاق پڑاق ہدایات جاری کر رہا تھا۔ "لونگیں لا کے دو اور دارچینی بھی۔" میرے چھکے چھوٹ گئے۔ مجال ہے جو کچھ پلے پڑا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا چاہیے۔ وہ میری جہالت پر واضح طور پر جھنجھلایا۔ مجھے اس کی جھنجھلاہٹ سے دوچار ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اسے توقع تھی کہ مجھے ان باتوں کا پتہ ہو گا۔

ہم لاہور چلے آئے۔ یہ فیصلہ مصطفےٰ کا تھا اور جب فیصلہ اس کا ہو تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش کہاں رہتی تھی۔ کنال کے کنارے پر اس کا لمبا چوڑا گھر تھا۔ گھر کے احاطے میں ایک پری فیبری کیٹڈ کیبن تھا۔ اس کیبن میں مجھے رہنا تھا۔ یہ جگہ میری جانی پہچانی تھی۔ یہیں پر مصطفےٰ اور میں اپنے ناجائز میل ملاپ کو جاری رکھنے کے لیے ملا کرتے تھے۔ اب ہم یہاں میاں بیوی کے طور پر ملیں گے۔ ہمارا میل ملاپ اب بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

اس کیبن سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے یہاں بطور سامع کتنے ہی بحثوں میں شرکت کی تھی۔ مصطفےٰ اس سے خلوت گاہ کا کام لیتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی بے آرامی محسوس کی۔ میں معاشرے میں اس کی منکوحہ کے طور سے پہچانی جانے کے لیے ترس رہی تھی۔

میرا شوہر دن کے وقت میرے پاس رہتا۔ اس کی دوسری بیوی بالکل مگن بیٹھی تھی۔ اسے قطعاً علم نہ تھا کہ گھر میں کوئی مہمان بلکہ سوتن موجود ہے۔

ایک رات مصطفےٰ کے جانے کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ مصطفےٰ نے آ کر مجھے جگایا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شیری اس کے ساتھ تھی۔ مصطفےٰ نے مجھ سے شادی کی خبر اپنی حاملہ بیوی کو سنا دی تھی۔ شیری کو اس کے کہے پر اعتبار نہ آیا تو وہ اپنے اعتراف کو ثابت کرنے کے لیے اسے ساتھ لے آیا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا وقت پھر آ گیا۔ میں بڑے گھر میں منتقل ہو گئی۔ مصطفےٰ اور اس کی دو بیویاں۔

یہ خندہ آور صورتحال تھی۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں دوسری بیوی ہوں اور یہ کہ میں نے اپنی اس حیثیت کو قبول کر لیا ہے۔ مجھے اس بارے میں بڑی فکر رہتی کہ وہ میرے ساتھ کتنا وقت گزارتا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ شیری کو نظرانداز کرے۔ یہاں کسی کا منظور نظر بن کر رہنے کی گنجائش نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام وقت مجھ پر جرم کا احساس، بے آرامی کا احساس غالب رہتا۔ جب وہ شیری کی موجودگی میں میرا ہاتھ

تھام لیتا یا کسی اور طرح سے لگاوٹ کا اظہار کرتا تو میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتی کہ شیری یہ سب دیکھ رہی ہے۔ میں شیری کو دکھ پہنچانا نہ چاہتی تھی۔ میں اس کی تکلیف کو محسوس کر سکتی تھی۔ میں کبھی بھلا نہ سکتی کہ وہ حاملہ ہے اور اس وجہ سے مجھے لگتا کہ میری بے عزتی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

رات کے وقت مجھے مصطفےٰ کو کمرے سے دھکیل کر باہر نکالنا پڑتا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ شیری کے پاس چلا جائے۔ وہ مجھ پر ہنستا۔ مجرم ضمیر کے ہوتے ہوئے اپنے شوہر کے ساتھ سونا میرے لیے ناممکن تھا۔ مصطفےٰ مکمل بے یقینی کے عالم میں سر جھٹکتا ہوا میرے بستر سے اٹھ کر چلا جاتا۔ کسی اور عورت کی تخ کامی کا بوجھ اٹھائے پھرنے پر میں اکیلی رہنے کو ترجیح دیتی۔

شیری مجھ سے کھل کر باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے مصطفےٰ کے بارے میں کہانیاں سناتی۔ وہ ڈراؤنی کہانیاں معلوم ہوتیں۔ ان میں مصطفےٰ سادیت پسند کے روپ میں سامنے آتا۔ ایک کج مج شخص جو انہیں کی تذلیل کر کے لذت حاصل کرتا جن سے محبت کرنے کا اسے دعویٰ تھا۔ شیری کہنے لگی کہ وہ کمتری کے کمپلیکس کا مارا ہوا ہے۔ ہمارے سماجی پس منظر سے تعلق رکھنے والی عورتیں اسے زہر لگتی ہیں۔ وہ ان سے چڑتا ہے اور اس کا مشن یہی ہے کہ ایسی عورتوں کو محکوم بنا کر رکھا جائے۔ جاگیردارانہ انداز اپنا کر اپنے طبقاتی حسد کو چھپائے رکھتا ہے۔ بھونڈا آدمی ہے۔ ہمارے طبقے سے اس لیے ناراض ہے کہ ہم اسے اپنے برابر جگہ دینے کے روادار نہیں۔ ہم نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ جن سیاسی آدرشوں کا وہ قائل ہے وہ اس کے جذبۂ انتقام کے آئینہ دار ہیں۔ غریبوں اور پامال طبقوں کے لیے اس کی فکرمندی محض دکھاوا ہے۔ اس فکرمندی پر فوقیت اس نفرت کو حاصل ہے جو اسے سوسائٹی کے چیدہ طبقے سے ہے۔ وہ اس سماجی ڈھانچے کو تہس نہس کر ڈالنا چاہتا ہے جو اس کے حسب نسب کا تحقیر سے ذکر کرتا ہے اور یہ دیکھ کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں تربیت اور شائستگی کی کمی ہے۔ وہ سب سے واضح طور پر عورتوں کو نشانہ بناتا ہے۔ وہ ہمیں اور ہمارے اعتماد کو خاک میں ملانے پر تلا ہوا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ سنا اور ذہن میں محفوظ کر لیا۔ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات مجھے یہ سمجھنے کے قابل بنا دیں گے کہ کون سی بات سچ تھی اور کون سی محض ایک ٹھکرائی ہوئی عورت کی ہرزہ سرائی۔

مصطفےٰ شکار کھیلنے چلا گیا۔ میں تو بالکل ویران ہو کر رہ گئی۔ شیری بڑی خوش تھی کہ وہ گھر سے دفع تو ہوا۔ جوں جوں اس کی واپسی کا وقت قریب آتا گیا میں شگفتہ ہوتی گئی کہ دوبارہ ملاقات ہونے والی ہے۔ شیری واضح طور پر ناخوش دکھائی دی۔ دو بیویاں

اپنے شوہر کے حوالے سے ایسے جذباتی ردعمل ظاہر کر رہی تھیں جنہیں ایک ہی طیف کی دو انتہاؤں کو چھو کر بھی چین نہ تھا۔

میرے مشاہدے میں آیا کہ وہ شیری سے اس طرح پیش آتا جیسے اس کا صبر جواب دینے کو ہے۔ وہ اس سے انتہائی اہانت آمیز سلوک کرتا اور نہایت گندی گندی گالیاں دیتا۔ ایسے بیہودہ الفاظ میں نے کبھی نہ سنے تھے۔ میرے کان جلنے لگتے۔ میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کا رویہ غیر معقول ہے۔ شیری کے پیٹ میں مصطفےٰ کا بچہ تھا۔ اسے سہارا دینے والا کوئی نہ تھا۔ مصطفےٰ شیری کو یہ یاد دلاتا رہتا کہ اسے بچانے کے لیے کوئی آگے نہ آئے گا۔

ایک صبح مصطفےٰ نے شیری سے اپنی ملٹی وٹامن گولیاں مانگیں۔ گولیوں کی یہ خاص برانڈ اس نے لندن سے منگائی تھی۔ شیری نے جو شیشی لا کر دی وہ آدھی خالی تھی۔ مصطفےٰ آگ بگولا ہو گیا۔ "باقی کہاں گئیں؟" "میں... میں نے... کھا لیں۔ مجھے ضرورت تھی... حاملہ ہونے کی وجہ سے..." مصطفےٰ نے بدلا نے کر چھوڑا۔ پہلے شیری کو ٹھوکر ماری اور پھر جوتے اتار کر اس کی ٹھکائی کی۔ اس کے بعد دھکے دے کر کمرے سے نکال دیا۔ میں دم بخود رہ گئی۔ صدمے کے مارے لرزتی رہی۔ مجھے اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ اپنے تنفر کا اظہار ہی کر سکوں۔

مجھے عجیب لگتا تھا کہ شیری نے میری موجودگی کو کسی چون و چرا کے بغیر قبول کر لیا ہے۔ میرے ساتھ اس کے رویے میں کوئی تکدر نہ پایا جاتا تھا۔ میں اکثر حیران ہوتی کہ میری وجہ سے اس کی زندگی میں جو خلل پڑا ہے وہ اس سے کیسے نمٹ سکے گی۔ مجھے بعد میں شیری کی زبانی پتہ چلا کہ میری موجودگی اس پر گراں کیوں نہیں گزرتی تھی۔ اسے پتہ یقین تھا کہ میرا قیام چند روزہ ہے۔ مصطفےٰ نے اسے بتایا تھا کہ میں صرف چند مہینے کے لیے آئی ہوں۔ اس نے مجھ سے شادی اس لیے کی تھی کہ مجھے اس واہیات طعنہ زنی سے تحفظ دے سکے جس کا میں ہر طرف سے نشانہ بن رہی تھی۔ میں جس قصے میں گرفتار تھی اس کا ذمے دار وہ خود کو سمجھتا تھا اور مجھ سے شادی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر گندگی اچھالنے کا سلسلہ ختم ہو۔ مصطفےٰ نے شیری کو بتایا تھا کہ میں چند مہینے بعد ملک سے باہر چلی جاؤں گی اور یہ کہ ہم میں چپ چاپ طلاق ہو جائے گی۔ شیری نے مصطفےٰ کے کہے پر یقین کر لیا کیونکہ وہ یہی کچھ سننا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگی کہ اپنے غیر ملکی لباس یہیں میرے پاس چھوڑ جانا کیونکہ یہ پاکستان میں دستیاب نہیں۔ میں مصطفےٰ کے ان نرالے ہتھکنڈوں پر عش عش ہی کر سکتی ہوں۔

ہمیں یعنی ہم تینوں کو جب کبھی ڈنر پر جانا ہوتا تو مجھے جھجک آتی۔ ہم تینوں کے

کسی گھر میں ایک ساتھ قدم رکھنے کا میں تصور نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات مجھے نادرست معلوم ہوتی۔ شیری کو کچھ پروا نہ تھی۔ وہ مصر تھی کہ ہمیں ایک خوش و خرم گھرانہ نظر آنا چاہیے۔ مصطفےٰ کے لیے تو ان باتوں میں جیسے کچھ رکھا ہی نہ تھا۔ مجھے لگتا جیسے یہ طور طریق جدید زمانے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے اور ماضی کی یادگار ہیں۔ ہم باہر جاتے اور اسی ٹولے میں اٹھتے بیٹھتے جس سے ہمارا پہلے ملنا جلنا رہتا تھا۔ میں شیری کو زبردستی کار میں آگے مصطفےٰ کے ساتھ بٹھاتی۔ یہ سب خاصی اول جلول باتیں تھیں۔ میں خود کو بہت بیگانی محسوس کرتی اور شرم سے کٹ کٹ جاتی۔

ایک بار مجھے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ مصطفےٰ نے شیری سے کہا کہ مجھے ساتھ لے جائے۔ میں نے مصطفےٰ سے پوچھا کہ اپنا کیا نام بتاؤں کیونکہ ہماری شادی ابھی پردہ راز میں تھی۔ کہنے لگا کہ تم اپنا نام مسز مصطفےٰ کھر لکھواؤ۔ میں گڑبڑا گئی۔ شیری میرے ہمراہ تھی۔ میں اس کی بے عزتی نہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا نام مصطفےٰ کی بیوی کے طور پر درج نہ کرایا۔

میں نے تو لحاظ کیا تھا۔ اس کا انعام یہ ملا کہ میرا راز فاش کر دیا گیا۔ شیری نے مصطفےٰ کو بتا دیا کہ میں بیوی ہونا چھپا گئی ہوں۔ میں نے حکم عدولی کی تھی۔ مصطفےٰ کو فوراً طیش آ گیا۔ وہ چیخ چیخ کر بولنے لگا اور مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا "کبھی میری نافرمانی مت کرنا۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جس کا میں تمہیں حکم دوں گا۔" اس کا لہجہ تند تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں آئندہ کبھی حکم عدولی کروں۔

تنبیہوں کا تانتا بندھا رہا۔ مصطفےٰ مجھ پر واضح کرتا جا رہا تھا کہ میں کیا کیا نہیں کر سکتی۔ اس کے ضابطۂ حیات میں ایسی باتیں بہت کم تھیں جنہیں کرنے کی اجازت ہو۔ ایک دفعہ اس نے مجھے طلب کیا۔ میں بیڈروم میں کپڑے بدل رہی تھی۔ مجھے کچھ وقت لگا۔ وہ برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک بار اور طلبی کا پیغام بھجوایا۔ میں بے پروائی سے ٹہلتی ہوئی چلی آئی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ چہرے پر دیوانگی کے آثار ہیں۔ غصہ چڑھا ہوا ہے۔ آنکھیں، جن میں خون اتر آیا ہے، باہر ابلی پڑ رہی ہیں۔ کسی کو اتنا واضح غصہ آتے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ "تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ مجھے انتظار کرواؤ۔ تم نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ تمہاری یہ مجال۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ فوراً آؤ۔ میرے پیغام بھیجنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سارے کام چھوڑ کر دوڑی چلی آؤ۔"

میں نے تاخیر کی وضاحت کرنی چاہی۔ میری وضاحت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اپنا منہ بند رکھو۔ میں نے اسے خلاف طبع حرکت سمجھ کر دل میں نہ رکھا۔ جو وقت ہم ساتھ گزارتے تھے وہ بالعموم کشیدگی اور غصے سے پاک ہوتا تھا۔ وہ بہت

پیار کرنے والا اور رومانی آدمی تھا۔

میں نے مصطفےٰ کو پہلی بار اندھا دھند تشدد پر اترتے اس وقت دیکھا جب شیری نے اس کے بیٹے کو سگریٹ پیتے پکڑ لیا۔ وہ غسل خانے میں گئی تو وہاں ابھی تک نکوٹین کی بو رچی ہوئی تھی۔ شیری نے مصطفےٰ کو بتا دیا۔ عبدالرحمن اس وقت انیس برس کا تھا۔

ہم اپنے بیڈروم میں بیٹھے تھے۔ بدنصیب سگریٹ نوش کو ملازموں سمیت طلب کیا گیا۔ مصطفےٰ نے بیٹے سے پوچھا کہ وہ سگریٹ پیتا رہا ہے۔ لڑکے نے جھوٹ بولا۔ مصطفےٰ اٹھ کھڑا ہوا اور ملازموں کو حکم دیا کہ لڑکے کو پکڑ کر زبردستی فرش پر لٹا دیا جائے۔ اسے فرش پر اس طرح لٹا دیا گیا کہ ٹانگیں اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ پیر مار رہا تھا لیکن ملازموں نے اس کی ٹانگیں اور ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ مصطفےٰ نے اسے چھڑی سے مارنا شروع کیا۔

چھڑی پڑنے سے کھال چرنے کا ڈراؤنا چراچرا سن کر میں پیچھے دبک گئی۔ چھڑی کمر پر لگ لگ کر ٹوٹی تو مصطفےٰ کو ایک اور چھڑی لا کر دی گئی۔ وہ بھی ٹوٹ گئی۔ ایک اور چھڑی آئی۔ لڑکا چلا چلا کر رحم کی التجا کرتا رہا۔ مصطفےٰ نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ لڑکے کو مارتا رہا۔ میں نے مداخلت کی کوشش کی۔ مجھے دھکا دے کر سامنے سے ہٹا دیا گیا۔

دس سال بعد، اڈیالہ جیل کے احاطے میں، ہم نے ایک ملتا جلتا منظر دیکھا۔ ایک قیدی کو ہاتھ پیر پھیلا کر زمین پر لٹایا ہوا تھا۔ وہی اذیت ناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اسی بے رحمانہ انداز میں قیدی کو مارا جا رہا تھا۔ مصطفےٰ نے نمودار ہو کر قیدی کو چھڑا لیا تھا۔

میں دم بخود رہ گئی۔ میں مضطرب ہونے میں حق بجانب تھی۔ عبدالرحمن اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اس کی سگریٹ نوشی پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہیے تھا۔ اتنا اس نے جرم نہیں کیا تھا جتنی زیادہ اسے مار پڑی تھی۔ اور جرم بھی کیا، محض الزام ہی تو تھا۔ اس تشدد سے میں لرز کر رہ گئی۔ مصطفےٰ نے اپنی صفائی میں وہی مقولہ دہرایا کہ بچے کو مارا پیٹا نہ جائے تو وہ بگڑ جاتا ہے۔ میں قائل نہ ہو سکی۔

مصطفےٰ اب اپنا ملمع اتار رہا تھا۔ میرے ساتھ تعلقات میں اب اسے تکلف سے کام لینے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس کی شخصیت کا تاریک تر پہلو ظاہر ہو چلا تھا۔

ہم تاج الملک کے گھر گئے ہوئے تھے۔ مصطفےٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ کچھ رقم ساتھ لے چلنا۔ مجھے بیگ اٹھائے پھرنے کی عادت نہ تھی۔ میں بھول گئی۔ تاج الملک

کے ہاں پہنچے تو ٹولے نے فیصلہ کیا کہ کہیں باہر جا کر کھانا کھایا جائے۔ مصطفےٰ نے مجھ سے رقم طلب کی۔ میں نے کہا کہ وہ تو میں گھر بھول آئی۔ اس نے سب کے سامنے نہایت آمرانہ لہجے میں مجھ سے کہا "گاڑی میں بیٹھو، گھر جاؤ، رقم لو اور واپس آؤ۔" مجھے لگا جیسے میں اس کی زرخرید باندی ہوں۔ میں نے وہی کیا جو کرنے کا مجھے حکم دیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے ذلیل کیا گیا ہے۔

ایک بار مصطفےٰ شکار کھیلنے نکلا تو مجھے ساتھ لے گیا۔ وہاں ہمارے سننے میں آیا کہ شیری کے بچہ ہوا ہے۔ واپس آ کر مصطفےٰ اور میں ہسپتال اسے دیکھنے گئے۔ مصطفےٰ بیٹے کو گھر لے آیا۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا کہ بیٹا ہوا ہے۔ وہ بچے کو اس کی دادی کے پاس لے گیا۔ دادی نے اسے ذرا سا شہد چٹایا اور کان میں اذان دی۔ وہ بچے کو واپس لے آیا۔ اسی رات بچے کی طبیعت بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ اسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ ایک کھلی کھڑکی کے پاس سویا رہا تھا۔ بچہ فوت ہو گیا۔

افواہیں گردش کرنے لگیں۔ مصطفےٰ پر بچہ کشی کا الزام لگا۔ شیری کے خاندان کا خیال تھا کہ الزام درست ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ الزام میں کوئی صداقت نہیں۔ مصطفےٰ نوزائیدہ بیٹے کو دیکھ کر سچ مچ خوش ہوا تھا اور اس کے فوت ہو جانے سے اسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ ایک بار پھر مصطفےٰ کو اپنی شہرت کی وجہ سے خجالت اٹھانی پڑی۔ اس کے بارے میں جو کہا جاتا، لوگ ماننے کو تیار ہو جاتے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اپنے ہی بچے کو ہلاک کرنے کے سفاکانہ اور بے رحمانہ فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ لیکن میری رائے کی وقعت ہی کہاں تھی۔ جانبدارانہ رائے جو ہوئی۔ میں اس کی بیوی تھی اور عنقریب اس کی اکلوتی بیوی بننے والی تھی۔

شیری سے کہا گیا کہ گھر آنے کی زحمت نہ کرے۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ شادی ختم ہوئی۔ بگاڑ تو پہلے ہی آ چکا تھا، رہی سہی کسر بچے کی وفات سے پوری ہو گئی۔ مصطفےٰ اس سے ملنے گیا اور طلاق کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔

شیری اپنی چیزیں سمیٹنے کے لیے آئی۔ ہم اس سے الگ رہے۔ ہم چاہتے تھے کہ سارا گھر اس کی دسترس میں ہو، اکیلی جو چاہے کرے، جو چاہے اٹھا کر لے جائے۔ مصطفےٰ نے اسے بالکل نہ ٹوکا۔ جو شیری کا دل چاہا اسے لے جانے دیا۔ اس نے اپنے تمام زیورات اکٹھے کر لیے۔ پورے اسی کے اسی سیٹ۔ یہ زیورات اسے اس لیے پیش کیے گئے تھے کہ وہ پنجاب کے گورنر سے شادی کر رہی تھی۔ اس نے وہ تمام تحائف بھی ہتھیا لیے جو مصطفےٰ کو آنے والے متعدد مہمانوں نے پیش کیے تھے۔ مجھے یاد ہے مصطفےٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ چند ایک زیورات لے لو لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔

شیری کے تمام زیور میں نے ایک ٹرنک میں رکھوا دیے تھے۔ مجھے گوارا ہی نہ تھا کہ اس کی کوئی چیز پہنوں۔ میں مصطفےٰ کی زندگی میں بہت بعد میں آئی تھی، اس کے دورِ زوال کی ساتھی تھی۔

میرے ذہن پر تانیا سوار تھی۔ شیری رخصت ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ تانیا کو اپنے نئے گھر لانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے انہیں کو فون کیا۔ یہ 18۔اکتوبر 1976ء کی بات ہے۔ انہیں نے تانیا کو میرے پاس بھجوانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ میں اپنی بیٹی کو مصطفےٰ کھر جیسے موذی آدمی کے پاس رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس کے ہاتھوں بچے کی موت کی کہانی ہر طرف مشہور ہو چکی تھی۔ انہیں نے بتایا کہ آئندہ مجھے تانیا کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ تانیا کا سکول اسی دن کھلتا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری بچی کو کپڑے کون پہنائے گا؟ اس کا لنچ کون تیار کرے گا؟ مصطفےٰ غصے میں آ کر جاگا۔ "اگر تمہیں اپنی بیٹی سے اتنا ہی پیار ہے تو مجھ سے شادی کس لیے کی؟ تمہیں پتہ ہونا چاہیے تھا کہ جو قدم تم اٹھا رہی ہو اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ اب تانیا کے لیے آنسو بہا کر تم میری زندگی برباد نہیں کر سکتیں۔ اس کی خاطر رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یہ بالکل نہیں دیکھنا چاہتا کہ آئندہ تم اسے یاد کر کے آنسو بہاؤ۔ کبھی نہیں۔ بالکل نہیں۔ سن لیا تم نے؟"

وہ بہت درشت ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے اس آدمی سے خوف آنے لگا۔ اس کے لہجے میں ہمیشہ دھمکی کا رنگ ہوتا۔ اس بات کی تمہید کہ تشدد کا پورا پورا امکان موجود ہے۔ اس کے تیور سب کچھ بتا دیتے تھے۔ چہرے کی کیفیت میں طیش، تلخی اور دھمکی سب یکجان نظر آتے تھے۔

شادی کے دو ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ میں حاملہ ہو چکی ہوں۔ مصطفےٰ پیپلز پارٹی میں دوبارہ شمولیت کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ ہمارا بذریعہ کار اسلام آباد آنا جانا رہتا۔ ہم اندازہ لگاتے کہ مصطفےٰ کے سامنے عمل کی ایسی کون سی راہیں ہیں جن میں سے وہ کوئی چن سکتا ہے اور بھٹو صاحب کے دامن میں واپسی کی شرائط پر تبادلۂ خیال کرتے۔ اسے میرے حاملہ ہونے کا پتہ چلا تو خوش ہوا۔

ہم رات کے کھانے کے لیے میز پر پہنچے۔ مصطفےٰ پر بظاہر بے صبری کا غلبہ تھا۔ کھانا آنے میں پانچ منٹ کی تاخیر ہو گئی۔ جونہی ملازم سالنوں کے ڈونگے وغیرہ لے کر نمودار ہوا مصطفےٰ کو اپنے ہوش و حواس پر قابو نہ رہا۔ وہ چیخ پھٹ پڑا۔ اس نے بیچارے

ملازم کو اتنا مارا، اتنا مارا کہ وہ تقریباً غش کھا گیا۔ میری بھوک اڑ گئی۔ اس کے بعد اس نے کھانے کی میز پر اپنی نشست دوبارہ سنبھالی اور مجھ سے کہا کہ کھاؤ۔ میں کھا نہ سکی۔ مصطفیٰ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے وہی گندی اور بازاری زبان استعمال کی جس کا وہ شیری کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے کھانا نہ کھایا تو وہ سالن کی پلیٹیں اٹھا اٹھا کر مجھ پر پھینکنے لگے گا۔ اس شام گویا گلا دبا کر مجھے کھانا کھلایا گیا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا اتفاق ہوا، گو یہ آخری بار نہ تھا۔

اس رات جب ہم سونے کے لیے کمرے میں پہنچے تو مجھے خوف نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ فضا تشدد سے بوجھل معلوم ہو رہی تھی، اتنی بوجھل کہ اس پر کسی ٹھوس چیز کا گمان ہوتا تھا اور ایسی ٹھوس کہ چاقو سے کٹ سکتی تھی۔ مصطفیٰ بہت ہی الٹے پلٹے موڈ میں تھا۔ بستر میں لیٹے لیٹے اس نے انیس سے میری شادی کی تفصیلات کے بارے میں تفتیش شروع کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر بات اسے ازسرنو بتائی جائے۔ میری انیس سے کیسے ملاقات ہوئی تھی؟ کہاں ہوئی تھی؟ میں نے بتانا شروع کیا۔ زیادہ چبھتے ہوئے سوال کیے جانے لگے۔ ان سے دکھتی رگیں چھلی جا رہی تھیں۔ وہ ہماری پہلی رات کی ساری تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔

جوں جوں وہ سوال کرتا گیا اس کا غصہ بڑھتا گیا۔ اس کی آواز بدل گئی۔ سانس چڑھ گئی۔ آنکھیں ابل آئیں اور لال ہو گئیں۔ چہرہ غصے سے تن گیا۔ میں تمل مشقں پر اتر آئی۔ زیادہ محتاط ہو گئی۔ سچ سن کر اس کا پارہ اور چڑھ جاتا لیکن بضد تھا کہ سنوں گا تو سچ ہی سنوں گا۔ "بھول جاؤ مصطفیٰ۔ یہ قصہ ختم ہو گیا۔ یہ ساری باتیں تم دوبارہ کیوں سننا چاہتے ہو؟" "میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ مجھے جواب دو۔" میں بہت دہل گئی۔ خود کو جواب دینے پر آمادہ نہ کر سکی۔ میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ اسے اور غصہ چڑھ گیا۔ "تم مجھ سے باتیں چھپا رہی ہو۔ بتانے کے لیے ابھی اور بہت کچھ ہے۔" "ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے خیال میں ہمیں اس موضوع پر اس وقت گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ یہ باتیں سن سن کر تمہاری الجھن بڑھ رہی ہے۔" "تم کون ہوتی ہو یہ سوچنے والی؟ میں نے تم سے سوال کیا ہے۔ جواب دو۔"

میں خوف کے مارے جواب دینے سے احتراز کر رہی تھی۔ آخرکار مجھے اس کے سامنے جھکنا ہی پڑا۔ میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ سنتا رہا۔ میں جب بھی ذرا رکتی وہ مجھے دھمکانے لگتا۔ وہ مجھے دام میں لا رہا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اسی معلومات کو وہ مستقبل میں مجھ پر فردِجرم عائد کرنے کی غرض سے کام میں لائے گا۔ میں اپنی نظر میں آپ مجرم بنتی جا رہی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میری شادی کی تفصیلات سن کر مصطفیٰ کو نہ صرف بہت طیش آ رہا ہے بلکہ اس کا توازن بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ وہ اذیت کے مارے تڑپ رہا تھا اور اس کے باوجود مزید جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ جن جزئیات کو میں پوست کندہ بیان کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی ان سے ایک اذیت خواہانہ لذت حاصل کی جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لذت اور اذیت کا یہ توازن عارضی ہے۔ پلڑا بالآخر اذیت کی طرف جھک جائے گا۔ توازن بگڑنے کی صورت میں جو دھماکا ہونا تھا میں اس کے خیال سے دہشت زدہ تھی۔ آخر یہی ہوا۔ جس تشدد کا مجھے نشانہ بنایا گیا میں اس کا کبھی تصور تک نہ کر سکتی تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تشدد کوئی بیس منٹ سے زیادہ دیر تک جاری رہا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے اٹھا اٹھا کر پھینکا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا جسم جا کر دیواروں سے ٹکراتا رہا۔ مجھے یاد ہے کہ میری آنکھ میں کوئی چیز پھٹ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ کوئی چیز دو نیم ہو گئی۔ میری آنکھ میں اٹھنے والی ٹیس برداشت سے باہر تھی۔ مجھے یاد ہے کوئی چیز سوجتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہونٹوں پر ورم آ گیا ہے۔ مجھے لگا جیسے میرے چہرے کا تناسب اچانک بگڑ گیا ہے۔

بعد میں ایک ایسی آواز، جو مشکل سے پہچانی جا سکتی تھی، میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "پلیز۔ بس کرو۔ خدا کے لیے۔ میں۔ میں۔۔۔۔ باتھ روم جانا چاہتی ہوں"۔ میں ڈگمگاتی ہوئی باتھ روم میں داخل ہوئی۔ اتفاقاً سنک کے اوپر لگے ہوئے آئینے پر نظر گئی۔ مجھے ایک چہرہ دکھائی دے رہا تھا جسے ہولناک انداز میں کچلا مسلا گیا تھا۔ یہ میں نہ تھی میرا توڑا مروڑا ہوا سایہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ابھی ابھی کسی جانے حادثہ سے اٹھ کر آ رہی ہوں۔ کسی نے دیدہ و دانستہ میرا یہ حشر کیا تھا۔ دورِحاضر کی جنگ کی ہولناکی کی تاب نہ لا کر بعض فوجی ایسے ہو جاتے ہیں کہ زندہ لگتے ہیں نہ مردہ۔ یہی کیفیت میری تھی۔ چہرہ ٹیڑھا میڑھا ہو گیا تھا۔ ناک پچک کر چہرے سے جا ملی تھی جو ڈراؤنے انداز میں ابھرا ہوا تھا۔ رخسار سوج گئے تھے۔ آنکھیں بڑے بڑے نیلے دھبوں کی گہرائیوں میں چھپ گئی تھیں۔ ایک آنکھ میں شُوگ پھٹ گئی تھی۔ کان میں ٹیس اٹھ رہی تھی۔

میں وہاں کھڑی اپنی طرف تکتی رہی۔ یقین نہ آتا تھا کہ میرے ساتھ یہ کچھ ہوا ہے۔ میں نے الجھے ہوئے بالوں کو سنوارنے کے لیے ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ سر پر ایک جگہ بالوں میں خون جما ہوا ہے۔ ہاتھ لگانے سے بالوں کے گچھے اتر کر ہاتھ میں آ گئے۔ غرارہ کیا تو منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ ہونٹ بہت ہی مبالغہ آمیز اور کج انداز میں کپا ہو کر پھیل گئے تھے۔

یہ سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد میں نے آئینے سے نظر ہٹائی۔ لگتا تھا جیسے میرے جسم کا ست نکل گیا ہے اور کسی بھی لمحے دھڑام سے گر جاؤں گی۔ میں خوفزدہ اور بوکھلائی ہوئی واپس کمرے میں پہنچی۔ مصطفےٰ وہاں کھڑا تھا۔ سر جھکائے۔ مٹھیاں بھینچے۔ اس نے میرے اندر آنے کی آہٹ سنی۔ میری طرف دیکھا۔ وہ اچانک چُور چُور ہو گیا۔ جیسے کوئی مرگی زدہ دورہ فرو ہونے کے بعد ہوش میں آ رہا ہو۔ فرق یہ تھا کہ مرگی زدہ بتدریج ہوش میں آتا ہے۔ مصطفےٰ یکایک ہوش میں آ گیا۔ اس نے خود کو ایک وحشی، مستقل مزاج درندے سے ننھے بچے میں تبدیل کر لیا۔ مسکین اور سہما ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حقیقی شرمندگی تھی۔ میرے قدموں میں گر پڑا اور رونے اور سسکنے لگا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس میں ضرور کوئی بدروح حلول کر گئی ہو گی۔ تبھی اس نے مجھے اتنی زیادہ جسمانی گزند پہنچائی ہے۔ میں نے نظر جھکا کر اس آدمی کی طرف دیکھا جو آقا کا روپ چھوڑ کر غلام کی جون میں آ گیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے اس آدمی پر ترس آیا جو میرے قدموں پر ماتھا ٹیکے ہوئے تھا اور جس نے میرے پیر اپنی مٹھیوں میں داب رکھے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔

تکلیف کہاں بھولنے دیتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ میں رات بھر درد کے مارے تڑپتی رہی۔ میں کسی طرح بھی نہیں سو سکتی تھی۔ میرے جسم کا ہر حصہ دکھ رہا تھا۔ مصطفےٰ میری تکلیف کو کم کرنے کی کوشش میں ساری رات بیٹھا جاگتا رہا۔ میں جانتی تھی کہ مجھے سخت چوٹیں آئی ہیں۔ مجھے خود کو کسی ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔

کانوں کے کسی خصوصی ماہر، آنکھوں کے کسی معالج، کسی فزیوتھیراپسٹ کے پاس ہمارا جانا ضروری تھا۔ میرا کان کا پردہ، آنکھ کی مُودگ، چوٹوں کے نیل، موچیں---- ان سب کا معائنہ ہونا چاہیے تھا لیکن میں اس حال میں باہر کس منہ سے جاتی۔ میری طرف دیکھتے ہی صاف پتہ چل جاتا کہ مجھے مارا پیٹا گیا ہے۔ اپنا بھرم بنائے رکھنے کے لیے میں تکلیف برداشت کیے جانے پر مجبور تھی۔

مصطفےٰ گھبرایا ہوا تھا۔ اسے بھٹو صاحب سے ملنے اسلام آباد جانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو ہماری تشدد بھری رات کا پتہ چلے۔ اسے ملازموں اور اپنی ماں جی کی طرف سے زیادہ فکر لاحق تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان کے ذریعے سے یہ کہانی باہر نکل جائے گی۔ میں نے اس سے کہا کہ اسلام آباد چلے جاؤ۔ "جب تک تم واپس نہ آؤ گے میں کمرے ہی میں رہوں گی۔ سب کو یہی بتانا کہ میں تمہارے ساتھ گئی ہوں۔" اس نے میری بات مان لی۔ میں نے خود کو اپنی جاں فرسا تکلیف کے ساتھ کمرے میں مقفل کر

لیا۔ چار دن اسی اذیت میں مصطفےٰ کا انتظار کرتے گزرے۔ دائی عائشہ کو بتائے بنا چارہ نہ تھا۔ وہ چوری چھپے میرے لیے کھانا لے آتی اور چہرے پر پلٹسیں لگاتی تاکہ ورم اتر جائے۔

میرے چہرے کو ایسی شکل اختیار کرتے کرتے، جو میری اصل صورت سے کسی حد تک مشابہ تھی، پندرہ دن لگے۔ صرف اس کے بعد ہی میں گھر سے نکلنے کی جرأت کر سکی اور ڈاکٹروں کے پاس گئی۔ انھوں نے محض میرے خدشات کی تصدیق کی۔ میری آنکھ میں اندرونی زخم آ گیا تھا، ایک پھٹی ہوئی مُودگ جو زندگی بھر مجھے دق کرتی رہے گی۔ مجھے آپریشن کرانا پڑا۔ آج بھی جب تناؤ کی حالت ہو تو میری داہنی آنکھ میری ذات پر اس پہلی تاخت کی گواہی دینے لگتی ہے۔

نفسیاتی طور پر جو گزند پہنچی وہ بدتر تھی۔

مصطفےٰ نے مجھ پر جو حملہ کیا تھا اس سے میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ جونہی وہ گھر میں قدم رکھتا میں خوف سے کانپنے لگتی۔ پہلے سے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کیا کرے گا، کیا نہیں۔ میں اس بارے میں یقین سے کبھی کچھ نہ کہہ سکتی کہ اس کی دنیا میں میرا مقام کیا ہے۔ اس شخص کی جو محبت میرے دل میں تھی وہ خوف میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا کہا ہمارے لیے قانون تھا۔ اس کا حکم کتنا ہی غیر معقول کیوں نہ ہوتا مجھے یہ دریافت کرنے کی اجازت نہ تھی کہ وہ کیوں دیا گیا ہے۔ ایک روز کہنے لگا کہ تم اخبارات پڑھا کرو۔ میں نے چوں بھی نہ کی، حکم مان لیا۔ میں نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ مجھے ایک طرف کونے میں دھکیل دیا جائے جہاں میں دن بھر بیٹھی لرزتی اور یہ سوچ کر حیران پریشان ہوتی رہوں کہ جتنی جگہ میرے لیے مختص کی گئی تھی کہیں میں نے اس سے زیادہ جگہ تو نہیں گھیر لی۔ یہ ڈراؤنی باتیں تھیں۔ کبھی کبھی وہ ایسے کمرے میں بلا لاتا جہاں ہر طرف اخبار ہی اخبار ہوتے۔ میرے ردعمل سے ظاہر ہو جاتا کہ میں کس بری طرح احساس جرم میں مبتلا ہوں۔ میں دعائیں کرتی رہتی کہ اسے یہ خیال نہ آئے کہ میں نے کسی طرح اس کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے۔ کبھی کبھار وہ اندر آتا، رکتا، پہلے اخباروں پر اور پھر الزام لگانے کے انداز میں مجھ پر نظر ڈالتا۔ "تم نے کوئی اخبار پڑھا؟" "نہیں۔" "مجھ سے جھوٹ مت بولو۔"

مزید کچھ نہ کہا جاتا۔ باقی بات گھونسوں کی زبانی ہوتی۔ ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں آیا جب مصطفےٰ نے کسی وجہ سے مجھے مارا نہ ہو۔ کھانا دیر میں ملا، گرم پانی کے گیزر میں نقص پیدا ہو گیا، کپڑوں پر سلوٹیں پڑ گئیں، غرض کوئی بھی وجہ ہو سکتی تھی اور ہر وجہ سزا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ عذر تلاش کرتا رہتا۔ بہانے ڈھونڈتا

کرتا۔ شیریں کی کہانیاں حقیقت بن گئیں۔ میں شیریں جیسی بن گئی۔ میں تھی ہی اس لیے کہ وہ جب چاہے مجھ پر مشق ستم کرے۔ المیہ یہ تھا کہ جب اس پر تشدد کرنے کا بھوت چڑھتا تو میں کچھ نہ بولتی۔ میں نے یہ پوچھنا چھوڑ دیا تھا کہ مجھ پر ہاتھ کیوں اٹھایا جارہا ہے۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں نے ہمت کر کے اس سے یہ پوچھ لیا تو وہ مجھے اور مارے پیٹے گا۔

وہ گھر پر کسی آمر کی طرح راج کرتا۔ جونہی وہ گھر میں قدم رکھتا گھر کے ہر مکین پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ دوسرے زرخرید غلاموں کی طرح میں بھی ایک باندی تھی۔ وہ ہمارا آقا تھا۔ بائیس کنال میں بنی کوٹھی کا مالک، جہاں ہرن اٹھلاتے پھرتے تھے، جہاں چھوٹے پرندے بسیرا کرتے تھے، جہاں مور اترا اترا کر چلتے تھے اور ملازم، گھر والے، ماں اور بیوی، سب کانپتے رہتے تھے۔ بہت ہی اوٹ پٹانگ صورتحال تھی۔ وہ ظالم تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں پنجرے کی چڑیا ہوں۔ لیکن پنجرہ بھی کوئی گوشۂ عافیت نہ تھا۔

میرا سوچنے کا عمل یکایک ساقط ہو گیا۔ میں سوچنے سے ڈرتی تھی۔ تجزیہ کرنے سے ڈرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے ذہن میں سرایت کر سکتا ہے، مجھے سزا دے سکتا ہے۔ میں نے اس آدمی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا جس نے اتنے ارمانوں کے ساتھ مجھ سے شادی کی تھی اور پھر مجھ پر اچانک اس قدر وحشیانہ اور بہیمانہ انداز میں ٹوٹ پڑا تھا۔

میں جان بچا لائی تو صرف مصطفےٰ کے شیزوفرینک رویے کی وجہ سے۔ جب اس کے مزاج پر شگفتگی کا غلبہ ہوتا تو بہت پیار کرنے والا اور لحاظ رکھنے والا آدمی بن جاتا۔ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا، ایسے کھانے چن چن کر میرے سامنے رکھتا جو میرے لیے مفید تھے۔ میرا سر اور ٹانگیں دباتا۔ میرے لمبے لمبے بالوں میں تیل لگاتا اور ان میں کنگھی کرتا۔ میرے ساتھ مل کر خواب دیکھتا اور وعدہ کرتا کہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔

مصطفےٰ کے اس اچھوتے موڈ کو برقرار رکھنے کے لیے میں بہتیرے ہاتھ پیر مارتی۔ اس کی خونخواری سے میری جان فنا ہونے لگتی۔ اس وقت بھی، جب میں سطریں لکھ رہی ہوں، میں محسوس کر سکتی ہوں کہ وہ کس طرح کلائیاں پکڑ کر میری بانہیں مروڑ رہا تھا۔ درد کے مارے میں چیخیں مارنے لگتی تھی۔ میں دیکھ سکتی ہوں کہ اس کی آنکھیں کس طرح ابل کر غصے سے مجھے گھورتی تھیں۔

مجھے پتہ تھا کہ میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں نے یہ شادی ایک عالم کی ناراضگی مول لے کر کی تھی اور اب اسے قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہنا مجھ پر فرض تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ ہماری شادی اب اعتماد یا محبت یا احترام پر قائم نہ تھی۔ اس کی بنیادیں کبھی ختم نہ ہونے والے اندھے خوف پر کھڑی تھیں۔

مجھے اپنے پر اتنا اعتماد نہ تھا کہ گھر چھوڑ کر نکل جاتی۔ میں ایسا کرنے سے ڈرتی تھی۔ اس کی دلیل میرے پاس یہ تھی کہ خواہ میں کتنی دور ہی کیوں نہ بھاگ جاؤں مصطفےٰ مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ بہت زیادہ طاقتور تھا۔ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ میں دیکھ چکی تھی کہ وہ قتل کرنے کا پوری طرح اہل ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دینے کے تمام خیالات کو ذہن بدر کر دیا۔ "مجھے پتہ چل جائے گا کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔ تہمینہ، مجھ پر یقین کرو۔ کسی ایسی بات کے بارے میں سوچنے کی تمہیں جرأت نہیں ہو سکتی جس کے بارے میں سوچنے سے میں تمہیں منع کر چکا ہوں۔"

میرے دماغ کو دھو دھلا کر، رنگ اڑا کر، سکھانے کے لیے الگنی پر ڈال دیا گیا تھا۔ میں خود اپنے ذہن کے قریب جانے سے ڈرتی تھی۔ مجھے سونے سے خوف آتا تھا۔ میں ایسے ایسوں کے خواب نہیں دیکھنا چاہتی تھی جن سے وہ ناراض ہونے لگے۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں سوتے میں باتیں نہ کرنے لگوں۔ مجھے لگتا کہ لوگ خواہ مخواہ میری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ تہمینہ کھر کی کایا کلپ کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ آدمی کا روپ چھوڑ کر مینڈا بنتی جا رہی تھی۔ نہ منہ میں زبان، نہ ہاتھ پیر میں جان۔ نری ترکاری۔

1977ء میں پاکستان میں انتخابات کرائے گئے۔ بھٹو صاحب، جنہیں ایسا معلوم ہوتا ہے انٹیلی جنس والوں کی جھوٹی رپورٹیں پڑھائی جاتی رہی تھیں، وقت سے پہلے انتخابات کرانے کا اعلان کر بیٹھے۔ مخالف سیاسی جماعتوں نے، بھان متی کے کنبے کی طرح اکٹھے ہو کر، پاکستان قومی اتحاد تشکیل دیا۔ یہ نو سیاسی جماعتوں کی کھچڑی تھی۔ ان میں صرف ایک قدر مشترک تھی۔ بھٹو صاحب سے نفرت۔ انتخابات سے پہلے مخالفین بھانپ گئے کہ بھٹو صاحب جیت جائیں گے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ نتائج کو قبول نہیں کریں گے، بھٹو صاحب پر دھاندلی کا الزام لگائیں گے اور تحریک شروع کر دیں گے جس میں سڑکوں پر نکل آنے والے عوام کی طاقت ریاست کی طاقت پر غلبہ پا لے گی۔ جو جال انہوں نے بڑی صفائی سے بچھایا تھا بھٹو صاحب آ کے اس میں پھنس گئے۔ پیپلز پارٹی کو اچھی بھلی، اگرچہ پہلے سے کچھ کم، اکثریت حاصل ہو جاتی لیکن بھٹو صاحب کے چیلے چانٹوں نے اس پر اکتفا کرنے کی بجائے بڑے پیمانے پر دھاندلی کی اور بیلٹ بکسوں کو زبردستی جعلی ووٹوں سے بھر دیا۔ جب نتائج آنے شروع ہوئے اور پتہ چلا کہ پی پی پی نے مخالف جماعتوں کا صفایا کر دیا ہے تو حزب اختلاف نے "ہم تو پہلے ہی کہتے تھے" کا موقف اپنا کر ردعمل ظاہر کیا۔ وہ بڑے بڑے ہجوم سڑکوں پر لے آئے اور

انھیں حواس باختہ بھٹو صاحب کی طرف جھکا دیا۔

ملک تباہی کے دہانے پر لڑکھڑانے لگا۔ ملک بھر میں تشدد اور ہڑتالوں کی وبا پھوٹ پڑنے سے معیشت کے پیتھڑے اڑ گئے۔ حزب اختلاف کو فتح کی خوشبو آنے لگی۔ اب وہ خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان میں سے بہت سوں کو پتہ تھا کہ فوج پس پردہ انتظار کر رہی ہے اور بگڑتی حالت کو سنبھالنے اور بھٹو صاحب کو برطرف کرنے کے لیے آ دھمکے گی۔ سازش کے نظریوں کا چرچا ہونے لگا۔ بھٹو صاحب کی آزادانہ خارجہ پالیسی اور ان کے نزاع انگیز ایٹمی پروگرام سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو تشویش تھی۔ اس سے فوج بھی گھبرائی ہوئی تھی۔ ایٹمی اسلحہ بنانے کی صلاحیت حاصل ہو گئی تو پھر بہ وقتی روایتی فوج کی ضرورت کم ہو جائے گی اور اس اکثر دہرائے جانے والے مطالبے کو پورا کیا جا سکے گا کہ دفاع پر اخراجات میں کمی کی جانی چاہیے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ڈر تھا کہ کہیں نام نہاد اسلامی بم آخر کار لیبیا اور شام جیسے ملکوں اور پی ایل او جیسی تنظیم کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ بھٹو صاحب نے کسی زمانے میں "آزادی کا ڈھکوسلا" کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ انھوں نے کچھ سبق اپنی ہی مقالہ نما تصنیف سے سیکھ لیے ہوتے۔

اس مقصد کے لیے حزب اختلاف کو استعمال کیا گیا۔ ایجی ٹیشن کو "بازار" نے یا جیسا کہ بعض افواہوں میں خیال ظاہر کیا گیا تھا، امریکی ڈالروں نے ہوا دی۔ کامیاب پہیہ جام ہڑتالوں نے صنعت کے پہیے کو روک دیا اور بھٹو صاحب کو ملک کے تین بڑے شہروں میں فوج طلب کرنی پڑی۔ فوج کو مکمل کنٹرول حاصل تھا اور یوں جزوی مارشل لاء کا آغاز ہوا۔

مصطفیٰ نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ وہ جو کل تک اس کے پیر و مرشد کہلاتے تھے اپنی سیاسی بقا کے لیے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ بھٹو صاحب جانتے تھے کہ ان کی نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پنجاب کے صوبے کو، جو اُن سے روٹھ چکا تھا، دوبارہ منا لیا جائے۔ یہ معجزہ، جس کی وہ امید لگائے بیٹھے تھے، صرف ایک ہی شخص کر کے دکھا سکتا تھا۔۔۔۔ مصطفیٰ کھر۔ ہر طرف سے نرغے میں آئے ہوئے بھٹو صاحب نے، ہار کے اور سونہہ نیچی کر کے، مصطفیٰ کو اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ، نواب صادق حسین قریشی، دھاڑتے ہجوموں کا زور کچلنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ وہ اپنے تمام قانونی اختیارات سے نوکر شاہی کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔

یہ بحران وہ چیلنج ثابت ہوا جس کی مصطفیٰ کو تلاش تھی۔ اس نے پیپلز پارٹی میں دوبارہ شمولیت کا فیصلہ کیا۔ اسے امید تھی کہ وہ پنجاب میں اصل طاقت بن کر ابھرے

گ۔ اسے بھٹو صاحب کا خصوصی معاون اور اعلیٰ ترین سیاسی مشیر مقرر کیا گیا۔ اس کا عہدہ مرکزی کابینہ کے وزیر کے برابر تھا۔ اسے فوراً پنجاب بھیجا گیا جہاں اس نے اعلیٰ سطح کے اجلاس میں وزیر اعلیٰ، چیف سیکرٹری، آئی جی اور کمشنر سے ملاقات کی۔ اس نے عوام سے بھی رابطہ کیا اور پاکستان قومی اتحاد کو کھلم کھلا مقابلے کی دعوت دی۔ وہ پارٹی کے عام اراکین کا، جن پر بے دلی طاری تھی، حوصلہ بلند کرنے میں کامیاب رہا۔ راولپنڈی میں اس نے ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے پُرجوش ہجوم کو بتایا کہ پاکستان قومی اتحاد کو پتہ ہونا چاہیے کہ پیپلز پارٹی ضبط و تحمل سے کام لیتی رہی ہے۔ اگر ہمیں مزید پیچھے دھکیلا گیا تو ہم بدلا لیں گے۔ ہم گولی کا جواب گولی سے دیں گے۔ اگر وہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں تو ہم بھی ان کا ٹینٹوا دبوچنے کو تیار ہیں۔"

ہم اسلام آباد میں سٹیٹ بینک ہاؤس منتقل ہو گئے۔ بھٹو صاحب محسوس کرتے تھے کہ اپنی آخری جدوجہد کے لیے کمر بستہ ہوتے وقت مصطفیٰ کا ان کے پہلو میں ہونا ضروری ہے۔ میرا آٹھواں مہینہ تھا۔ ایک ماہ بعد میرے بطن سے مصطفیٰ کے پہلے بچے کی ولادت متوقع تھی۔ مجھے پہلی بار پتہ چل رہا تھا کہ کسی اہم سرکاری عہدے دار کی بیگم ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

مصطفیٰ کا حال یہ تھا کہ آج یہاں تو کل وہاں۔ بحران سنگین ہونے کے بعد وہ شاید ہی کبھی گھر پر نظر آیا ہو۔ وہ کابینہ کے اجلاس میں شریک ہوتا اور بھٹو صاحب کے مشیروں کی حماقتوں کے خلاف تقریریں کرتا۔ بارہ دن کی سخت دوڑ دھوپ کے بعد پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ مصالحت کے آثار صاف نظر آنے لگے۔ دونوں متحارب فریق اب گفت و شنید کر رہے تھے اور بھٹو صاحب زیادہ صلح جو موڈ میں تھے۔ ان کے مزاج میں خاصی لچک آ گئی تھی۔ جتوئی صاحب کے ساتھ مصطفیٰ کی جو بات چیت ہوتی رہتی اس سے میں اتنا اخذ کر سکی کہ حزب اختلاف کے مولانا نورانی کے ساتھ افہام کی کوئی صورت نکل آئی ہے اور کسی طرح کا معاہدہ طے پانے والا ہے۔

جنرل ضیاءالحق چیف آف آرمی سٹاف تھا۔ وہ اجلاسوں میں شریک ہوتا اور اپنی خاموشی اور ظاہری چاپلوسی کے لیے مشہور تھا۔ بہت ہی اطاعت گزار واقع ہوا تھا اور بھٹو صاحب کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مروت سے پیش آتا تھا۔ بظاہر بھٹو صاحب سے مرعوب تھا۔ مصطفیٰ کابینہ کے ایک اجلاس میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا۔ میں نانی اماں کے ساتھ ایک ریستوراں میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ رات کو گھر سے باہر کھانا کھائیں گے۔ جولائی کی چار تاریخ تھی۔ اس دن امریکی اپنا یوم آزادی مناتے ہیں۔ مصطفیٰ ریستوراں میں داخل ہوا۔ ایک تو آیا بڑی دیر میں تھا، دوسرے بہت

مضطرب تھا۔ گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ وہ پریشان بھی تھا اور تناؤ میں مبتلا بھی۔ بتانے لگا کہ اس نے جنرل ضیاء کے رویے میں زمین آسمان کا فرق آتے دیکھا ہے۔ "یکایک ایسا لگا جیسے جنرل ضیاء بھی بعض معاملات میں اپنی کوئی سوچ رکھتا ہے۔ ہم جو منصوبے پیش کر رہے تھے ان میں سے چند ایک سے اس شخص نے عدم اتفاق ظاہر کیا۔ اس کے رویے میں تبدیلی کا مطلب ہے کہ اس کی ڈور بڑی طاقتیں ہلا رہی ہیں۔ میں نے بھٹو صاحب کو بتا دیا ہے انہیں خبردار کر آیا ہوں۔ میں سی ان سی پر مزید بھروسا نہیں کر سکتا۔"

بھوک کے رہ گئی تھی۔ ہم کھانے سے یونہی چھیڑ چھاڑ کرتے رہے اور بھوک اڑ جانے کا بل ادا کر کے گھر کا رستہ لیا۔ ہم ایک بجے سوئے۔ کوئی تین بجے دروازہ کھلا۔ جو بھی تھا اس نے دستک دینے کی زحمت نہ کی تھی۔ متین، ایک قدآور پٹھان، جو ہمارا گن مین تھا، سایوں میں کھڑا نظر آیا۔ مصطفےٰ اُچھل کر اٹھا۔ اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے اپنے آتشی ہتھیار کی طرف بڑھا۔ اسے ہمیشہ قاتلانہ حملے کا ڈر رہتا تھا۔ وہ سوتے میں قتل ہونا ہرگز نہ چاہتا تھا۔ لڑتے لڑتے جان دینا اس کے نزدیک قابل ترجیح تھا۔

متین نے کوئی بات نہیں کی۔ ہاتھ ہلا کر مصطفےٰ کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں آدمی چلے گئے۔ نیند کے غلبے سے میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ میں پڑ کر دوبارہ سو گئی۔

دس منٹ بعد دروازے کو زور زور سے دھڑ دھڑانے کا شور میرے خواب میں در آیا۔ میں چونک کر تو نہیں، قدرے کبیدہ خاطر ہو کر جاگی۔ میں تھکی ہوئی تھی اور مجھے نیند بہت آ رہی تھی۔ میں سمجھی کہ دروازہ اندر سے بند ہو جانے کی وجہ سے مصطفےٰ باہر رہ گیا ہے۔ میں نے اٹھ کر بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ متین نے لونگ روم کے دروازے سے، جو میرے بالکل سامنے تھا، باہر آ کر سہمے سہمے لہجے میں مجھ سے اندر لوٹ جانے کے لیے کہا۔ میں پیچھے ہٹ گئی مگر دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا۔ میرا تجسس بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے درز میں سے جھانکا۔ دو وردی پوش بریگیڈیئر اینٹھی چال چلتے سامنے گزرتے نظر آئے۔ دوسرے افسر بھی ان سے آملے۔ وہ چاق و چوبند معلوم ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید بھٹو صاحب نے ان فوجی افسروں کو کسی سیاسی معاملے کے سلسلے میں مصطفےٰ سے ملنے بھیجا ہے۔ یہ خیال محض لمحاتی ثابت ہوا۔ اس کے بعد پانچ فوجی جوان آئے۔ ان کے ہاتھ میں اسلحہ استعمال کے لیے بالکل تیار تھا۔ وہ کچھ کر گزرنے پر تلے ہوئے تھے اور خاصے غضب ناک دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا انداز بین طور پر معاندانہ تھا۔ انہوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ان میں سے ایک فوجی کا سایہ میرے

حاملہ وجود پر پڑا۔ سائے نے مڑ کر دیکھا۔ اسے نظر آیا کہ دروازہ ذرا سا کھلا ہے اور روشنی جل رہی ہے۔ اس نے ہوش میں آ کر اور یہ جوش مسلسل مشق کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا، دروازے پر بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھل کر میرے پیٹ میں لگا۔ میں تکلیف کے مارے چیخ گئی۔ میرے پیٹ میں بچے نے لات چلائی۔ میں نے طیش میں آ کر جوابی کارروائی کی۔ دروازہ دھڑ سے بند کر دیا اور بستر پر آ بیٹھی۔ مجھے تشویش نے گھیر لیا۔ کیا یہ فوجی بغاوت ہو سکتی ہے؟ وہی جس کے بارے میں روایتی طور پر مشہور ہے کہ آدھی رات کو دروازے پر دستک ہوتی ہے اور---- یہ 5 جولائی 1977ء کی بات ہے۔

مجھے سب سے پہلے مصطفےٰ کی سلامتی کی فکر ہوئی۔ کیا فوج صرف اسی کو گرفتار کرنے آئی ہے؟ کیا مصطفےٰ نے بھٹو صاحب سے بگاڑ لی ہے؟ دوبارہ؟ یا یہ مارشل لاء ہے؟ دوسرے رہنماؤں کا کیا بنا؟ کیا یہ ڈرامہ ملک کے طول و عرض میں دوسرے گھروں میں کھیلا جا رہا ہے؟ خاموشی۔ لبِ بستر میز پر گھڑی زور زور سے ٹک ٹک کرتی رہی۔ اس کی طرف میرا پہلے کبھی دھیان ہی نہ گیا تھا۔ میں بیٹھی دعائیں مانگتی رہی۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ گھڑی مجھے بولنے نہ دیتی تھی کہ وقت گزر رہا ہے۔

مصطفےٰ اندر آیا۔ وہ بہت پُرسکون تھا۔ سوچ رہا تھا۔ میں تقریباً دیکھ سکتی تھی کہ اس کا ذہن یہ اندازہ لگانے میں مصروف ہے کہ جو امکانات سامنے ہیں ان کی ترتیب کتنی بار اول بدل جا سکتی ہے، صورتحال کا تجزیہ کر رہا ہے اور سوچنے کی کوشش کہ اب کیا چال چلنی ہو گی۔ اس نے مجھے بالکل پُرسکون انداز میں بتایا کہ مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔ فوج بھٹو صاحب کے خلاف حرکت میں آ گئی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کا سوٹ کیس پیک کر دوں۔ "میرے وٹامن رکھنا مت بھولنا..... اور میرے سگار۔" "کیا معاملہ خطرناک رخ اختیار کر سکتا ہے؟" "پتہ نہیں۔ شاید یہ خوں ریز بغاوت ثابت ہو۔ وہ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ بہتر ہو گا تم آج عربی اور صائمہ کے ہاں چلی جاؤ۔ پریشان مت ہو۔" وہ چلا گیا۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے میں مجھے ایک جیپ نظر آئی جس میں فوجی افسر تھے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جیپ میں ممتاز بھٹو اور میرے ایک ماموں عزیز خاں دکھائی دیے۔ مصطفےٰ بیٹھ گیا۔ جیپ زنّاٹے بھرتی روانہ ہوئی۔ میرا شوہر سیاسی قیدی بن چکا تھا۔ جو بریگیڈیئر مصطفےٰ کو جیپ کی طرف لے جا رہا تھا اس کے الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں اس نے اپنی واکی ٹاکی پر کہا تھا۔ "مشن گو گو مکمل ہو گیا۔"

اگلی صبح میں عربی اور صائمہ کے گھر منتقل ہو گئی۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ مصطفےٰ کہاں پر ہے۔ میں بہت پریشان تھی۔ ہم نے ٹیلی وژن پر جنرل ضیاء کی پہلی تقریر نہایت

خود سے سنی۔ اس نے وعدہ کیا کہ نوے دن بعد انتخابات کرا دیے جائیں گے۔ ہمیں اس کے وعدے پر یقین آ گیا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ سیاستدانوں کی جان بخشی ہو گئی ہے۔ پندرہ دن گزر گئے۔ پھر ایک فوجی جوان کی مہربانی سے مصطفیٰ کا لکھا ہوا ایک رقعہ دستی مجھے ملا۔ کم از کم ہمیں اتنا پتہ چل گیا کہ وہ خیریت سے ہے اور اسے ایبٹ آباد میں رکھا گیا ہے۔

فوجی بغاوت بذات خود بچے تلے انداز میں کارروائی کرنے کا کوئی اچھا نمونہ نہ تھی۔ یہ تو "وار کرو اور دوڑ پڑو" قسم کا آپریشن تھا۔ جھٹکے کھا کھا کر تکمیل کی طرف بڑھا تھا اور اس خامی کی طرف سے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ بغاوت کا پلان دوڑتے بھاگتے تیار کیا گیا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ اس کی پہلے سے کوئی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ سیاستدانوں کے خلاف قدم اٹھانے کا اشارہ بظاہر خود جنرلوں کے لیے بھی حیرانی کا باعث ہوا ہو گا۔

کسی کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ مصطفیٰ ہے کہاں۔ مصطفیٰ کی کھوج میں نکلا ہوا فوجی دستہ اس کے بھائی، عربی، کے گھر میں جا گھسا۔ فوجیوں نے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے اور عربی کی بیوی سے اپنے شکار کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ صائمہ کو پتہ تھا کہ مصطفیٰ کہاں ہے لیکن اس نے کچھ بتا کر نہ دیا۔ اس کے بعد بغاوت کرنے والے فوجی رحمانی کھر کے گھر پہنچے۔ انھوں نے ٹیلی فون لائن کاٹ کر باقی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا۔ رحمانی نے افسروں کو بتا دیا کہ مصطفیٰ کہاں ہے۔ تیسری بار قسمت نے ڈھونڈنے والوں کا ساتھ دیا۔ انھوں نے سٹیٹ یونٹ ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا جہاں مصطفیٰ مرے پہلو میں محو خواب تھا۔

ہمارے گن مین متین نے فوجیوں کو نقل و حرکت کرتے دیکھا تو گڑبڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا کہ اس ساری سرگرمی کا مقصد کیا ہے۔ جب اس نے گھر کے چاروں طرف فوجیوں کو اس طرح پوزیشن سنبھالتے دیکھا جیسے وہ آمادہ جنگ ہوں تو فکر مند ہوا۔ تب کہیں اس نے اس آدمی کو جگانے کا فیصلہ کیا جس کی حفاظت پر وہ مامور تھا۔

جونہی مصطفیٰ میرے پہلو سے اٹھ کر متین کے پیچھے پیچھے بیڈروم سے باہر گیا تو فون بجا۔ بھٹو صاحب بول رہے تھے۔ "مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے" گھبرائی ہوئی آواز نے کہا۔ "مجھے گھر پر نظر بند کر دیا گیا ہے۔ تم سے بات کرنی ضروری ہو گئی ہے۔ میا ــــ" آواز یک لخت غائب ہو گئی۔ ایک منٹ بعد فون پھر بجا۔ بھٹو صاحب اپنے "سبز فون" سے کال کر رہے تھے۔ "ضرورت ہے کہ ہم بات ــــ ایک بار پھر گفتگو ادھوری رہ

گئی۔ مصطفیٰ کان لگائے رہا۔ ڈائل ٹون بھی باقی نہ رہی۔ ہماری ٹیلی فون لائن کاٹ دی گئی تھی۔

بغاوت کے حوالے سے ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی کہانی تھی۔ حفیظ پیرزادہ کسی کو فون کر رہا تھا۔ یکایک اسے مسلح فوجیوں نے گھیر لیا۔ اسے بڑا تاؤ آیا۔ "تم غلط گھر میں آ گئے ہو۔ تمھیں پتہ نہیں میں حفیظ پیرزادہ ہوں۔ میں حکومت میں ہوں۔ حزب اختلاف کا رکن نہیں۔ لعنت ہو تم پر۔" جب افسر نے اسے بتایا کہ کیا ہو گیا ہے تو وہ سنتا تو رہا لیکن چہرے کی کیفیت کہے دیتی تھی کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ "جناب، آپ زیرِ حراست ہیں۔" اسے گھر سے باہر لے جایا گیا۔ حفیظ کو فون بند کرنا بھی یاد نہ رہا۔

سیاستدان زبنی جبری۔ بے شغلی سے نمٹنا سیکھتے جا رہے تھے۔ مقامی پریس کے ایک کارٹون میں ممتاز، حفیظ اور مصطفیٰ کو ایبٹ آباد کے ایک گھر میں ساتھ دکھا گیا۔ ممتاز سگار پی رہا تھا، حفیظ سویا پڑا تھا اور مصطفیٰ یوگا کے جانے پہچانے آسن میں سر کے بل کھڑا تھا۔ میرے دل کو قرار آ گیا۔ سونی دیواروں اور گولی سے اڑا دینے والے دستوں کے جو منظر میری آنکھوں میں گھومتے رہتے تھے اڑن چھو ہو گئے۔

جنرل ضیاء نے سیاست دانوں سے کہا تھا کہ انھیں تحفظ دینے کی خاطر حراست میں رکھا جا رہا ہے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ انتخابات سے پہلے تھوڑا سا وقفہ نہایت لازمی ہے تاکہ جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں۔ اس نے انھیں مری چلتا کر دیا۔ بھٹو صاحب کو بھی اسی ہل سٹیشن میں رکھا گیا۔ ممتاز، حفیظ، مصطفیٰ، جنرل ٹکا خاں اور شیخ رشید ایک ساتھ محبوس تھے۔ زچہ خانے میں میرے محبوس ہونے میں دو ہفتے رہ گئے تھے۔

مصطفیٰ اور باقی لوگ جن حالات میں دن بسر کر رہے تھے، عام آدمی ان پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ مینو کا تعین وہ آپ کرتے۔ باوردی بیرے انھیں کھانا کھلاتے۔ ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ بس ان کی رہائش گاہ کے باہر مارچ کرتے بوٹوں کی کھٹ کھٹ، مداخلت بے جا بن کر، اس ظاہری امن و سکون اور گھر جیسے آرام کی فضا میں کھنڈت ڈالتی رہتی تھی۔

جو سیاست دان کل تک ہماری قوم کی تقدیر پھینٹنے میں مصروف تھے اب بیٹھے تاش کھیلتے نظر آتے۔ انھیں پوائنٹس بنانے یا رقم جیتنے سے غرض نہ تھی بلکہ ہارنے والے کو سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ جو ہار جاتا اسے ڈنڈ پیلنے پڑتے۔ یہ پہلے سے طے کر لیا جاتا تھا کہ جو ہارے گا اسے کتنے ڈنڈ نکالنے پڑیں گے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی جب میں نے حفیظ پیرزادہ کو، جس نے ہمارا آئین مرتب کیا تھا، ڈنڈ پیلتے ہوئے ہانپتے پھنکارتے دیکھا ــــ کہاں اصلاحِ متن، کہاں تعزیرِ تن۔

میں مری منتقل ہو گئی۔ تاج الملک اور ان کی بیوی نے میری میزبانی کی۔ سعدیہ پیرزادہ بھی ملنے آ جاتی۔ میں سارا دن مصطفیٰ کے ساتھ گزار کر شام کو چھ بجے گھر لوٹتی۔

اخباروں کو پی پی پی کے بارے میں کہانیاں فراہم کی جارہی تھیں۔ بھٹو صاحب کے منہ پر کالک ملنے کی مہم شروع ہو چکی تھی۔ ضیاءالحق قوم کو تیار کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب اپنے سب سے بڑے دشمن کو بالآخر ٹھکانے لگائے تو کسی کی آنکھ آنسوؤں سے تر نظر نہ آئے۔ میں نے ایک خبر پڑھی جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ حفیظ پیرزادہ نے مصطفیٰ کھر کو قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی۔ میں دہل کر رہ گئی۔ مصطفیٰ سے ملنے گئی تو وہ ممتاز بھٹو کے بستر پر بیٹھا ہوا ملا۔ وہ اکیلا نہ تھا۔ حفیظ اس کے ساتھ تھا۔ وہی اخبار دونوں کے پاس پڑا تھا۔ مجھے کسی کل چین نہ تھا۔ جونہی مصطفیٰ سے علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیا پڑھ کر آئی ہوں۔ "کیا یہ خبر تمہاری نظر سے نہیں گزری؟" "تو پھر؟" "یہ بے معنی ہے۔" میں نے کوریڈور میں فوجی بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنی۔ میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

حفیظ ان لوگوں میں سے تھا جو خیالی رنگ رلیوں ہی سے دل خوش کر لیتے ہیں۔ اب وہ بھی پر پرزے نکالنے لگا۔ اسے ثمینہ نامی ایک نوجوان فزیکل انسٹرکٹر سے محبت ہو گئی۔ وہ ثمینہ کے لیے ترس رہا تھا اور کہتا تھا کہ قید سے چھوٹتے ہی اس سے شادی کر لے گا۔ مصطفیٰ حفیظ کو چھیڑتا رہتا۔ کہتا کہ حفیظ میں اتنا حوصلہ ہی نہیں کہ سعدیہ اور بچوں سے رشتہ توڑ سکے۔ حفیظ کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے مصطفیٰ سے کہا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے کہے کو پورا کر دکھائے گا۔

جو شوہر بیک وقت دو دو جگہ آنکھ لڑا رہے ہوں ان کی بیویاں اکثر ان کے ہرجائی پن کا پتہ چلا لیتی ہیں۔ حفیظ کے معاملے میں بھی کوئی استثنا نہ ہوا۔ بدقسمتی سے وہ معشوقہ کو بھی چکر دے رہا تھا۔ اس نے بھی حفیظ کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

حفیظ نے ثمینہ کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں کہا کہ وہ اس کی خاطر ساری خدائی کو تج دے گا۔ اس نے لکھا کہ تمہارے لیے میرا عشق امر ہے

اس کے بعد احساسِ جرم نے ستایا۔ اس نے سوچا کہ اس احساس کا کسی حد تک ازالہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک خط بیوی کو بھی لکھ ڈالا۔

دونوں خط بند کر کے ان پر پتے لکھے اور انہیں ایک فوجی جوان کے حوالے کر دیا جس نے انہیں پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اس نے خط پہنچا دیے لیکن غلط پتوں پر۔ قیامت برپا ہو گئی۔ حفیظ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ فوج نے ایک بار پھر اس کی زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

ہر روز ساڑھے چھ بجے محبوس سیاستدانوں کو سوزوکی وین میں بٹھا کر بھٹو صاحب سے ملانے لے جایا جاتا۔ وہاں یہ رہنما بیٹھ کر اپنی چھوٹی موٹی پرانی علتوں، موجودہ معاملات اور مستقبل کی پالیسیوں پر تبادلۂ خیال کرتے۔ ضیاء نے جو کچھ کیا تھا بھٹو صاحب اس پر بہت برہم تھے۔ ان کے تکبر میں فرق نہ آیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جنرل بڑی ٹیڑھی وکٹ پر کھیلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بھٹو صاحب کے خیال میں جنرل ان کے ساتھ جو "بہت اہم شخصیت" والا سلوک کر رہے تھے اس کی کوئی اور وجہ نہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ جنرل ان کی رسی خاصی دراز کرتے جا رہے ہیں تاکہ پایانِ کار یہی رسی سچ مچ ان کے گلے کا پھندا بن جائے۔

بھٹو صاحب اپنا دربار لگاتے۔ انہوں نے ابھی وزیراعظم والی آن بان کو چھوڑا نہ تھا۔ احتیاط سے ذرا کام نہ لیتے تھے۔ جنرلوں کو برملا گالیاں دیتے اور ان پر غداری کا الزام لگاتے۔ انہوں نے قسم کھائی کہ انتقام لے کر رہیں گے اور اقتدار پر دوبارہ فائز ہونے کے بعد جنرلوں کی اچھی طرح خبر لیں گے۔ ان کے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ بھٹو صاحب کوتاہ اندیشی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بظاہر گھر میں جاسوسی کے آلات نصب تھے۔ جنرل اندازہ لگا رہے تھے کہ بھٹو صاحب کے ارادے کیا ہیں۔ جب انہوں نے ٹیپ کی ہوئی بات چیت دوبارہ سنی ہوگی تو یقیناً ان پر خوف غالب آگیا ہوگا۔ ٹیپ کی چرخیوں کے گھومنے کے ساتھ ساتھ ان کا یہ یقین واثق ہوتا گیا ہوگا کہ بھٹو صاحب کو جسمانی طور پر ختم کرنا پڑے گا۔

مصطفیٰ نے بھٹو صاحب کو خبردار کیا۔ انہوں نے انتباہ پر کان نہ دھرا۔ جنرلوں نے آئین میں تحریف کی ہے۔ آرٹیکل چھ میں فوجی طالع آزماؤں کے بارے میں کوئی ابہام نہ تھا۔ اس آرٹیکل کی رُو سے مارشل لاء خلافِ قانون قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کرنا اپنی شامت کو آپ دعوت دینے کے مترادف تھا۔ بھٹو صاحب ٹھہرے وکیل، قانونی نکتوں سے چمٹے رہے۔ وہ بھول گئے کہ سیاست میں طاقت کیا معنی رکھتی ہے۔ انہوں نے یہ غلطی اس وقت بھی دہرائی جب وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر قانونی نکتوں کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔ توپیں بندوقیں جنرلوں کے پاس تھیں۔ قانون تو ایک اڑیل ٹٹو ہے جسے جی چاہے تو گاجر دکھا کر پھسلا لو جی چاہے تو ڈنڈا دکھا کر دھمکا لو۔

بھٹو صاحب کے لعن طعن کا واحد نشانہ فوج نہ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی سخت سست کہتے رہتے تھے۔ ان پر بدعنوانی اور اقربا پروری کا الزام لگاتے۔ انہوں نے ہر ایک کی چن چن کر خبر لی اور جس خیمے میں وہ اس وقت پھنسے ہوئے تھے اس کے لیے فرداً

فوراً انہیں قصور وار ٹھہرایا۔ ممتاز پر بدعنوانی اور ہر طرح سے اپنا الو سیدھا کرنے کا الزام لگایا شیخ رشید پر "جینز ک دوائی" کے حوالے سے نزلہ گرا۔ حفیظ کو رنگیلے شاہ بنے پھرنے پر لتاڑا گیا۔ سیاستدان دو ایک دن تو اس زبانی چابک زنی کو سہتے رہے۔ اس کے بعد ممتاز نے فیصلہ کیا کہ بس بہت ہو گیا۔

اگلے دن اس نے بھٹو صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے ساتھی قیدیوں سے کہا کہ بھٹو صاحب سے کہہ دیں کہ وہ علیل ہے۔ گو بھٹو صاحب اقتدار سے الگ ہو چکے تھے۔ لیکن اصل وجہ کو ان سے پھر بھی چھپانا پڑتا تھا۔

بعض اوقات بھٹو صاحب زیادہ خوشگوار موڈ میں ہوتے اور مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے۔ وہ انہیں بتاتے کہ اگلے سال ان کے لیے کتنے اہم ہیں۔ کس طرح انھوں نے یہ امید کی تھی کہ وہ ان اصلاحات کو مستحکم اور نافذ کریں گے جن کی بدولت تاریخ میں ان کا ایک اعلیٰ مقام یقینی ہو جائے گا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ جنرلوں نے ان کے ساتھ ہاتھ کیا ہے۔ ابھی وہ پوری طرح اڑنے نہ پائے تھے کہ پر قینچ کر دیے گئے۔ ایک تقدیر ساز شخصیت جس پر خود اس کے مستقبل کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔

میں محسوس کر سکتی تھی کہ وضع حمل کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ میں مری میں ڈاکٹر کے پاس گئی جس نے مجھے بتایا کہ شہر میں سول اینڈ ملٹری ہسپتالوں میں زچگی کے لیے کوئی سہولتیں موجود نہیں۔ میں ششدر رہ گئی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں حیران ہوتی رہی کہ مری میں عورتیں بچہ جننے کے لیے کہاں جاتی ہیں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میدانی علاقے کو لوٹ کر دردیں شروع ہونے کا انتظار کروں۔

تین دن بعد گھر پر ایک بہت بڑی کالی لیموزین آ کر رکی جس پر فوجی لائسنس پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مصطفیٰ مسکراتا ہوا کار سے باہر آیا۔ ہم سب بالکل ہک دک رہ گئے۔ میں اس سے مل کر خوش ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی کے پاس آنے کے لیے جنرلوں سے خصوصی اجازت حاصل کی تھی۔ وہ جنرل ضیاء سے ملا تھا اور اس سے بات چیت کر چکا تھا۔ اس نے رات میرے پاس گزاری اور علی الصبح آرمی کی کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔

میرے پاس مصطفیٰ کی آمد سے بھٹو صاحب سمیت اس کے ساتھ قیدیوں کے ذہنوں میں سخت شبہات پیدا ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ مصطفیٰ کو جنرل ساتھ لے گئے ہیں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے پیٹھ پیچھے کوئی سودے بازی ہو رہی ہے۔ جنرلوں نے اس شبے کو ہوا دینے کے لیے مصطفیٰ کو اگلے چند دن تک راولپنڈی میں روکے رکھا۔

انھوں نے اسے باقیوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ مصطفیٰ ان کا آلہ کار معلوم ہونے لگا۔ اس نے مجھ سے ملنے کی درخواست بالکل بھولپن میں کی تھی۔ اسے یہ خیال تک نہ آیا مگر اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ جنرلوں کو معلوم تھا کہ اگر وہ مصطفیٰ سے اکیلے میں ملیں گے تو اس کی شہرت داغدار ہو جائے گی۔ جنرلوں کو اچھی طرح علم تھا کہ سیاستدان انہیں کتنی حقارت سے دیکھتے ہیں۔

دو دن بعد جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب اور دوسرے سیاستدانوں کو رہا کر دیا۔ بھٹو صاحب بذریعہ ہیلی کوپٹر اسلام آباد چلے گئے۔ مصطفیٰ گھر آ گیا۔ مجھے دردِ زہ شروع ہوا اور نصیبہ، اپنے والد کی رہائی کے چند روز بعد 29 جولائی 1977ء کو پیدا ہوئی۔

ہم لاہور چلے آئے۔

نصیبہ، جو چند دن کی تھی، ہمارے بستر پر سوتی تھی۔ مصطفیٰ نے اسے سر پر پکی مٹی کا بنا ہوا نیم مدور گھیرا پہنا دیا۔ کہنے لگا کہ اس طرح نصیبہ کا سر چپٹا رہے گا۔ اس پرانے، ازمنۂ وسطیٰ کے طریقے کی طبی نقطۂ نظر سے کوئی تک نہ تھی۔ مصطفیٰ اسے پہنائے رکھنے پر مصر تھا۔ نصیبہ کو اس عجیب و غریب اور بندش گورکھ دھندے کی وجہ سے بڑی بے آرامی محسوس ہوتی۔ وہ کروٹ تک نہ لے سکتی۔ ساری رات روتی رہتی۔ اس کے سر کے گرد یہ گھیرا بہت تنگ تھا۔ بچی کے سر کو چپٹا رکھنے کے لیے اس اول جلول اور پسماندہ طریقے پر مجھے کوئی اعتماد نہ تھا۔

میں چاہتی تھی کہ میری بچی پیٹ کے بل لیٹے تاکہ اسے دودھ پیتے وقت اُچھو نہ لگے۔ مصطفیٰ مشہور ماہرِ اطفال، ڈاکٹر سپوک، بننے پر بضد تھا۔ مجھے یہ بھی اجازت نہ تھی کہ نصیبہ کو گود میں اٹھاؤں۔ بچی کا چہرہ اضطراب کے مارے اودا پڑ گیا تھا۔ نصیبہ کی باؤ ہُو سے مصطفیٰ کے آرام میں خلل پڑتا۔ وہ اسے زبردستی چپ کرانے کے درپے ہو جاتا۔

میں بہت خوف زدہ ہوئی۔ میں ملازموں کی زبانی سن چکی تھی کہ وہ شیری کی بیٹی، آمنہ، کے ساتھ کس طرح پیش آیا کرتا تھا۔ اگر بیچاری بچی اس وقت رونے لگتی جب اس کے والدین سوئے ہوتے تو مصطفیٰ اُسے اٹھا کر پلنگ کے نیچے دھکیل دیتا۔ اسے صرف اپنے ذہنی سکون سے غرض تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بچی کے واویلے کو روکنے کے لیے اس نے بچی کے منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ دیا۔ اس بات کے خیال ہی سے دل میں ہول اٹھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص تو بڑی آسانی سے میری بچی کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔ اب ایک اور جان کی حفاظت بھی میرے گلے پڑ گئی۔ خود اپنا بچاؤ کرنا ہی خاصا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ بچی کی حفاظت کی خاطر میں پہلے سے بھی زیادہ مصلحت آمیز رویہ اختیار

کرنے پر مجبور ہو گئی۔ نصیبہ کی وجہ سے میرے تناؤ میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس میں بچی کا اپنا کوئی قصور نہ تھا۔

میری شادی میں بہیمیت کا جو عنصر راہ پا گیا تھا اسے مجھے اپنے خاندان سے چھپائے رکھنا پڑا۔ امی ہمارے پاس مقیم تھیں۔ وہ لندن سے خاص طور پر اس لیے آئی تھیں کہ نصیبہ کی ولادت کے وقت میرے پاس موجود رہیں۔ معاشرے کے جس طبقے سے امی کا تعلق تھا اس کے افراد ان کے داماد سے رسم و راہ بڑھانے کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مصطفیٰ، جسے عورت بازی کی لت تھی، اس قابل نہیں تھا کہ معزز لوگ اسے منہ لگائیں۔ مجھے یاد ہے کہ امی کی ایک سہیلی ان سے ملنے کے لیے مصطفیٰ کے گھر آنے کو تیار نہ ہوئی۔ امی بھی اڑ گئیں۔ انہوں نے سہیلی کے گھر جانے سے انکار کر دیا۔ مصطفیٰ کو معاشرے میں باعزت مقام دلانے کی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ گورنر یا وزیراعلیٰ کے عہدے اور ان سے وابستہ اقتدار اسے ہمارے طبقے کی نظر میں محترم نہ بنا سکے تھے۔ اب چونکہ مصطفیٰ ان کا داماد بن چکا تھا اس لیے امی اصلاح احوال کی خواہاں تھیں۔

ہمارے تعلقات کو تشدد کسی اٹل مرض کی طرح چمٹ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ امی کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ میرا گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

میری بچی کی پیدائش کے تین دن بعد مصطفیٰ کے اندر چھپے حیوان کو پھر جنون چڑھا۔ اسے میری صحت کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ تھی۔ وہ کسی غضب آلود حیوان سے مشابہ تھا۔ میرے احساسات غیر اہم تھے۔ میرا احتجاج اسے مزید تشدد کرنے پر اکساتا تھا۔ اسے روکنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس نے لحاظ اور رحم کو بالائے طاق رکھا اور میرے جذبات کو پرکاہ بھی نہ جانا۔ اس غصے بھرے وقتی ابال سے اسے لذت ملی، میرے حصے میں اذیت آئی۔ میں غسل خانے کا دروازہ مقفل کر کے چپ چاپ روتی رہی مبادہ وہ میری آواز سن لے۔

امی کو نواب صادق حسین قریشی کے گھر ایک ڈنر پر مدعو کیا گیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ میں نے مصطفیٰ سے پوچھا کہ چلی جاؤں۔ ڈنر خواتین کے لیے تھا۔ اس لیے وہ شریک نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے جھنجلا کر اجازت تو دے دی لیکن کہا کہ یہ آخری بار ہے۔ آئندہ اجازت نہیں ملے گی۔ میں نے کپڑے بدلے۔ شادی کے بعد میں پہلی بار اس کے بغیر کہیں جا رہی تھی۔ مصطفیٰ نے کہا کہ رات کو ہر حالت میں ٹھیک ساڑھے دس بجے واپس آنا ہو گا۔ وقت کی پابندی تھوڑی سی نرم کرانے کے لیے میں نے کچھ بحث کرنی چاہی۔ اس نے میری ایک، نہ سنی۔

میری ساری شام تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلاک کی طرف دیکھنے میں گزری جو ڈراؤنے انداز میں وقت کو کتر کتر کر کم کیے جا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ امی کو میری اضطراب کا پتہ چلے۔ ڈنر ساڑھے دس بجے پیش کیا گیا۔ امی کو کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ یہ دیکھ ہی نہ سکیں کہ بدحواسی کے مارے میرے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ساڑھے دس بجے مصطفیٰ کا فون آیا۔ "اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر گھر نہ پہنچیں تو میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔" میں سہم گئی۔ میں امی سے کہتی رہی کہ مجھے گھر پہنچنا ہے۔ یہ بہانہ بنانا تو ممکن نہ تھا کہ نصیبہ کو دودھ پلانا ہے۔ نصیبہ میرے ساتھ تھی۔ امی کسی گفتگو میں منہمک تھیں۔ وہ میری "چلیے، چلیے" کی رٹ کو خاطر میں نہ لائیں۔

ہم گھر پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ امی اپنے بیڈروم میں چلی گئیں۔ میں "مبل تو جلل تو۔۔" کا ورد کرتی گھسٹتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ مصطفیٰ میرا منتظر تھا۔ اس نے نصیبہ کو میری بانہوں سے چھین کر بستر پر پھینک دیا اور مجھے مارنے لگا۔ ساتھ کے کمرے میں امی تھیں۔ میں اپنی چیخوں کو ضبط کرتی رہی۔ جب مجھ پر مکوں تھپڑوں کی بارش ہو رہی تھی تو میں نے خود کو صرف دبی دبی سسکیاں لینے پر مجبور پایا۔ "امی سن لیں گی۔" "اوپر چلو" اس نے دھکاتے ہوئے کہا۔

میں نے نصیبہ کو اٹھایا جو گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا ہوا مجھے اوپر اذیت خانے کی طرف لے چلا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ دو ہفتے کی بچی نے خطرے کی بو سونگھ لی۔ اس نے بچی کو میری بانہوں سے چھین لیا اور ایک حواس باختہ بچی کی مسلسل چیخ پکار کی دھن پر مجھے دھنتا شروع کر دیا۔ میری ساڑھی لیرلیر ہو گئی۔ مجھے چیخنے چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ میری بچی کی چیخوں نے میری چیخ پکار کی کمی پوری کر دی۔

اگلی صبح میں امی کے سامنے اس طرح آئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں دنیا سے اپنے احساسات اور اپنی چوٹوں کے نشان چھپانا سیکھتی جا رہی تھی۔

بھٹو صاحب نے اپنا مقدمہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہی عوام جنہیں بھٹو صاحب خطابت کے جوہر دکھا کر، گویا جادو کے زور سے، منظر عام پر لے آئے تھے اور جو ان کے دیے ہوئے ایک نعرے کی وجہ سے روٹی، کپڑے اور مکان کے خواب دیکھنے لگے تھے، وہ خاک بسر جو دھول جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، جنہوں نے بھٹو صاحب کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ بھٹو صاحب لاہور پہنچے، کار پر سوار جسے مصطفیٰ چلا رہا تھا۔ پرانے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ جو ہجوم ان کے جلسوں سے دور دور رہنے لگا تھا، جو کبیدہ خاطر اور بیگانہ ہو گیا تھا، اب اچانک سامنے آ گیا۔ ہجوم میں جوش و خروش کی لہر

دوڑ رہی تھی۔ ظلم رسیدہ کو سینے سے لگانے والا لیکن وزیراعظم سے بے اعتنائی برتنے والا ہجوم۔ اس ہجوم میں ایسے چہرے بھی تھے جو بھٹو صاحب کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، جنھوں نے ان کے دشمنوں سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اب وہ سب بھٹو صاحب کی واپسی پر انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے جمع تھے۔ تقریباً ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے بھٹو صاحب کی ساری غلطیاں معاف کر دی ہیں۔ وہ اپنی بے اعتنائی سے بھٹو صاحب کو کالی سزا دے چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بھٹو صاحب واپس آ کر ان کی سپاٹ اور بے کیف زندگیوں میں تھوڑا سا رنگ گھول دیں۔ اگر بھٹو صاحب کو دیکھ کر ہجوم مسرور ہو گیا تھا تو ہجوم پر نظر ڈال کر خود بھٹو صاحب کے رگ و پے میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ وہ خوشی اور فخر سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ان کے عوام لوٹ آئے تھے۔ وہ متحد ہو کر غاصب کو نکال باہر کر دیں گے۔ وہ متحد ہو کر ضیاء پر مقدمہ چلائیں گے اور اسے سزا دیں گے۔ فضا میں گویا جلی حروف میں تحریر تھا۔ "ہم نے تمھاری کمی صرف اس وقت محسوس کی جب تم ہمیں چھوڑ گئے۔"

بھٹو صاحب کا کار جلوس جوں کی چال چلتا نواب صادق حسین قریشی کے گھر کی طرف رینگتا رہا۔ ٹھاٹھیں مارتا ہجوم آمر کے حق میں بدترین ڈراؤنا خواب بن گیا۔ لوگ اپنے قائد کے قریب ہونا چاہتے تھے۔ انھوں نے گھر کے پھاٹک توڑ دیے، کھڑکیاں چُور چُور کر دیں، دیواروں پر چڑھ گئے، لانوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ چھوڑی، درختوں کی پھننگوں پر ڈیرے ڈال دیے، خطرناک انداز میں بجلی کے کھمبوں سے چمٹے رہے۔ انھوں نے اپنے قائد کی جھلک دیکھ لی۔ وہ اس آواز کو دوبارہ سننے کے خواہاں تھے جسے خاموش کر دیا گیا تھا۔ اپنے جوش و خروش میں انھیں نتائج کی پروا نہ رہی۔ انھیں یہ پتہ نہ چلا کہ اس دن انھوں نے بھٹو صاحب کے موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔

بھٹو صاحب بالکنی میں نمودار ہوئے۔ وہ خود کو محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ "ان کا قد ہمالیہ کو چھو رہا تھا۔" جنرل بالشتیے تھے۔ انھوں نے ولولہ خیز تقریر کی۔ "جنرل ضیاء غداری کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے آئین میں تحریف کی ہے۔ پاکستان کے عوام غدار کو نہیں بخشیں گے۔ فوج کو کوئی حق نہیں کہ عوامی نمائندوں کو برطرف اور منتخب وزیراعظم کو معزول کر کے غاصبانہ انداز میں اقتدار پر قبضہ جما لے۔" یہ سرمستی جلد ہی ہوا میں تحلیل ہونے کو تھی۔ ٹینک اور توپیں منشائے عوام سے زیادہ حقیقی ثابت ہوئیں۔

بھٹو صاحب اسلام آباد پہنچے اور پیر آف مکھڈ کے ہاں رہنے لگے۔ مصطفےٰ اور میں جتوئی صاحب کے گھر اٹھ آئے۔ مصطفےٰ بھٹو صاحب سے ملنے گیا تو انھیں کھچا کھچا اور سردمہر پایا۔ مصطفےٰ نے انھیں بتایا کہ جنرلوں کے ساتھ ملاقات میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس نے کہا کہ جنرل بھٹو صاحب کو جسمانی طور پر ختم کرنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ بھٹو صاحب کو بخشیں گے نہیں۔ اس نے سمجھا بجھا کر بھٹو صاحب کو اپنا سخت گیر موقف بدلنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ اقتدار جنرلوں کے پاس تھا۔

بھٹو صاحب قائل نہ ہوئے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ انھوں نے دوبدو مقابلہ کرنے کا جو انداز اپنایا ہے اس سے جنرلوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اگر اس مرحلے پر کوئی کمزوری دکھائی گئی تو صرف فوج کی طاقت میں اضافہ ہو گا۔ حفیظ کو یقین تھا کہ عوام اپنے قائد کو بچانے کے لیے سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ انھیں آراء کا قلب رہا۔ مصطفےٰ جانتا تھا کہ جس کے پاس توپ و تفنگ ہے وہی اقتدار کی جنگ جیتے گا۔ یہ سوچنا کہ لوگ اچانک اور خود بخود بغاوت کر دیں گے غیر حقیقی خیالوں میں گم رہنے کے مترادف تھا۔ حفیظ پرچھائیوں کے پیچھے بھاگا پھر رہا تھا۔ اس نے غلطی سے عوامی تجسس کو عوامی حمایت سمجھ لیا تھا۔ مصطفےٰ نے اپنے موقف کی وکالت آپ کی اور بھٹو صاحب سے کہا کہ وہ اسے جنرل ضیاء سے دوبارہ ملنے کی اجازت دیں تاکہ وہ ازسرنو اندازہ لگا سکے کہ جنرل کیا سوچ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نے یہ درخواست منظور کر لی۔

ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ جنرل ضیاء، جنرل عارف اور جنرل چشتی مصطفےٰ سے ملے۔ انھوں نے مصطفےٰ کو سراہا اور کہا کہ انھیں پنجاب میں اسی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ وہ بھٹو صاحب سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کے تکبر کو تھوڑا سا زائل کرنے کی اگر ضرورت پیش آئی تو زبردستی سے کام لینا ہو گا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کی بقا کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے موقف کی تصحیح کر لیں۔ بھٹو صاحب سمجھتے تھے کہ اپنے موقف سے ذرا بھی ہٹنا سیاسی خودکشی کے برابر ہو گا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خودکشی کر لیں گے لیکن اپنے سیاسی ورثے کو داؤ پر نہیں لگائیں گے۔

اس ملاقات کے دوران مصطفےٰ کو بتایا گیا کہ بھٹو صاحب کو اگر جلاوطن ہونے کا خیال آئے تو جنرل اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ وہ صرف ایک ہی ضمانت چاہتے تھے۔ وہ یہ کہ بھٹو صاحب سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی آدمی سے کہا جائے کہ زندہ رہو لیکن آکسیجن کے بغیر زندہ رہنا ہو گا۔

مصطفےٰ نے بھٹو صاحب سے مل کر جنرلوں سے ملاقات کی روداد بیان کی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ جنرل اسے سرکاری گواہ کے طور پر استعمال کریں گے۔ وہ بھٹو صاحب سے بے وفائی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بھٹو صاحب سے کہا کہ وہ اسے ملک سے باہر

جانے کی اجازت دے دیں۔ اس نے اپنے قائد کی بھی منت کی کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ملک سے فرار ہو جائیں۔ بھٹو صاحب صورتحال کی سنگینی کو سمجھ تو گئے لیکن جانتے تھے کہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکے ہیں۔ وہ فرار نہ ہو سکتے تھے۔ انھیں یہیں رہ کر اپنی جنگ لڑنی ہو گی۔ ان کے سامنے عمل کی بہت کم راہیں باقی رہ گئی تھیں۔ انھوں نے متحدہ عرب امارات کے سفیر کو طلب کر کے اس کا مصطفےٰ سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد انھوں نے شیخ زید کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں مصطفےٰ کو "میرا بھائی" کہہ کر متعارف کرایا گیا۔ انھوں نے ابوظہبی کے حکمراں سے کہا کہ مصطفےٰ کو ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔ اس ملاقات کے وقت بھٹو صاحب کا معتبر خدمتگار، نورا، بھی موجود تھا۔

اس کے بعد جلد ہی بھٹو صاحب کو ایک قتل کے الزام میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ جنرلوں پر ہراس طاری ہو گیا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے عدالتی قتل کا منصوبہ گانٹھ رہے تھے۔

ہم لاہور میں تھے۔ مصطفےٰ جنرلوں سے ایک اور ملاقات کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنرل چشتی اور جنرل راؤ فرمان علی سے اس کا مسلسل رابطہ تھا۔

ہم ایک شادی پر گئے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے مصطفےٰ کے پاس آ کر اسے جنرلوں کا خفیہ پیغام پہنچایا۔ مصطفےٰ اور میں گھر چلے آئے اور مصطفےٰ نے جنرل چشتی سے بات کی۔ پھر اس نے کہا کہ ہمیں نصیبہ کو چھوڑ کر فوراً اسلام آباد جانا پڑے گا۔ وہاں سے ہمیں لندن روانہ ہونا تھا۔

ہم کار کے ذریعے اسلام آباد پہنچے۔ دارالحکومت میں بے مقصد اِدھر اُدھر گھوم کر وقت گزارا۔ ہم کسی کو نہ بتا سکتے تھے کہ ہم پرواز کرنے والے ہیں اور ہماری منزل جلاوطنی ہے۔ یہ اکتوبر 1977ء کی بات ہے۔ عید کا دن تھا۔ لندن جاتے ہوئے ہم عمرہ کرنے مکہ معظمہ رکے۔ مصطفےٰ نے خانہ کعبہ کو ہاتھ لگا کر قسم کھائی کہ وہ باقی زندگی کسی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔

باب - ۷

دیکھا جو تیر کھا کے ....

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جو ذہن شہری ماحول کا پروردہ ہو اس کا کسی جاگیردار سے واسطہ صرف رومانی ناولوں میں پڑ سکتا ہے۔ ان کی جنھوں نے نوجوانی میں تازہ تازہ قدم رکھا ہو ملز اینڈ بُون کے جعلی، زرے گتے کے بنے کرداروں کے قصے اور جیارجیٹ ہیئر کے سرور انگیز حقیقیہ رومان پڑھ کر بڑا لطف آتا ہے۔ جاگیردار سائیں کسی اور دنیا کی ہستی معلوم ہوتا ہے۔ بالعموم اسے قد آور، سانولا اور خوبرُو دکھایا جاتا ہے جس کی آنکھیں چمکتی رہتی ہیں اور رگوں میں جیسی لہو کی خفیف سی آمیزش شامل ہوتی ہے۔ اس کا غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے اور وہ بڑے جوشیلے انداز میں پیار کرتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ان ہیروؤں کی مثالی تصویر بن کر سامنے آتا ہے جو عورتوں کو کوئی گھٹیا مخلوق سمجھتے ہیں۔ وہ عورتوں سے ناروا سلوک کرتا ہے اور اس کے باوجود عورتیں اسے دل دیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ جاگیردار کی بیروانہ اکڑفوں سے متاثر ہو کر ہیروئن اس کے دام میں پھنس جاتی ہے۔ نوخیز قارئین کے دل یہ دیکھ کر دھک دھک کرتے رہتے ہیں کہ خونخوار ترین شمشیرزنوں کی اس کے سامنے ایک نہیں چلتی، وہ ان کے وار خالی دینے میں ماہر ہے اور ہر بار اپنے مشکی رہوار پر سوار شفقِ شام میں یوں اتر جاتا ہے جیسے دنیا میں اس کا بس ایک مشغلہ ہو۔ حقیقت کہیں زیادہ معمولی اور بے رنگ ہے۔

مصطفےٰ کھر کا تعلق پنجاب کے کھرل قبیلے سے ہے۔ یہ اصل میں راجپوت تھے۔ اب

خود کو جاٹ کہتے ہیں۔ راجپوت کھرل مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ پنجاب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کی بڑی بڑی آبادیاں جالندھر، ساہیوال، بہاولپور اور ملتان کے اردگرد ہیں۔ وہ راوی کے دوآبے میں یعنی جہاں راوی اور چناب کا سنگم واقع ہے وہاں سے ساہیوال اور لاہور کی درمیانی حد تک بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ کھرل دو بڑے گروہوں، وڈے راوی قبائل اور کچے راوی قبائل میں منقسم ہیں۔ اول الذکر کا صدر مقام کوٹ کمالیا ہے۔ تاریخی طور پر دونوں قبیلوں میں ہمیشہ سے چلتی آئی ہے۔ ان میں صرف ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں کو جھنگ کے سیالوں سے نفرت ہے۔

کھرل قبیلے کی شہرت ہمیشہ شورش پسندی کے حوالے سے رہی ہے۔ وہ اپنا شجرہ نسب بھوپا سے ملاتے ہیں، جو خود راجہ کرن کے اخلاف میں سے تھا۔ وہ اچ شریف میں آباد ہوا اور وہاں مخدوم شاہ جہانیاں کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا۔

ایلفنسٹن نے آبادکاری کے بارے میں اپنی رپورٹ میں کھرلوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ان کے بارے میں ہمیشہ سے یہ مشہور ہے کہ مصائب سہنے اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے میں، کھاتیوں کے سوا، ان کا کوئی ثانی نہیں۔ لیکن جس علاقے میں وہ آباد ہیں وہ زیرکاشت رقبے میں تیزرفتار توسیع کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس چیز سے خالی ہوتا جا رہا ہے جو ان کے لیے سب سے زیادہ تقویت کا باعث تھی۔ میری مراد گھنے جنگل سے ہے۔ لہٰذا ماضیٔ قریب تر میں، شورش برپا ہونے کے بعد، بڑی تعداد میں فوج آتے ہی، وہ اپنا علاقہ خالی کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور یوں اپنے قریوں کی تاراجی سے انہیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ ان کے سب سے نامور رہنما، احمد خاں کھرل، نے، ستمبر ۱۸۵۷ء میں کیپٹن بلیک کے ماتحت فوجی دستے سے لڑتے ہوئے مارے جانے سے پہلے، کم از کم پانچ بغاوتوں میں، جو سب کی سب ایک حد تک کامیاب رہیں، کھرل قبائل کے مشترکہ لشکر کی قیادت کی۔ ان بغاوتوں کا اصل مقصد ہندوؤں اور کھتریوں کو لوٹنا تھا۔ اپنی کوشش میں کامیاب ہونے کی انہیں بالعموم اتنی قیمت ادا کرنی پڑتی کہ امن بحال ہونے کے بعد ان پر نذرانے کے نام پر واجبی سا جرمانہ عائد کر دیا جاتا۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے احمد خاں کھرل کا شہرہ دُور دُور تک پھیل گیا اور اسے "بڑے راوی" کے تمام علاقے میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا۔ اس کا ثبوت ۱۸۵۷ء کی سرکشی ہے جس کا منصوبہ بظاہر اسی نے تیار کیا تھا اور شورش کو منظم کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ قد کے اعتبار سے کھرل اوسط قامت سے اونچے ہوتے ہیں۔ ان کے نقش بہت تیکھے ہیں اور ان میں غیرمعمولی توانائی اور قوتِ برداشت پائی جاتی ہے۔ باقی سب جاٹوں کی طرح انہیں بھی راجپوت نسل ہونے کا ادعا ہے اور اسی طبقے کی طرح وہ کھیتی باڑی کرنے والے تمام لوگوں کو قدرے تحقیر کی نظر

سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دیہات میں کاشتکاری کو کلی طور پر بسی وانوں اور نیچ ذات والوں پر چھوڑ دیا گیا ہے اور کھرل مالک پیداوار میں سے اپنا حصہ وصول کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔ ان کے پاس صرف سیلابی زمینیں ہیں۔ ان کے متوسلین تک کو کھیتی باڑی جیسا کام بھی نہایت مشقت طلب معلوم ہوتا ہے۔"

ایک اور مستشرق، منتظم اور عالم، پرسر کا کہنا ہے کہ کھرل "شادی بیاہ کے موقع پر بہت فضول خرچی کرتے ہیں۔ مسافرنواز ہیں۔ چوری چکاری کی عادت بھی ہے۔ زراعت سے بہت کم لگاؤ ہے۔ آج بھی، خصوصاً شادی کے موقع پر، بہت سی ہندوانی رسموں پر عمل کرتے ہیں۔" ایک فارسی کہاوت ہے کہ "ڈوگر، بھٹی، وٹو اور کھرل سب شورہ پشت ہیں اور کشتنی۔" لیپل گریفن لکھتا ہے۔ "تاریخ کے تمام ادوار میں کھرل شورش پسند، وحشی اور سارق قبیلہ رہے ہیں۔ اس بات کی کبھی تاب نہیں لا سکتے کہ انہیں جکڑ کر رکھا جائے۔ ماردھاڑ اور لوٹ مار کر کے خوش رہتے ہیں۔ باقی مسلمان قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ کٹر ہیں اور انہوں نے ہندو راج کے سامنے انتہائی ناخوشی سے سر جھکایا۔ دیوان ساون مل اور سکھ انہیں باز رکھنے کے لیے اس سے زیادہ کرتے بھی کیا۔ بات یہ تھی کہ ان کے خلاف جب بھی کوئی منظم فوج بھیجی جاتی وہ پسپا ہو کر دلدلی علاقوں اور گھنے جنگلوں میں ڈیرے ڈال لیتے جہاں ان کا تعاقب کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اعدی اور فتنہ پرداز ہیں، برے کاشتکار اور بدنام چور ہیں۔ اپنی ذات کی حد تک قدآور اور خوبرو ہیں اور عادتوں کے لحاظ سے خانہ بدوش اور لٹیرے۔"

کھرل قبیلے کی کھر شاخ کو اپنا نام زیادہ پُرتفنن انداز میں ملا۔ خطۂ لاہور سے تعلق رکھنے والے کھروں کے ایک ٹولے نے ملتان میں گنے کے ایک کھیت کے پاس پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے گنے کاٹ کر کچھ اپنے مویشیوں کو کھلا دیے اور کچھ کو جوڑ جاڑ کر جھونپڑیاں بنا لیں۔ جب کھیت کے مالک نے گلہ کیا تو انہوں نے بھولپن سے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ گنا کسی قسم کا بیج ہے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا وہ کون ہیں تو انہوں نے فخر سے کہا کہ وہ کھرل ہیں۔ بذلہ سنج مالک نے رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "تم کھرل نہیں، خر ہو جس کے معنی فارسی میں گدھا ہیں۔" یہ شاخ ملتان سے ملحق مظفرگڑھ میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہو گئی۔

بہرکیف، کھر اپنے نام کی ابتدا کی وجہ کچھ اور بیان کرتے ہیں۔ کھرلوں کے پیر قبیلے کے عام افراد سے برتر سمجھے جاتے تھے۔ علماء اور ان کے مریدوں میں فرق کرنے کے لیے ثانی الذکر خود کو کھر کہنے لگے۔

کھر فخریہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوک سیانی کے رومانی ہیرو مرزا جٹ کی اولاد ہیں جو

صاحبان کو لے اڑا تھا اور جس کا نام پنجاب کے قلب و نظر پر نقش ہو چکا ہے۔ کھر رعائی مزاج کے مالک ہیں۔ ان کی رومان پسندی کی اصلاح ناممکن ہے۔

کھر خاندان کی تاریخ کچھ افسانہ ہے، کچھ تذکرہ نولیا ہے۔ یہ تاریخ نسل در نسل زبانی منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ مصطفےٰ کے اب وجد نے کوٹ ادو کا رخ اس لیے کیا کہ انگریز ابھی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرتے رہو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انہیں دوسرے قبائل سے جنگ کرنے پر اکسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خاندان کے بزرگ افراد برطانوی راج کے خلاف تھے اور سفید آقاؤں کے خلاف احمد خاں کھرل کے کارہائے نمایاں کی یاد ابھی تازہ تھی۔ انہوں نے نقلِ مکانی شروع کر دی۔ قبیلہ شیر خوار بچیوں کو ہلاک کرنے کا عادی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس عظیم نقلِ مکانی کا آغاز ہوا تو تمام عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ کھرل چاہتے تھے کہ دوران سفر ان پر کسی قسم کا بوجھ نہ ہو۔ انہیں پتہ تھا ان کی عورتیں دوسرے غارت گر قبائل کا ہدف بن جائیں گی۔ اس لیے انہیں مار ڈالنا مسئلے کا زیادہ آبرومندانہ حل تھا۔ وہ نقلِ مکانی کر کے دریائے سندھ کے کنارے کنارے آباد ہو گئے۔

مصطفےٰ کے دادا نے چار شادیاں کیں۔ ہر بار اس کی بیوی پورے پورے گاؤں اپنے جہیز میں لائی۔ ان دیہات کے علاوہ بابا نے اپنی مقتول عورتوں کے سونے اور زیورات کی مدد سے، جو وہ ساتھ لانا نہ بھولا تھا۔ زرخیز زمین کے بڑے بڑے رقبے خرید لیے۔ مربع بھر زمین صرف چار آنے میں مل جاتی تھی۔

اس کی ایک بیوی کا نام سناواں تھا۔ وہ اپنے جہیز میں ایک گاؤں لائی تھی جو آج بھی اس کے نام سے منسوب ہے۔ خریداری اور ازدواجی رشتوں سے دادا کی جاگیر میں کوٹ ادو اور ڈوگر کا بھی اضافہ ہوا۔ ان بزرگوار کے تین بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک طفولیت میں فوت ہو گیا۔ یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ پرانے خانہ بدوش طور طریق چھوڑ کر کسی جگہ ٹک کر رہا جائے۔ جو زمین پہلے پورے قبیلے کی شاملات تھی اسے اب صرف ایک خاندان کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ قبائلی معاشرے سے جاگیردارانہ معاشرے کی طرف سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔

دونوں بیٹوں، محمد یار کھر اور احمد یار کھر کے سماجی تعلقات میں اضافہ ہوتا گیا۔ محمد یار کھر بہت بارخیز واقع ہوئے تھے۔ ان کے بلاکس سے زیادہ اولادیں ہوئیں۔ انہوں نے بہت ہی کم عمر میں شادی کی تھی۔ جب ان کی بیوی فوت ہوئی تو انہوں نے دوبارہ شادی کر لی۔ نئی بیوی ملتان کی کوئی رقاصہ تھی۔ اس رقاصہ کی بہن کی شادی ڈیرہ غازی خاں کے سردار مزاری سے ہوئی۔ رقاصہ بیوی کی وفات کے بعد محمد یار کھر نے مصطفےٰ کی والدہ

سے شادی کی۔ وہ ساٹھ برس کے اور مصطفےٰ کی والدہ سولہ برس کی تھیں۔ مصطفےٰ کی والدہ کے سولہ بچے ہوئے۔ ان میں سے سات بیٹے اور ایک بیٹی زندہ ہے۔

مصطفےٰ کی والدہ کا تعلق ملتان شہر سے تھا۔ انہوں نے جاگیردارانہ طرز زندگی اس طرح اپنا لی جیسے وہ ان کی فطرت ثانیہ ہو۔ وہ قبیلے کی تمام رسوم اور روایات کی نہایت احتیاط سے پابندی کرتیں۔ انہوں نے خود کو سرتاپا قبیلے کے رنگ میں رنگ لیا۔ انہیں بیٹیاں جننے سے نفور ہو گیا۔ اگرچہ قبیلے نے نوزائیدہ بیٹیوں کو ہلاک کرنے کا سلسلہ ترک کر دیا تھا، اس کے باوجود مصطفےٰ کی والدہ، جب بھی ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی، اپنی کوفت کا اظہار ضرور کرتیں۔ بیٹی جننا عورت کی کمزوری کی دلیل تھی۔ یہ ایک بن لکھا فرمان تھا جسے قبیلے کی تائید حاصل تھی۔

جانے کیسے، ایک کے سوا ان کی تمام بیٹیاں فوت ہو گئیں۔ سرگوشیوں میں کہا جاتا تھا کہ بیٹیوں کی موت کی ذمے دار وہ آپ ہیں۔ ان کی اموات کے گرد زبردست اسرار کا حصار تھا۔ چھوٹی بچیوں کو پہلے عام زکام یا معمولی کھانسی ہو جاتی۔ ماں ان پر توجہ نہ دیتی تاکہ ان کی بیماری بڑھتی رہے۔ بچیوں کو پتہ چلتا کہ ان کی قوتِ مدافعت کمزور پڑتی جا رہی ہے اور بالآخر وہ مرض کی پیچیدگیوں کی تاب نہ لا کر چل بستیں۔ ان کی کبھی دوا دارو نہ کی جاتی۔

زندہ بچ جانے والی اکلوتی بیٹی، رشیدہ، کے ساتھ ماں بہیمانہ سلوک کرتی رہی۔ چھ برس کی عمر میں اسے آج کل کی کسی سنڈریلا کی طرح کھانا پکانے اور برتن مانجھنے پر لگا دیا گیا۔ بات بے بات کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے اسے بے دردی سے مارا پیٹا جاتا۔ ماں جھونٹے پکڑ کر اسے ادھر سے اُدھر گھسیٹتی پھرتی۔ ماں کے سارے بغض کا نشانہ وہی بنتی۔ اس کی یہ غلطی کبھی معاف نہ ہو سکی کہ وہ زندہ بچ گئی تھی۔ رشیدہ کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ ہر روز اسے چاروں طرف سے دھوئیں کے مرغولوں میں گھر کر کھلے چولہے کے سامنے بیٹھنا پڑتا۔ اس کے پیلے گیلے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں پڑی ہوتیں اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے چپاتیاں بنانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ آخر ایک روز رشیدہ کو اتنی بری طرح پیٹا گیا کہ وہ مرتے مرتے بچی۔ مصطفےٰ نے اپنی بہن کی جان بچائی اور اسے اپنے ایک مزارع کی بیوی کے حوالے کر دیا جو دائی کا پیشہ کرتی تھی۔ رشیدہ کو اسی عورت نے پالا پوسا۔

ساتوں بیٹے نظم و ضبط سے آشنا ہوئے بغیر بڑے ہوتے گئے۔ ان کے والد بہت معمر ہو چکے تھے اور والدہ کو خود کو ٹھیٹ جاگیردارنی ثابت کرنے اور بیٹی کی جان سولی پر لٹکائے رکھنے سے فرصت نہ تھی۔ مصطفےٰ اور اس کے بھائی ہوش سنبھالتے ہی چھوٹے وحشیوں میں تبدیل ہو گئے۔

کوٹ ادو سے ملحقہ قبائلی سرزمین ممیر علاقہ کہلاتی ہے۔ وہاں قبائلی سرداروں کے

قرآن کو قانون کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں عورتوں کا ادلا بدلا ہوتا، انہیں بیچا جاتا۔ جب عورت فروخت ہو کر کسی کی بیوی بن جاتی تو اسے میاں کی من مانیوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا۔ میاں اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا جو زر خرید لونڈی باندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی جاتی تو اس کی کونچیں کاٹ دی جاتیں تاکہ اسے وسیع و عریض صحرا رینگ کر عبور کرنا پڑے۔ مرد شکاری تھے، عورتیں ان کا شکار۔

وٹے سٹے پر عملدرآمد عام تھا۔ اس کی ابتدا یرغمال بنانے کے قدیم دستور سے ہوئی ہو گی۔ جب ایک قبیلے کی عورت کسی دوسرے قبیلے میں بیاہی جاتی تو عورت کا بھائی اپنے بہنوئی کی بہن کو بیوی بنا کر لے آتا۔ اس کارروائی سے اپنی عورت کے حقوق کا تحفظ منظور تھا۔ اپنی بیوی سے بدسلوکی کرنے والے شوہر کو بخوبی علم ہوتا کہ اس کی بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ چنانچہ شادیاں ایک قسم کا دباؤ ہوتیں جن کی وجہ سے فریقین بدخلقی سے باز رہتے۔

جب بدلے میں بیوی لانے کے لیے دلہن کا کوئی بھائی نہ ہوتا تو چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو دلہن کے باپ سے بیاہ دیا جاتا۔

عورتوں کو بکاؤ مال سمجھا جاتا۔ ان کا فرضِ منصبی یہ تھا کہ کام کریں، گھر کو صاف ستھرا رکھیں، کھانا پکائیں، بچے جنیں، مرد کو لذت بہم پہنچائیں اور مار کھائیں۔ حقوق صفر، فرائض ہزاروں۔

مردوں میں شکار کے لیے جو میلانِ خاطر پایا جاتا تھا اس میں پرانے وقتوں سے اب تک کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس خمار کا تعلق ان کے ماضی سے تھا۔ انہیں خونریزی کا شوق تھا اور چھپ کر شکار کا پیچھا کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ جانور کو تکلیف سے تڑپتا دیکھ کر ان کو حال آنے لگتا۔

مصطفےٰ اور اس کے بھائیوں کے لیے زندگی شکار سے عبارت تھی۔ وہ زبردست کھوجی تھے اور اپنے صید کی تلاش میں کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے۔ شکار زیادہ تر گھوڑے پر چڑھ کر لیکن کبھی کبھار پاپیادہ بھی کیا جاتا۔ وہ تیتر سے لے کر سانپ تک ہر چیز مارنے پر تلے رہتے۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ جس چیز کا شکار کیا جا رہا ہے وہ حرام ہے یا حلال۔ شکار کرنے کا عمل زیادہ اہم تھا۔ آسکر وائلڈ کا قول کہ "جو ناگفتنی ہیں وہ ناخوردنی کو کھدیڑنے چلے ہیں" مکمل طرح سے ان پر منطبق ہوتا تھا۔

جب شکار کا موسم نہ ہوتا تو یہ لڑکے لاٹھیوں سے لیس ہو کر اس انتظار میں کھڑے رہتے کہ سانپ جھاڑیوں سے کب باہر آتا ہے۔ اگر سانپ رینگتا ہوا چال چلتا ہٹی پٹائی لیک

پر آنکنے کی غلطی کرتا تو لڑکے حملہ کر کے اسے فوراً مار ڈالتے۔ سانپ کی تاک میں وہ گھنٹوں کڑی دھوپ میں کھڑے رہتے۔ شکار بجائے خود نشہ تھا۔ شکار کھیلنے سے مصطفےٰ کے ریفلیکس تیز ہوئے۔ ہمت اور قوتِ برداشت بڑھی۔ چالوں گھاتوں کی سمجھ حاصل ہوئی۔ اس نے سیکھا کہ بہلا پھسلا کر، دم دے کر، کسی کو جال میں کس طرح پھنسایا جاتا ہے۔ کسی سیاستدان کے لیے، خصوصاً اس ملک میں، اس سے بہتر مکتب کوئی نہیں۔

خون کی پیاس بجھنے میں نہ آتی۔ جب کرنے کے لیے کچھ اور نہ ہوتا تو لڑکے رنگ کر چوزوں کے دڑبے میں جا گھسنے اور چوزوں کی گردنوں کو اتنا مروڑتے کہ وہ چٹ سے الگ ہو جاتیں۔ بے سر کے چوزے کو اذیت کے مارے تڑپتا اور اپنے کپڑوں کو اس کے لہو کی پھوار سے رنگین ہوتا دیکھ کر انہیں بڑا مزہ آتا، یہاں تک کہ چوزہ پھڑپھڑا کر ان کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتا، آخری بار جھرجھری لیتا اور دم توڑ دیتا۔ بہت سال بعد میں نے بیرل میسر میں مصطفےٰ کو اس خونی دل بہلاوے سے دوبارہ مزے لیتے دیکھا۔ فوارے کی طرح ابلتے خون کی سنسناہٹ کی یاد آج بھی مجھے ستاتی ہے۔

شکار ان کے ہاتھ آ جاتا تو وہ ضیافت کا اہتمام کرتے۔ وہ سب کے سب کھانا پکانے میں ماہر تھے اور اس مہارت پر انہیں خاص فخر تھا۔ وہ گوشت خور تھے۔ انہیں گوشت کھانے میں مزہ آتا تھا۔ سبزی سے انہیں مطلق ذوق نہ تھا اور وہ سبزی خوروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گوشت کو دیر تک شاذونادر ہی پکایا جاتا۔ وہ ایسا گوشت کھانے کو ترجیح دیتے جسے تھوڑی دیر پکایا گیا ہو اور جس میں خون کی ذرا ذرا سی پھٹکیاں ابھی نظر آ رہی ہوں۔ تہذیب ان کی وحشیانہ جبلتوں کو رام نہیں کر سکی تھی۔

جس علاقے میں یہ قبیلہ آباد ہے وہ بہت بنجر اور خشک ہے۔ گرمیوں میں غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ سیم اور تھور کے دہرے سکے کی وجہ سے بیشتر زمین کسی کام کی نہیں۔ ماحول درشت ہے، لوگ غریب ہیں۔ زندگی جہد مسلسل ہے۔ صعوبت کے حقیقی ہونے میں کلام نہیں۔ آب و ہوا بے رحم اور کٹھور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آب و ہوا کے انہیں خصائص کو علاقے کے باشندوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔

مصطفےٰ کے خاندان کا سیاست کی طرف جھکاؤ نہ تھا۔ اس کے والد کا اقتدار بہت بڑے علاقے پر تھا لیکن ان کی نظر میونسپل سطح سے آگے نہیں جاتی تھی۔ انہیں قومی سیاست کی منجدھار میں قدم رکھنے کا کوئی ارمان نہ تھا۔ وہ انتظامیہ سے دُور رہنے اور سماجی کام پر توجہ مرکوز رکھنے کے قائل تھے۔ جب مشتاق احمد گورمانی پنجاب کا گورنر بنا تو گورمانی قبیلے کی طاقت بڑھ گئی۔ گورمانی ساتھ کے علاقے میں آباد تھے اور وہ مقامی سیاست میں ٹانگ اڑانے لگے۔ گورمانیوں کا اپنی حدود سے تجاوز مصطفےٰ کے خاندان پر گراں گزرا۔

نوکرشاہی، جو کھر خاندان کا احترام کرتی آئی تھی، اب جانبدار نظر آنے لگی۔ پولیس نے گورمانی قبیلے کی غیر قانونی حرکتوں کا نوٹس لینا چھوڑ دیا۔ کھروں کو پتہ چلا کہ اگر انہوں نے قومی سطح پر اپنا لوہانہ منوایا تو وہ ماتحت بن کر رہ جائیں گے۔ انہیں بڑا کھلا کہ ان پر دھونس جمائی جارہی ہے اور ان کی طاقت کی جو روایتی اساس تھی وہ رفتہ رفتہ کھوکھلی ہو چلی ہے۔ کھروں پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کے اپنے لوگوں میں بے چینی پھیل گئی ہے اور وہ ان کی بہ نسبت گورمانیوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کرنے لگے ہیں۔ کھروں کو پہلی بار انصاف میں تاخیر سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ گورمانیوں سے روایتی رقابت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے پانی کے وسائل کا رخ یا تو موڑ دیا گیا ہے یا ان کے بالکل بند ہو جانے کی نوبت آ گئی ہے۔

فیصلہ کیا گیا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر اور گورمانیوں کی یلغار کا توڑ کرنے کے لیے کھر خاندان قومی سیاست میں حصہ لے گا۔ مصطفےٰ کھر چوبیس سال کا تھا۔ یہ ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے اور محدود حق رائے دہی کے تحت قومی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ مصطفےٰ نے قومی اسمبلی کی ایک نشست کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بالکل ہی مورکھ تھا۔ علاقے کے روایتی خاندان اور اقتدار کا سودا کرانے والے اسے جانتے تک نہ تھے۔ مصطفےٰ ان حقائق سے بددل نہ ہوا۔ کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کے سربراہ کی خدمت میں وہ حاضر نہ ہوا ہو۔ اس نے ہر ایک کے سامنے وضاحت سے اپنی سیاست اور معتقدات پر روشنی ڈالی۔ لغاریوں کے روپ میں اسے اتحادی مل گئے۔ لغاری گورمانیوں کے رقیب تھے۔ مصطفےٰ نے بڑی مستقل مزاجی سے بالکل نچلی سطح پر مہم چلائی تو اسے خاصی حمایت حاصل ہو گئی۔ جس آسانی سے وہ انتخاب جیتا اس پر سارے سیاسی پنڈت حیرت زدہ رہ گئے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب اسے یہ سوچ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی کہ سب لوگوں کی نظریں اسی پر جمی ہوئی ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب اسے پہلی بار بنیادی جمہوریت کے اراکین سے بھرے ہوئے کمرے میں تقریر کرنی پڑی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یہ بات مصطفےٰ نے چوبیس سال بعد اس وقت بتائی جب میں جلسۂ عام میں اپنی پہلی تقریر کی تیاری میں مشغول تھی۔

گورمانی جیسے گرم و سرد چشیدہ سیاستدان کے خلاف مصطفےٰ کی جیت پر مصطفےٰ کے والد خوش ہوئے۔ انعام کے طور پر انہوں نے اسے سات لاکھ روپے دیے۔ تازہ تازہ ہاتھ آنے والی اس دولت سے مصطفےٰ نے بہت سی کاریں خرید لیں۔ وہ کیڈلک یا اولڈز موبیل میں بڑے دھوم دھڑکے سے پارلیمنٹ جایا کرتا۔ اسے بڑی بڑی امریکی کاروں سے عشق تھا۔

بعض اوقات وہ ایک کار کو تو خود چلاتا اور باقی کاروں کے ڈرائیوروں کو حکم دیتا کہ کار جلوس کی صورت میں اس کے پیچھے پیچھے آئیں۔ اس کو یہ سجھائی نہ دیا کہ امارت کی اس نمائش کو معاشرے کا چیدہ ترین طبقہ نیا نیا پیسہ ہاتھ آ جانے کا اظہار سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

پارلیمنٹ میں مصطفےٰ کو اپنی نشست پر بیٹھے رہنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ وہ ابھی تک پینڈو نوجوان تھا اور اسے اپنے پینڈو ہونے کا احساس بھی بہت تھا۔ وہ بعض مقتدر ارکان کے بے تکان طمطراق کو تحسین بھری نظر سے دیکھتا۔ ان کی تقریریں سنتے سنتے اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ سرعام موثر انداز میں تقریر کرنے کی صلاحیت کتنی طاقت کی حامل ہے۔ اس نے منظور قادر، بھٹو صاحب، صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان اور نواب کالا باغ کی تقریریں سنیں اور ان کی مدد سے تقریر کرنے کے فن کو سمجھا۔ اس نے خود اسمبلی میں ایک بار بھی تقریر نہیں کی۔ اسے پارلیمنٹ کے سب سے غیر اہم رکن ہونے کی شہرت حاصل ہوتی جارہی تھی۔

مصطفےٰ نے مجھے بتایا کہ پارلیمنٹ کا رکن بننے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جان لیا تھا کہ اب سیاسی اثر و رسوخ کے بغیر جاگیردارانہ دنیا اپنا کام نہیں چلا سکتی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ کسی بااختیار مقام پر فائز ہوئے بغیر وہ اپنے متوسلین اور اپنی املاک کے لیے انصاف حاصل نہیں کر سکتا۔ پارلیمنٹ نے اسے قانونی جواز، اقتدار اور تحفظ فراہم کر دیا۔

قومی اسمبلی میں مصطفےٰ نے دیکھا کہ اسے سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک ساتھی جاگیردار، غلام مصطفےٰ جتوئی، کے پہلو میں نشست ملی ہے۔ ان کے نام کے پہلے دو جُز تو مشترک تھے ہی، ان کے درمیان اور بھی بہت سے پہلو اشتراک کے نکل آئے۔ ان میں دوستی ہو گئی جس کے نتیجے میں ہنگامہ خیز برسوں کا فرق نہ آ سکا۔ جتوئی صاحب سندھ کے سب سے بڑے جاگیردار خاندانوں میں سے ایک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ وڈیروں کی ایک بڑی منڈلی کے قائد تھے اور انہیں اسمبلی میں اچھا بھلا رسوخ حاصل تھا۔ جتوئی صاحب کو کیا خبر تھی کہ ایک دن خود اپنے انتخابی حلقے کی طرف سے مسترد ہو جانے کے بعد کوٹ ادو سے آنے والا یہ کچا نوجوان انہیں قومی اسمبلی کی نشست کی پیشکش کرے گا۔

بھٹو صاحب جتوئی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہی حال صدرِ مملکت کا تھا۔ ایوب خان شکار کھیلنے کی غرض سے اکثر جتوئی صاحب کے پاس نواب شاہ جاتے رہتے تھے۔

اس زمانے کے بیشتر نوجوانوں کی طرح مصطفےٰ بھی بھٹو صاحب کی مقناطیسی

شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو گیا جنھیں یکے بعد دیگرے ایندھن اور قدرتی وسائل، کامرس اور امور خارجہ جیسی اہم وزارتیں سنبھالنے کا موقع ملا تھا۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب سے کہا کہ اسے اس آتش بجاں پارلیمنٹیرین سے متعارف کرایا جائے۔ تعارف کرا دیا گیا۔ یہ ایک ایسے پیچ در پیچ تعلق کی ابتدا تھی جو سدا محبت اور نفرت کی انتہاؤں کے درمیان جھولتا رہا۔

1966ء میں بھارت کے ساتھ تاشقند معاہدے کے بعد بھٹو صاحب وزیر خارجہ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ پاکستان کی مسلح افواج نے جو کچھ میدان جنگ میں جیتا تھا وہ سب ایوب خان نے گفت و شنید کے دوران گنوا دیا۔ تاشقند کو ایوب خان کا واٹرلو ثابت ہونا تھا۔ بھٹو صاحب نے اسے بچ کر جانے کا موقع نہ دیا۔

کابینہ سے مستعفی ہونے کے بعد بھٹو صاحب نے راولپنڈی سے کراچی جانے کی ٹھانی۔ وہ راولپنڈی سے ایک ٹرین پر سوار ہوئے۔ کوٹ ادو کے نوجوان ایم این اے کے سوا کوئی آدمی انھیں الوداع کہنے سٹیشن پر نہ پہنچا۔ بھٹو صاحب مصطفیٰ سے سٹیشن پر مل کر بہت خوش ہوئے۔ مصطفیٰ کی اس ادا نے ان کے دل پر اثر کیا۔ انھوں نے مصطفیٰ کی جرأت مندی پر اظہار خیال کیا۔ بھٹو صاحب اب سیاسی اچھوت تھے اور لوگ اس ڈر سے ان کے پاس نہ پھٹکتے تھے کہ کہیں ان پر ایوب خان اور کالاباغ کا قہر نازل نہ ہو جائے۔ مصطفیٰ نے اپنا پسندیدہ قول دہرایا۔ "وقت بتائے گا۔"

بھٹو صاحب کراچی چلے آئے اور جلد ہی مصطفیٰ ان کے پاس آ گیا۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ برے وقتوں کے ساتھی۔ اس شراکت سے دونوں کو فائدہ پہنچا۔ بھٹو صاحب نے مصطفیٰ کی دلیری، عقلی مکاری اور نئی باتوں کو بہت جلد جزوِ ذہن بنا لینے کی اہلیت کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ وہ کھر پر بلاتامل اعتماد کر سکتے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ مصطفیٰ کا مشاہدہ تیز ہے، وہ ذہین ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس کی نظر میں وہ کسی دیوتا سے کم نہیں۔ بھٹو صاحب نے مصطفیٰ کے فیصلوں پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا۔ مصطفیٰ نے بھی کان لگا کر عوام کے دلوں کی دھڑکن سنی اور بھٹو صاحب اس کے اندازوں پر تکیہ کرنے لگے۔

مصطفیٰ ستر کلفٹن میں بھٹو صاحب کے پاس مقیم تھا۔ بھٹو صاحب نے اس کی ذات میں گہری دلچسپی لینی شروع کی۔ انھوں نے [illegible] نوجوان سے کہا کہ بعض مصنفوں کو پڑھو اور اسے سیاسی تھیوری کی الف بے خود [illegible] لگے۔ وہ روزانہ بڑی تفصیل سے سوال پوچھتے تاکہ پتہ چلے کہ مصطفیٰ نے جو [illegible] اسے کس حد تک سمجھ سکا ہے۔

انھوں نے مصطفیٰ کو لباس پہننے کی تمیز بھی سکھائی۔ نوجوان زمیندار جلد ہی لٹھے کی پتلونوں، ٹیری لین قمیضوں اور سینڈلوں سے بے نیاز ہو گیا۔ بھٹو صاحب کسی چھیل چھبیلے جیسا لباس پہنا کرتے تھے اور مصطفیٰ پوشاک کی حد تک ان کے اسلوب کی تقلید کرنے لگا۔ بھٹو صاحب اپنی ٹرن بل اور ایسر کی قمیضیں مصطفیٰ کو دیتے رہتے جو اب خوش قطع سوٹ پہننے لگا تھا۔

مصطفیٰ کو ایک نئی دنیا سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ وہ اب ایسے لوگوں کے درمیان تھا جن کا رہن سہن نفاست کا آئینہ دار تھا۔ وہ ستر کلفٹن میں گھوم پھر کر وہاں کی زیبائش اور سازوسامان کو ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ یہ اور ہی دنیا تھی جس کا اس کے اپنے گئے گزرے گھر سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

نوجوان سیاستدان کے دیکھنے میں آیا کہ بھٹو صاحب اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ پیشکش کے انداز سے سلیقہ جھلکنا چاہیے۔ ڈنر پارٹیوں سے پہلے کراکری اور کٹلری کا انتخاب خود کرتے۔ انھیں طباخی کے مختلف اسالیب اور انگوری شرابوں کے بارے میں بڑی معلومات تھی۔ حد یہ کہ پھولوں کو قرینے سے ترتیب دینے کی نگرانی تک آپ کرتے تھے۔ یہ بھی وہی طے کرتے تھے کہ مینو کن کن چیزوں پر مشتمل ہونا چاہیے اور اس کو یقینی بناتے کہ سروس بہت عمدہ ہو اور ملازموں کا لباس بالکل بے داغ۔ وہ ہر بارے میں خود ہدایت دیتے۔ نصرت بھٹو صرف ان کے احکامات کی تعمیل کرتی۔

بھٹو صاحب کو ایرانی اور چینی قالینوں سے عشق تھا۔ وہ بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے انھیں خریدتے تھے۔ اگر کوئی قالین ان کی نظر میں جچ جاتا تو اسے خریدنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کسی دوست کے گھر میں وہ جس قالین پر کھڑے ہوتے اس کی قیمت لگا دیتے اور اس وقت تک وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتے جب تک سودا پٹ نہ جاتا۔

بھٹو صاحب کو بھی نہرو کی طرح، جس کے وہ بڑے مداح تھے، گلابوں سے بہت پیار تھا۔ کراچی اور لاڑکانے میں ان کے باغات کا مایۂ فخر گلاب کی بعض نادر اقسام تھیں جن کو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کاشت کیا تھا۔

ان کے کتب خانے کی زیبائی دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ اس کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ یہ ایشیا کے بہترین کتب خانوں میں سے ایک تھا اور نپولین بوناپارٹ سے متعلق کتابوں کا ان کے پاس جو ذخیرہ تھا اس کی ملکیت پر انھیں بے حد ناز تھا۔ بھٹو صاحب جزیرہ کورسیکا سے تعلق رکھنے والے اس پست قد انسان کے بڑے گرویدہ تھے جس نے آپ ہی فرانس کا تاج شہنشہی اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ وہ کتب خانے میں، خصوصاً رات

کے وقت، خاصا وقت گزارتے۔ اس کتب خانے کے دروازے انھوں نے مصطفیٰ پر کھول دیے تاکہ وہ مطالعے کی طرف راغب ہو جائے اور اپنے ذہن کو جلا دے سکے۔

مصطفیٰ مکمل طور پر مغلوب نہ ہوا۔ وہ اپنی شناخت اور دھڑیلے پن کو بچائے رکھنے کا جتن کرتا رہا۔ وہ نرالا جوڑا تھا۔ سانولا صاحب بہادر ناشتے میں تلے ہوئے انڈے اور بیک کیے ہوئے سیم کے دانے کھا رہا ہے اور دیسی سائیں کے سامنے لسی سے بھرا جگ اور پراٹھا اور آملیٹ رکھا ہے۔ مصطفیٰ کو اپنے رکاب دارانہ ورثے پر فخر تھا اور اس نے اپنی زبان کے چسکے سے بے وفائی نہیں کی۔

بھٹو صاحب حسنیٰ شیخ نامی ایک حسین و جمیل مطلقہ سے عشق لڑا رہے تھے۔ وہ باتھ آئی لینڈ پر ریل کی پٹڑیوں کے اُس پار رہتی تھی۔ بھٹو صاحب اس کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کا بندوبست کرتے۔ مصطفیٰ کار ڈرائیو کر کے انھیں اس جگہ پہنچا دیتا جہاں ملاقات ہونی ہوتی اور چند گھنٹے اور جا کر لے آتا۔ بھٹو صاحب عشق میں دیوانہ وار مبتلا تھے۔ حسنیٰ ابھی بھی اداکاری کر رہی تھی کہ اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے اور اس مرحلے پر عشق کا جواب برابر کی شدت سے دینے پر آمادہ نہ تھی۔

حسنیٰ شیخ کے ساتھ بھٹو صاحب کا الجھاوا ان کے زوال کے بعد شہ سرخیوں کی زینت بنا۔ یہ راز کتنے ہی برس عیاں راچہ بیاں کی مثال بنا رہا۔ حسین اور زندہ دل حسنیٰ پر ان کی فریفتگی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب وہ ایوب حکومت میں وزیر تھے۔ حسنیٰ ایک بنگالی وکیل، عبدالاحد سے بیاہی ہوئی تھی۔ عبدالاحد شدید قوم پرستانہ رجحانات کا حامل تھا۔ ان کی شادی استحکام سے محروم تھی۔ احد کو 1971ء میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ یا تو اسے فوج نے مار دیا یا البدر کے کسی دہشت گرد سکواڈ نے ٹھکانے لگایا۔ ستم ظریفی یہ کہ اس کے دوسرے عاشق یعنی بھٹو صاحب کا بھی یہی انجام مقدر تھا۔

حسنیٰ پٹھان بنگالی والدین کی اولاد تھی۔ وہ حسین بھی تھی اور گفتگو کے فن میں بھی ایسی طاق کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے۔ بھٹو صاحب اپنے سیاسی بن باس کے دنوں میں اس کے پیچھے پڑے رہے۔ وہ متذبذب تھی۔ بھٹو صاحب کا امیج ایسے آدمی کا تھا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو۔ اس لیے جب وہ کہتے کہ ان کی محبت لازوال ہے تو حسنیٰ ان کے دعوے کو شک کی نظر سے دیکھتی۔

مصطفیٰ بھٹو صاحب کو حسنیٰ کے اپارٹ منٹ پر چھوڑ کر آجاتا۔ اس خفیہ اور پُرخطر آشنائی کے سلسلے میں بھٹو صاحب مصطفیٰ کے سوا کسی پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ ایک بار مصطفیٰ نے بھٹو صاحب کو اپارٹ منٹ کے باہر اتارا اور چلا آیا۔ حسنیٰ اور بھٹو میں کچھ پیچا پیچ ہو گئی۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ سابق وزیر خارجہ اور آئندہ کے وزیر اعظم کو باہر دھکیل

کر دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ بھٹو صاحب کو روٹھوں کو منانے کے جو جو دل پذیر گُر آتے تھے انھوں نے سارے آزما ڈالے۔ حسنیٰ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دروازہ جو بند کیا جا چکا تھا کھل نہ سکا۔ بھٹو صاحب پیدل ستر کلفٹن کی طرف چل دیے۔ رات بہت جا چکی تھی۔ ایک دن اسی سڑک سے انھیں چنگھاڑتے سائرنوں کے شور میں موٹر سائیکل سواروں کے جلوس کے ساتھ شان سے گزرنا تھا۔ لیکن اس وقت تو گھر پہنچنے کیلئے ایک لمبا اور تھکا دینے والا راستہ طے کرنا باقی تھا۔ انھوں نے بعد میں مصطفیٰ کو بتایا کہ انھیں ڈر یہ تھا کہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ اگر اس رات کسی کی نظر ان پر پڑی بھی ہوگی تو وہ اپنا سر جھٹک کر دوبارہ سو گیا ہوگا۔ جو کچھ دیکھا ہوگا اسے خواب سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی ہوگی۔

جب بھٹو صاحب بالآخر صدر بن گئے تو انھوں نے فوراً حسنیٰ کو بلا بھیجا۔ مصطفیٰ بتاتا ہے کہ وہ فرش پر بیٹھی رہتی۔ بھٹو صاحب کو نیاک کی چسکیاں لیتے اور سگار پیتے رہتے۔ ان کا ایک ہاتھ حسنیٰ کے بالوں سے کھیلتا رہتا۔ وہ نہایت تیز طبع تھی۔ بھٹو صاحب اسکے ساتھ سیاست پر تبادلہ خیال کرتے۔ وہ بھٹو صاحب کے بہت سے فیصلوں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہوئی۔ وہ ان کی سب سے کڑی نقاد تھی۔ ان کے تعلق میں زندگی پوری حرارت کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ آپس کے بحث مباحثے، چھان وچرا اور اختلاف رائے سے آشنائی کا رنگ چوکھا ہو گیا تھا۔

جب اسکی بیٹی کی شادی سر پر آپہنچی تو حسنیٰ نے بھٹو صاحب پر زور دیا کہ ان کے تعلق کو قانونی حیثیت دینے کا وقت آگیا ہے۔ اس کی بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ کچھ میری بات مان لو کچھ میں تمھاری مان لیتا ہوں۔ حسنیٰ کو دوسری بیوی بنا کر گھر لانے سے ایک عالم میں فضیحت ہوتی۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کیلئے تیار نہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ قرآن پر لکھے دیتے ہیں کہ انھوں نے خدا کی نگاہ میں حسنیٰ کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ حسنیٰ راضی ہو گئی۔ بھٹو صاحب نے اپنا کہا پورا کیا۔ حسنیٰ نے قرآن کو اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

گھر لوٹ کر بھٹو صاحب کو نظر آیا کہ بطور قائد ان کا چراغ اب کسی وقت بھی گل ہو سکتا ہے۔ وہ بہت گھبرائے۔ مصطفیٰ کو طلب کیا گیا۔ منصوبہ تیار ہوا کہ جب حسنیٰ گھر پر نہ ہو تو قرآن چرا لیا جائے۔ خانہ دزدی کی واردات کا اہتمام کیا گیا۔ خانہ دزد نرے گوکھلے نکلے۔ وہ صرف قرآن چرا کر لے آئے۔ واٹر گیٹ سکینڈل میں ملوث اپنے جیسے اناڑیوں کی طرح انھوں نے بھی کام چوپٹ کر دیا۔ حسنیٰ کو پتہ چل گیا کہ اس کا مقدس نکاح نامہ کس نے چرا لیا ہے۔ بھٹو صاحب نے قدرتی طور پر چوری کی ذمہ داری قبول

کرنے سے انکار کردیا۔

نصرت بھٹو کو بھٹو صاحب کے اس بالا بالا معاشقے کا علم تھا۔ اس نے بے کل ہو کر نوٹ کیا کہ حسنیٰ کا اثر بڑھتا جارہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ بھٹو صاحب کے بیشتر وزیروں نے بھانپ لیا ہے کہ اصل طاقت کس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر وقت حسنیٰ کے دربار میں حاضر رہتے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ نصرت نے بھٹو صاحب کو چھوڑ کر اپنے وطن ایران چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ بھٹو صاحب کے ہوش اڑگئے۔ نصرت سیاسی طور پر ناگزیر بن چکی تھی۔ انھوں نے مصطفیٰ کا سہارا لیا۔ کہا کہ وہ نصرت کے پاس جاکر ان کے کیس کی پیروی کرے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی راہ راست سے نہیں ہٹیں گے۔ مصطفیٰ بذریعہ طیارہ اسلام آباد پہنچا اور مبتلائے اضطراب خاتون اول کو قائل کرنا چاہا کہ اپنے شوہر سے تعلق قطع نہ کریں۔ نصرت گھر بار چھوڑ چھاڑ کر چل دینے پر تلی بیٹھی تھی۔ مصطفیٰ کھر کی زبانی ملنے والے زیادہ ہوش مندانہ مشوروں کی وجہ سے یہ معاملہ، جو بگڑ کر سکینڈل بن سکتا تھا، سلجھ گیا، خطرہ ٹل گیا۔ نصرت واپس تو آگئی لیکن اپنے شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔

کلفٹن میں حسنیٰ کا گھر لنگر عنایت کے طلبگاروں، چاپلوسوں، مشکل میں پھنسے وزیروں اور سرکاری افسروں کا پسندیدہ اڈا بن گیا۔ کسی بھی شام کو وہاں جانے پر کوثر نیازی، جام صادق علی، مصطفیٰ جتوئی، مصطفیٰ کھر، حفیظ پیرزادہ، طالب المولیٰ، رسول بخش ٹالپر، ممتاز بھٹو وغیرہ جیسے افراد سے اتفاقاً آمنا سامنا ہوسکتا تھا۔ یہ سب حسنیٰ کے بہی خواہ مشہور ہوگئے۔ انہیں لوگوں نے آگے چل کر وہ (انکل) بننا تھا جن پر بینظیر کبھی تکیہ نہ کرسکتی تھی۔ یہی تھے وہ جنھوں نے بینظیر کی ماں سے بے وفائی کی تھی اور اس دوسری عورت سے تعلق بڑھایا تھا۔ 6 اگست 1990ء کو یہ انکل دوبارہ اقتدار میں آگئے۔

جب بھٹو صاحب پشت بدیوار ہوکر پاکستان قومی اتحاد کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے تو اخباروں میں حسنیٰ کے ساتھ ان کے ناجائز تعلق کا ذکر آنے لگا۔ بھٹو صاحب نے ایک ریلی میں سرعام اعلان کیا کہ ان کا حسنیٰ سے کوئی تعلق نہیں اور مکر گئے کہ انھوں نے حسنیٰ سے شادی کررکھی ہے۔ یہ اعلان کرنے سے پہلے انھوں نے حسنیٰ کی منت کی تھی کہ وہ خاموش رہے اور اس سرعام تردید کی رسوائی کو برداشت کرلے۔ حسنیٰ پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آفرین ہے کہ اس نے زبان نہ کھولی۔

بھٹو صاحب انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کو تیسری دنیا کے قائد کی بہترین مثال سمجھتے تھے۔ غریب ملکوں کے لوگ جذباتی اور ان پڑھ ہوتے ہیں۔ عوام کو باتی لحاظ سے

غیر دلچسپ زندگی میں رنگ بھرنے کیلئے سوئیکارنو کی آتش بیانی اور لوگوں کے حالات سدھارنے کے نعرے ضروری تھے۔ اس کی نجی زندگی بھی اسی رنگ آمیزی کا حصہ تھی۔ عوام اس کی عشق بازیوں کو معاف کردیتے تھے۔ بھٹو صاحب سوئیکارنو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کررہے تھے۔ بھلا مصطفیٰ اپنے قائد سے پیچھے کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوئیکارنو جیسے انسانوں کا ذکر کرتا اور کہتا کہ غیر معمولی مردوں کو بیویاں بھی غیر معمولی درکار ہوتی ہیں جن میں سوجھ بوجھ بھی ہو اور جو اپنے شوہروں کے مزاج کی ٹیڑھ سے نمٹنے کی اہلیت بھی رکھتی ہوں۔ اس ضمن میں ہٹلر اور ایوا براؤن سے اس کی آشنائی تک کو بطور مثال پیش کیا جاتا۔

کراچی میں مصطفیٰ ہر طرح کے عشقیہ الجھیڑوں سے دور دور ہی رہا۔ وہ ہر وقت بھٹو صاحب کے ساتھ رہتا اور تمام سوشل سرگرمیوں اور محفلوں سے لطف اندوز ہوتا لیکن عشقیہ چھیڑ چھاڑ یا عورت بازی سے اجتناب برتتا رہا۔ وہ اعلیٰ سوسائٹی کی لطافتوں سے آشنا ہونے اور مستعلیق انداز میں کسی کو پٹانے کا فن سیکھنے کیلئے زیادہ بے چین تھا۔ غالباً ابھی اس میں زیادہ اعتماد پیدا نہ ہوا تھا اور اونچی سوسائٹی کی خواتین کی چہلیں اور کھلا ڈلا پن اسے خوفزدہ کردیتا تھا۔ وہ ذرا نچلے طبقے کی عورتوں کے درمیان زیادہ چین سے سانس لیتا جہاں جنسی تعلقات قائم کرنے کیلئے طرح طرح کے جتن کرنے ضروری نہ تھے، صرف روپیہ خرچنا کافی تھا۔

پاکستان پیپلزپارٹی کی تشکیل لاہور میں ڈاکٹر مبشر کے گھر میں عمل میں آئی۔ مصطفیٰ اس کے بانی ارکان میں شامل تھا۔ نوزائیدہ سیاسی جماعت نے اپنا پہلا جلسہ عام لاہور کے گول باغ میں کیا جو زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوسکا۔ وجہ یہ تھی کہ ایوب حکومت کے کارندے ہجوم میں شامل ہوگئے تھے۔ مقررین کو شوروغل مچا کر آوازے کس کر مسلسل تنگ کیا جاتا رہا اور ان میں سے کوئی بھی اپنی تقریر مکمل نہ کرسکا۔

کالاباغ نے مصطفیٰ کے پیچ کسنے شروع کردیے۔ اسے دق کیا جانے لگا اور یونینیسٹوں کے ڈھیر سارے مقدمات اس پر لاد دیے گئے۔ اس کا خاصا وقت کچہری اور عدالت میں گزرنے لگا۔ اسے گرفتار کرلیا گیا اور پھر ہفتے بعد چھوڑ دیا گیا۔ مصطفیٰ نے اپنی شامت کو آپ ہی دعوت دی تھی۔ کالاباغ بہت طاقتور گورنر تھا اور اس نے پنجاب کو بری طرح شکنجے میں کس رکھا تھا۔ مصطفیٰ نے چوبیس سال کی کم عمر میں کالاباغ سے ٹکر لے کر اور اسے للکارنے کے عواقب برداشت کرکے حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔

بھٹو صاحب بڑے سخت کوش سیاست دان تھے۔ ان کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ انھوں نے پاکستان کے طول و عرض کا چکر لگایا اور عوام کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان

کے مزاج کی صحیح تشخیص کی۔ 1967ء میں انھوں نے ملتان میں فیصلہ کیا کہ پارٹی کو سیاسی اکھاڑے میں اتارنے کا وقت آپہنچا ہے۔ مصطفیٰ نے ملتان کے نوجوان اقدام پسندوں سے ملاقات کی۔ ان میں سے ایک میں انھیں سیاست دان بننے کے تمام امکانات نظر آئے۔ یہ میاں ساجد پرویز تھا، جو اس وقت صرف سولہ برس کا تھا۔ وہ اس نوجوان لڑکے کو بھٹو صاحب سے ملانے گھر ہاؤس لے گیا۔ ملتان میں ریلی نہایت کامیاب رہی۔ یہ دیکھ کر کہ طالب علموں، کسانوں اور مزدوروں نے ان کی آواز پر لبیک کہا ہے اور اپنے نئے ابھرتے قائد کی باتیں سننے کے لیے ہر طرف سے امڈ آئے ہیں بھٹو صاحب جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ انھوں نے کہا۔ "پاکستان کی تاریخ میں اپنا کردار ادا کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس امر کے ممکن ہونے کا احساس مجھے آپ نے دلایا ہے۔ اس وجہ سے میں ملتان کے لوگوں کو کبھی فراموش نہ کروں گا"۔ پھر ادائے دلبرانہ کے طور پر، جو جلد ہی ان کی مخصوص پہچان بن گئی، انھوں نے قمیض کے بٹن کھولے اور بٹنوں کو نوچ کر وجد میں آئے ہوئے ہجوم کی طرف اچھال دیا۔ "ایک روز، یہ اب کوئی دنوں کی بات ہے، جب میں اقتدار میں ہوں گا، یہ بٹن لے کر میرے پاس آنا۔ میں تمھیں مایوس نہیں کروں گا۔ یہ بٹن اس بات کا ثبوت ہوں گے کہ جس تاریخی دن ہماری تقدیر کا فیصلہ ہوا تو تم یہاں موجود تھے۔"

سیاسی مشینری اب ٹاپ گیئر میں چل رہی تھی۔ پی پی پی نے فیصلہ کیا کہ صادق آباد، بہاولپور، میں ریلی منعقد کی جائے۔ حکومت نے دفعہ 144 لگادی جس کے تحت کسی عام جگہ پر چار سے زیادہ آدمی اکٹھے نہیں ہو سکتے پی پی پی نے اپنا پروگرام جاری رکھا اور اس پابندی کو خاطر میں نہ لائی۔ اس جلسے کو انتظامیہ کے حربوں اور جماعت اسلامی کی سینہ زوری نے تتر بتر کر دیا۔ بھٹو صاحب کو نم چشم کار میں ڈالا گیا۔ کار مصطفیٰ چلا رہا تھا۔ کار پر ایک غصیلے ہجوم نے ہلا بول دیا۔ مصطفیٰ کسی جنونی کی طرح ڈرائیو کرتا ہوا کار کو ہجوم میں سے نکال لے گیا۔ وہ نکل تو گئے لیکن آگے جاکر راستے میں ایک ریلوے کراسنگ آگئی جو بند تھی۔ مصطفیٰ نے کار کو الٹا چلا کر ایک متبادل راستے کا رخ کیا (جماعت والوں کا ایک ہجوم اینٹیں پتھر لیے ان کا منتظر کھڑا تھا)۔ اس گھات لگانے کھڑے ہجوم سے بچنے کے لیے مصطفیٰ کار کو کھیت میں سے نکال کر لے گیا اور عین ممکن ہے اسی کارکردگی سے اس نے پی پی پی کو مرگ ناگہاں سے بچا لیا ہو۔

ایوب خان نے گول میز کانفرنس طلب کی۔ بھٹو صاحب نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار جنرل کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ جس وقت کانفرنس ہو رہی تھی بھٹو صاحب لاہور میں موچی دروازے کے باہر انسانوں کے

ایک ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے خطاب کر رہے تھے۔ "میری گول میز کانفرنس یہ ہے۔ ملک کے مستقبل کا فیصلہ یہاں ہوگا اور فیصلہ آپ لوگ کریں گے"۔

ایوب خان کو ہٹانے کے لیے جو ایجی ٹیشن جاری تھی وہ کامیاب رہی۔ ایوب خان نے دست بردار ہو کر عنانِ حکومت جنرل یحییٰ کو تھمادی۔ مارشل لا لگا دیا گیا۔ جنرل یحییٰ نے وعدہ کیا کہ وہ انتخابات کرائے گا اور ان میں ہر بالغ فرد کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔

یحییٰ خان نے عام انتخابات کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس پر کام جاری رہا۔ انتخابات کے ذریعے آئین ساز اسمبلی منتخب کرنا منظور تھا۔ اسمبلی کے ذمے یہ کام لگایا جانا تھا کہ وہ ملک کا آئین تیار کرے۔ یہ بذاتِ خود ایک غلطی تھی۔ ملک سیاسی طور پر دو شدید قسم کی انتہاؤں میں بٹا ہوا تھا اور سیاسی جماعت نے اپنے پروگرام اور منشور کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیا۔ یحییٰ خان کو یقین تھا کہ کوئی سیاسی جماعت مکمل اکثریت حاصل نہ کر سکے گی اور جو پارلیمنٹ وجود میں آئے گی اس میں کسی جماعت کو اتنی اکثریت بھی حاصل نہ ہو سکے گی کہ وہ اس کا سہارا لے کر کام چلا سکے۔ اس صورت میں مسلح افواج کو کسی (غیر) ایمان دار ثالث کی طرح مستقل طور پر بندر بانٹ کرتے رہنے کی ضمانت مل جائے گی۔

جنرل یحییٰ محسوس کرتا تھا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ سب سے بڑی واحد جماعت بن کر ابھرے گی لیکن باقی جماعتوں کو ایک عظیم اتحاد کی شکل میں اکٹھا کر کے عوامی لیگ کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ اس اتحاد کا قائد مسلم لیگ کے خان عبدالقیوم خان کو بننا تھا۔ یحییٰ خان کو یہ خیال نہ آیا کہ ووٹ دینے والے اپنی فراست سے اس کی بازی الٹ سکتے ہیں۔ اسے یہ بھی تسلیم نہ تھا کہ پیپلز پارٹی کو زبردست مقبولیت حاصل ہے۔ قوم پرستی کی جو لہر مشرقی پاکستان پر چھائی ہوئی تھی۔ یحییٰ نے اس کے بارے میں بھی غلط اندازے لگائے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ انتخابات میں کامیاب ہونے والی جماعت اپنے منشور کی بنا پر جیتا کرتی ہے اور بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد ہی اپنے پروگرام سے دست بردار ہو سکتی ہے۔ 1970ء میں ہونے والے انتخابات منصفانہ اور آزادانہ تھے۔ بہر حال، اگر یحییٰ خان کی نیت کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ ان انتخابات میں یحییٰ خان نے دھاندلی کی تھی۔ اس کے غلط اندازوں نے ملک کو اپنے عمیق ترین بحران میں دھکیل دیا۔

مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے دو کے سوا مشرقی پاکستان میں تمام نشستیں جیت لیں۔ صرف نور الامین اور چکما قبیلے کا راجہ تری دیو رائے عوامی لیگ کی فہرست کھری کی

تاب لا سکے۔ عوامی لیگ اپنے چھ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر کامیاب ہوئی تھی۔ بظاہر تو اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ فیڈریشن میں شامل اکائیوں کے لیے زیادہ صوبائی خود مختاری حاصل کی جائے لیکن اس میں علیحدگی کے بیج موجود تھے۔ چھ نکات کو مان لینے کے بعد پاکستان زیادہ سے زیادہ ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کی صورت میں باقی رہ سکتا تھا۔

روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کرنے والی پاکستان پیپلز پارٹی نے دیکھا کہ مغربی پاکستان میں اپنی طاقت کے باوجود اس کے حصے میں ہمیشہ اقلیتی جماعت کے کردار کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ بھٹو صاحب جانتے تھے کہ عوامی لیگ دوسری چھوٹی جماعتوں کی مدد سے اپنی مرضی کا آئین اسمبلی سے منوا لے گی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے کہ چھ نکات مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں علیحدگی پسند میلانات کو ہوا دیں گے۔ پنجاب کے قائد کے طور پر بھٹو صاحب پر لازم تھا کہ سخت رویہ اختیار کریں اور بگڑتی ہوئی صورت حال پر روک لگائیں۔ جو قدم انھوں نے اٹھائے ان میں کچھ عنصر نرگسیت کا بھی شامل تھا۔ وہ خود کو مجیب اور باقی لوگوں سے کہیں بہتر سیاست دان سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ وہ پاکستان کی قیادت کرنے کے زیادہ اہل ہیں۔ سارے کے سارے مشرقی پاکستان کے ایک طرف جھک جانے سے ان کا وزیر اعظم بننے کا خواب ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ چند عشرے پہلے جناح صاحب نے جو کیا تھا بعینہٖ اسی طرح بھٹو صاحب نے اچھے برے پہلوؤں کا خوب حساب لگانے کے بعد خطرہ مول لیا۔ انھوں نے سرے سے اقتدار نہ ملنے پر کٹے پھٹے اور گھٹائے پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے کو ترجیح دی۔

یحییٰ اپنا کھیل پورا کرنے کے لیے ڈھاکے جا کر مجیب سے ملا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار کر لیا جائے۔ ایسا نہ ہوا تو وہ اسمبلیاں توڑ دے گا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اسمبلیوں کا اجلاس 23 مارچ کو طلب کیا جائے گا اور مجیب کو سرِ عام مستقبل کا وزیر اعظم پاکستان کہہ کر متعارف کرایا۔ بدلے میں مجیب نے یحییٰ خان سے وعدہ کیا کہ اسے دعوت دی جائے گی کہ ملک کے صدر کے طور پر کام کرتا رہے۔

یحییٰ مغربی پاکستان لوٹا تو بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی جن پر اضطراب طاری تھا۔ پیپلز پارٹی کا قائد ایک بے رحم اکثریت کا نادری حکم قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ بھٹو صاحب نے یہ دلیل پیش کی کہ ملک کا آئین بنیادی دستاویز ہوتا ہے جسے سب کی رضا مندی سے مرتب کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے یحییٰ خان کو خبردار کیا کہ مجیب اپنے تمام وعدے وفا نہیں کرے گا اور یہ کہ چھ نکاتی پروگرام کا مطلب پاکستان کا خاتمہ ہے۔ لاڑکانے میں ایک ملاقات کے دوران انھوں نے جنرل یحییٰ کو بتایا کہ مجیب وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوتے ہی آپ کو ہٹانے کے لیے قدم اٹھائے گا۔

یحییٰ بھٹو صاحب کی دل کو لگنے والی منطق کے دام میں آ گیا۔ تمام اقتدار بنگالیوں کے ہاتھ آ گیا تو پھر ان کا کیا اعتبار۔ ہو سکتا ہے وہ مسلح افواج کی قطع و برید شروع کر دیں اور بھارت کے ساتھ یارانہ گانٹھنے لگیں۔ یحییٰ حواس باختہ ہو گیا۔ منصوبہ تیار کیا گیا کہ سیاست دان چھ نکات کے خلاف بڑھ بڑھ کر بولیں گے اور قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا کا مطالبہ کریں گے۔ مشرقی پاکستان پھٹ پڑا۔ فسادات برپا ہو گئے۔ پرانے شکوک بہت نمایاں ہو کر ابھر آئے۔

بھٹو صاحب اور مصطفیٰ ڈھاکہ پہنچے۔ مصطفیٰ کے ذریعے مجیب کو پیغام بھجوایا گیا۔ پیغام میں بھٹو صاحب نے کہا کہ وہ مجیب کو پاکستان کے وزیر اعظم کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہیں۔ انھوں نے مجیب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور التماس کیا کہ اس تعطل کو دور کرنے کے لیے کسی قابل عمل فارمولے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ مجیب چھ نکات کے سلسلے میں کچھ لچک کا مظاہرہ کرے کیونکہ اپنی موجودہ شکل میں وہ مغربی پاکستان کے عوام کو قبول نہ تھے۔

یحییٰ دوبارہ ڈھاکے آیا۔ آمادہ بہ جنگ مجیب نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسے وہ کسی غیر ملک کا سربراہ ہو۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں کو، جن میں بھٹو صاحب بھی شامل تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دہرے یرغمال ہوں۔ حقیقت میں مجیب نے یک طرفہ آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ مزید بات چیت کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اقتدار فوری طور پر منتقل کیا جائے۔ یحییٰ نے زور دیا کہ گفت و شنید ہونی چاہیے۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ڈھاکے میں اپنے قیام کو وہ ایک چال کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ کچھ مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بنگالیوں کی آزادی کی جدوجہد کو کچلنے کے لیے پاکستانی فوج طیاروں کے ذریعے مشرقی پاکستان پہنچائی جا رہی تھی۔ ڈھاکے میں بھٹو صاحب کی موجودگی سے فائدہ مستزاد تھا۔ یحییٰ خان ایک ہی وار میں دو شکار کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

فوج نے بنگال کچل دیا۔ بہیمانہ انداز میں۔ مجیب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان پہنچا دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے ڈھاکہ جلتے دیکھا۔ یحییٰ واپس چلا گیا۔ ہوٹل کے گرد و نواح میں یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے۔ یحییٰ خان نے بھٹو صاحب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک شیطانی منصوبہ تیار کیا تھا۔ قتل کا الزام وہ مکتی باہنی پر لگا دیتا، جو عوامی لیگ کا مسلح بازو تھا، اور جرم کی سزا میں مجیب کو مغربی پاکستان میں پھانسی دے دی جاتی۔ خوش قسمتی سے بھٹو صاحب کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ انٹر کانٹی نینٹل میں بموں کا دھماکہ ہو ہی نہ سکا۔ ڈھاکہ

خون میں نہایا ہوا تھا۔ خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ بھٹو صاحب بدحواسی کے عالم میں مغربی پاکستان واپس پہنچے۔ ہوائی اڈے پر انھوں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے، پاکستان کو بچا لیا گیا ہے۔ نرگسیت کے مارے انھوں نے اپنی ذات کو پاکستان کے مساوی قرار دے ڈالا۔

خانہ جنگی زور شور سے جاری رہی۔ بنگلہ دیش کی آزادی کی لڑائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس فساد کو بھڑکانے میں پُر عناد غیر ملکی پریس کا بڑا ہاتھ تھا۔ یحییٰ خان نے نورالامین کو پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا۔ بھٹو صاحب نے نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے طور پر حلف اٹھایا۔ پناہ گزینوں کا بہانہ بنا کر بھارتی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئیں اور دسمبر 1971ء میں پلٹن میدان میں اقبال کا خواب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ جنرل نیازی نے اپنی تلوار جنرل اروڑا کو تھما دی۔ اقوام متحدہ میں بھٹو صاحب کی غلو آمیز اداکاری پر کسی نے کان تک نہ دھرا۔ ان کے پاکستان لوٹنے کا وقت آنے والا تھا تاکہ وہ کرتا ہوں جمع پھر وطنِ لخت لخت کو" کہہ کر نئے پاکستان کی تعمیر کے لیے کوشاں ہو سکیں۔

اچانک اتنا شدید صدمہ پہنچنے کی وجہ سے مغربی پاکستان میں مکمل ابتری کا عالم تھا۔ یحییٰ خان حقیقی دنیا سے منہ موڑ کر خوابوں کے جہان میں گم ہو گیا۔ وہ اقتدار سے چمٹا رہنا چاہتا تھا اور مدہوشی کے عالم میں بھی آئین مرتب کرنے میں لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ تو اس المیے کا کچھ ہوش ہے جس سے قوم دوچار ہو چکی تھی اور نہ ان بھوکوں کا شور و غوغا اس کے کانوں تک پہنچ رہا ہے جو اس کے خون کے پیاسے تھے۔ فوج نے اقتدار پر اپنی گرفت قائم رکھنے کے لیے چالیں چلنی شروع کیں۔ جنرل حمید کو یقین تھا کہ اس کے سربراہ مملکت بننے کا وقت آپہنچا ہے اور موصوف نے صدر کی طرح اینڈنا اکڑنا شروع کر دیا۔ جنرل پیرزادہ نے زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ اسے پتہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہزیمت کے بعد فوج اپنی ساکھ گنوا چکی ہے اور اسے اقتدار چھوڑنا ہی پڑے گا۔ بہرکیف، اسے یہ منظور نہ تھا اقتدار ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ سیاست دانوں کی صفوں میں کسی ایسے کٹھ پتلے کو ڈھونڈنے لگا جس کی ڈور فوج ہلاتی رہے۔ اس کی نظر انتخاب اصغر خاں پر پڑی۔

ان دونوں نے منصوبہ گھڑا کہ لیاقت باغ میں ایک سیاسی ریلی ہو جس میں اصغر خان یحییٰ خان کا معاملہ عوام کی عدالت کے سامنے پیش کرے۔ اس کے بعد جذبات سے بھرا ہوا ہجوم صدر کی رہائش گاہ جائے اور اسے گھیرے میں لے کر یہ مطالبہ کرے کہ یحییٰ خاں اقتدار چھوڑ دے اور اس کا عہدہ اصغر خاں سنبھال لے۔

ایر مارشل رحیم خاں اور جنرل گل حسن اقتدار بھٹو صاحب کو منتقل کرنے کے حق میں تھے۔ انھوں نے مصطفیٰ سے بہت قریبی رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ رحیم خاں نے مصطفیٰ کو پیرزادہ کے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ لیاقت باغ کا جلسہ افراتفری کا شکار ہو گیا۔ (خورشید حسن میر اور مصطفیٰ کھر نے پکا انتظام کیا تھا کہ ایسا ہو کر رہے۔ لیاقت باغ فائرنگ کیس ابھی تک زیر سماعت ہے۔ ملزمان میں سے ایک مصطفیٰ ہے۔)

جنرل گل حسن اور رحیم خان صدر کے پاس گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی فوجی بغاوت تھی۔ انھوں نے یحییٰ کو بتادیا کہ اسے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ اور یہ کہ بھٹو صاحب کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی جائے۔ یحییٰ کو سرکاری طور پر گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ انھوں نے یحییٰ سے کہا کہ بس بہت ہو گئی۔ وہ یحییٰ کو مزید کوئی چکر چلانے کا موقع نہیں دیں گے۔

مصطفیٰ کو مطلع کر دیا گیا۔ گل حسن نے بھٹو صاحب سے بات کی جو اس وقت روم میں تھے بھٹو صاحب پاکستان کی صورت حال کے بارے میں ابھی تذبذب کا شکار تھے۔ ان کے لیے جنرلوں پر بھروسہ کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں اس بارے میں ٹھوس ضمانتیں فراہم کی جائیں کہ عنانِ اقتدار ان کے حوالے کر دی جائے گی۔ ان ضمانتوں کے بغیر وہ واپس آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہ یقین دہانی انھیں مصطفیٰ نے کرائی۔ "ذمے داری میری ہے۔ اقتدار آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ از راہ کرم فوراً واپس آجائیے"۔

خصوصی طیارہ روم بھجوایا گیا۔ بھٹو صاحب واپس آگئے۔ انھیں صدرِ پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ مصطفیٰ کھر کو پنجاب کا گورنر اور زونل "اے" کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ دونوں ساتھی اپنا اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ڈھاکہ میں ابھی مرنے والوں کو دفنانے کا کام جاری تھا۔ پاکستان کا نقشہ نئے سرے سے کھینچا جارہا تھا۔

بھٹو صاحب نے مجیب الرحمٰن کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیاست دان کے طور پر وہ خوب سمجھتے تھے کہ سیاست میں مستقل دشمن کوئی نہیں ہوتے۔ مجیب کو پھانسی کی کوٹھری سے نکال کر صدر کی رہائش گاہ لایا گیا۔ مصطفیٰ اور بھٹو صاحب نے اسے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ مجیب ان واقعات سے بالکل بے خبر تھا جن کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آچکا تھا۔ مجیب نے ادھر ادھر نظر ڈالی اور بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا صدر کا عہدہ انھوں نے سنبھال لیا ہے۔ بھٹو صاحب مسکرائے اور بولے۔ "ہاں۔ اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی میں ہوں۔" سب ہنس پڑے۔ مجیب کو ڈالروں کی صورت

میں ایک خاصی بڑی رقم اور انگلستان کے راستے بنگلہ دیش پہنچانے کے لیے ایک خصوصی طیارہ فراہم کیا گیا۔ مجیب نے ان ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کرانے میں مدد دینے کا وعدہ کیا جو بھارت میں قید تھے۔ اس نے بھٹو صاحب کو یقین بھی دلایا کہ وہ کوئی ایسی صورت نکالنے کی کوشش بھی کرے گا جس کے ذریعے پاکستان کے ساتھ کسی قسم کی ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن قائم ہو جائے۔ بھٹو صاحب اور مصطفیٰ مکمل رازداری کے ساتھ مجیب کو رخصت کرنے گئے۔ جب مجیب کا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو ان دونوں نے کہہ لیا کہ پاکستان اب وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔

مصطفیٰ ڈھائی سال تک پنجاب کا گورنر رہا۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ وہ موثر منتظم ہے۔ اس کا اکثر اپنے نامی گرامی پیش رو کالاباغ، سے موازنہ کیا جانے لگا۔ مصطفیٰ کالا باغ سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی تھا اور عوام کا منتخب نمائندہ بھی۔ صدر کے بہت قریب تھا۔ اسے صدر کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ اس کے پاس ہر طرح کی اپوزیشن کو لگام دینے اور کچل ڈالنے کا اختیار تھا۔ وہ ہڑتالوں کی اس وبا پر قابو پانے میں کامیاب رہا جو روز افزوں توقعات کی وجہ سے پھوٹ پڑی تھی۔ جمعیت علمائے اسلام کی کمر توڑنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ قانون اور امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پا لیا گیا اور صوبے بھر میں ڈاکہ زنی کی جو لہر آئی ہوئی تھی وہ مکمل طور پر ٹھنڈی پڑ گئی۔

بطور گورنر ایک لحاظ سے مصطفیٰ کا کام آسان ہو گیا تھا۔ یہ سرخوشی ابھی فضا میں تھی کہ حکومت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ مصطفیٰ کو عوام کی طاقت کی سمجھ بھی تھی اور وہ اس طاقت سے موثر انداز میں کام بھی لیتا تھا۔ جب صوبائی پولیس فورس نے ہڑتال کی تو مصطفیٰ نے اپنا ردعمل ظاہر کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ اس نے اعلان کیا کہ ہڑتال بغاوت ہے اور عوام سے درخواست کی کہ قانون اور امن عامہ کی ذمے داری سنبھال لیں۔ اس نے کہا کہ عوام پولیس چوکیوں پر ڈیوٹی دیں اور ٹریفک کی نگرانی کریں۔ اس نے پولیس کو الٹی میٹم دیا۔ "چوبیس گھنٹے کے اندر کام پر واپس آجاؤ ورنہ تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔" پولیس والے ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ مصطفیٰ کی دھمکیاں پھوکی نہیں ہوتیں انہیں نظر آنے لگا تھا کہ گورنر کسی پس و پیش کے بغیر ساری پولیس فورس کو برطرف کر کے بے روزگار لوگوں کے جم غفیر سے نئے رنگروٹ بھرتی کر لے گا۔ مصطفیٰ ان میں سے نہیں تھا جو بلیک میل کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

نوکر شاہی سیاست دانوں کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتی آئی تھی۔ اس کے کرتا

اور ہی طبقے کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کی نظر میں پی پی پی ایک سست نما غول تھی، بھگوڑوں کی جماعت تھی۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ بطور جماعت یہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گی کیونکہ اس سے وابستہ لوگ ہنگامہ آرائی پر مبنی سیاست چلانے کے عادی تھے اور انتظامی امور کی روکھی پھیکی دنیا سے مانوس نہ تھے۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ پارٹی مشینری اس کی پشت پر ہے۔ اس نے انتظامیہ پر ثابت کر دیا کہ جہاں تک نئی نئی باتیں سوچنے اور پالیسی پر عمل درآمد کرانے کا تعلق ہے وہ کسی طرح اس سے بٹا نہیں۔ اس نے واضح کر دیا کہ نوکر شاہی کا کام عوامی حکومت کی خدمت کرنا ہے۔ اس کا کام پارٹی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ جس افسر میں ولولے کی کمی پائی جاتی یا جو جان بوجھ کر سست رفتاری کا مظاہرہ کرتا اسے موقوف کر دیا جاتا۔ مصطفیٰ پہلے خود مثال قائم کرتا تاکہ دوسرے اس کی خوشی خوشی تقلید کریں۔ وہ سچے دل سے اس نعرے پر یقین رکھتا تھا کہ "طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" اور دوسرے سیاست دانوں کی بہ نسبت عوام کی طاقت کو زیادہ ذہانت سے کام میں لاتا تھا۔

فوج کو ابھی پوری طرح بے اثر نہیں بنایا جا سکا تھا۔ بھٹو صاحب کو علم تھا کہ انہیں بالاخر اقتدار کی رفعتوں تک پہنچانے میں مسلح افواج کے دو سینئر افسروں۔ گل حسن اور رحیم خاں کا ہاتھ ہے۔ فوج سے معاہدہ یہ طے پایا تھا کہ اقتدار میں ان کا بھی ساجھا ہو گا۔ اس شراکت سے نہ سول حکومت مطمئن تھی نہ فوج۔ جب معاہدے کے فریقین نے اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کی حدود کا تعین کرنا چاہا تو خاصا کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ بھٹو صاحب کو مسلح افواج کا کردار گراں گزرتا تھا۔ وہ عملی سیاست کے بڑے زیرک طالب علم تھے اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ بونا پارٹزم سے انھوں نے کوئی سبق نہ سیکھا ہو۔ انہیں پتہ تھا کہ فوج کے اندر سے ایسے طالع آزما ابھر کر سامنے آتے رہیں گے جو اس انقلاب کو جس کی وہ رہنمائی کر رہے تھے، ملیامیٹ کر سکتے ہیں۔ بادشاہ گروں کو اکثر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ بادشاہ تو وہ خود ہیں۔

چھوٹی موٹی بدمزگیاں ہوتی رہیں۔ اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھٹو صاحب نے اطلاعات کی نہایت حساس وزارت حفیظ پیرزادہ کے سپرد کر دی۔ ٹی وی کا نیٹ ورک حفیظ کے احکام کا تابع تھا۔ حفیظ نے فوج کی حساسیت کو پرکھنے کا فیصلہ کیا۔ ٹی وی کے نیوز سیکشن کو حکم دیا گیا کہ ڈھاکہ میں بھارتی افواج کے سامنے پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی تصویریں نشر کی جائیں۔ حفیظ محسوس کرتا تھا کہ فوج اور عوام کے شتر مرغ جیسے انداز نظر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ وہ فوجی بوٹوں کو روندنے چلا تھا۔ گل حسن، جناب فوج کا سی ان سی تھا، پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھٹو کو فون

کیا۔ وہ اس "لغزش" پر سخت برہم تھا۔ "اس شخص کو فوراً ہٹایا جائے۔" بھٹو صاحب کے پاس جنرل کے کہے پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ حفیظ کو ہٹا کر یہ اہم وزارت زیادہ قابل قبول کوثر نیازی کے حوالے کر دی گئی۔ گل حسن کا لہجہ خار بن کر کھٹکتا رہا۔ بھٹو صاحب کی سمجھ میں آگیا کہ فوج اور سول حکومت کے مابین اختیارات اور مراتب کی اس تقسیم کی ناکامی مقدر ہو چکی ہے۔ انھوں نے جان لیا کہ گل حسن اور رحیم خان کو نکالنا پڑے گا۔ ان کی جگہ ایسے افسروں کو دینی ہوگی جو بھٹو صاحب کے وفادار ہوں۔ ایسے افسروں کی کوئی گنجائش نہ تھی جو یہ کہیں کہ ہمیں اتنا تاوان دیتے رہو تو ہم تمھاری قانونی حیثیت کو کچھ نہ کہیں گے۔ بھٹو صاحب نے اس سلسلے میں پہل کرنے کا فیصلہ کیا۔

انھوں نے دونوں بادشاہ گروں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ وہ مصطفیٰ، حفیظ، ممتاز بھٹو اور جتوئی صاحب کو اعتماد میں لے چکے تھے۔ انھیں بھی ڈنر میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ بھٹو صاحب فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ دونوں افسروں سے مستعفی ہونے کے لیے کہیں گے۔ اگر افسروں نے استعفے دینے میں ہچر مچر کی تو اس غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے بھی منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب ان استعفوں کا مضمون تیار کرنے کے لیے سٹڈی روم میں چلے گئے اور اپنے چار قریب ترین ساتھیوں سے کہا کہ اتنی دیر وہ صورت حال کو سنبھالیں۔ دونوں افسر آپہنچے۔ ان کے اے ڈی سی بھی ساتھ تھے اے ڈی سی حضرات سے کہا گیا کہ وہ بغلی کمرے میں انتظار کریں۔

گل حسن نے دیکھ لیا کہ چاروں میزبانوں کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہیں۔ وہ پوکر کے بڑے کھلاڑی تھے۔ پوکر کا اچھا کھلاڑی تو اپنے چہرے مہرے کی کیفیت سے پتا ہی نہیں چلنے دیتا کہ اس کے پاس کیسے پتے ہیں۔ گل حسن نے بھانپ لیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے وزیروں سے پوچھا کہ بھٹو صاحب کہاں ہیں۔ کہنے لگا کہ اس کی اور بھی مصروفیات ہیں جو فوری توجہ چاہتی ہیں اور وہ اسی صورت میں رکے گا کہ صدر صاحب موجود ہوں۔ کھڑے کھڑے بہانہ گھڑا گیا۔ بھٹو صاحب کسی سفیر سے بات چیت کرنے میں مصروف ہیں اور تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔

حفیظ نے سٹڈی میں جا کر بھٹو صاحب سے کہا کہ وہ باہر آجائیں کیونکہ بلبلوں کی موجودگی میں کبوتر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ کہیں اڑ ہی نہ جائیں۔ بھٹو صاحب سٹڈی سے برآمد ہو کر اس تناؤ بھری محفل میں شامل ہو گئے۔

بھٹو صاحب نے تقریر کی اور بتایا کہ اس موقع پر ان کا مستعفی ہونا کیا اہمیت اور معنی رکھتا ہے۔ انھوں نے دونوں افسروں کو سنہرے مصافحے کی پیشکش کی۔ گل حسن نے کھٹ سے انکار کر دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بھٹو صاحب ڈرا دھمکا کر کام نکالنا چاہتے ہیں اور

اگر وہ ڈٹا رہا تو ان کی ترکی تمام ہو جائے گی۔

اس نامبارک سکوت میں ان کاغذوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا، جن پر استعفے تحریر تھے، کوئی آواز نہ آرہی تھی۔ بھٹو صاحب نے کاغذات افسروں کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں کے ہاتھ میں قلم تھما دیے گئے۔ رحیم نے صورتِ حال کی گھمبیرتا کو سمجھ لیا۔ ان کا انکار ملک کو ایک گہرے بحران میں جھونک دے گا۔ سول حکومت اور فوج کے درمیان کھلم کھلا ٹکراؤ تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ فوج میدان جنگ میں اپنی شکست کے شرم ناک داغ کو ابھی دھو نہ سکی تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ واحد موقع تھا جب فوج کو ایک بہت ہی بے ڈھب وکٹ پر کھیلنا پڑ رہا تھا۔ اس نے دستخط کر دیے۔

گل حسن کا دل چاہ رہا تھا کہ بحران کی نوبت آجائے تو خوب ہو۔ اس کے ذہن میں صرف ایسے منصوبے تھے جو مختصر مدت کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ فوج صورتِ حال پر قابو پا سکتی ہے۔ اس مرحلے پر کمزوری کا ثبوت دیا گیا تو فوج کے وقار کو مزید دھچکا لگے گا۔ اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

جس بات کا وہم گمان بھی نہ تھا وہی پیش آگئی۔ بھٹو صاحب اور ان کے ساتھیوں کے پاس پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ جنرل گل حسن صدر کی رہائش گاہ سے نکل کر اپنے کور کمانڈروں کو کاروائی کے لیے مجتمع کر سکتا تھا۔ ادھر اس کے سامنے فوجی بغاوت کے سوا کوئی راہ عمل نہ تھی۔ ادھر اس سے زبردستی دستخط کرانے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس واقعے کے بعد اگر وہ اپنے عہدے پر فائز رہا تو پی پی پی اور فوج کے تعلقات کی نوعیت تناؤ مسلسل کی شکل اختیار کر لے گی۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ کسی کو پلک جھپکنے کا بھی یارا نہ تھا۔ دونوں طرف سے بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔

مصطفیٰ اٹھا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا گل حسن کے پاس پہنچا، جو بیٹھا ہوا تھا، چھا جانے والے انداز میں اس کے سر پر کھڑے ہو کر مصطفیٰ نے اس پر قہر بھری نظر ڈالی۔ "میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ آپ دستخط کر دیں۔" مصطفیٰ کے آمادہ بہ فساد لہجے سے کام بن گیا۔ رہی سہی کسر رحیم خان کے قائل معقول کرنے والے انداز سے پوری ہو گئی۔ گل حسن نہایت طوعاً و کرہاً اپنے عہدے سے دست بردار ہوا۔ دستخط کرنے کے فوراً بعد اس نے اپنے اے ڈی سی سے ملنا چاہا۔ اسے اجازت نہ دی گئی۔ "ابھی نہیں" بھٹو صاحب نے کہا۔

وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر کو فون کیا گیا۔ یہ نحیف و نزار انجینئر جلد ہی بجلی کوٹھڑ میں

سفر کرتا نظر آیا۔ اس کا مشن -- جنرل ٹکا خان کو اوکاڑہ سے اسلام آباد لانا۔ بنگال کے بوچڑ کو بحال کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اسے فوج کا سی ان سی مقرر کیا جا رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے اس پر جو احسان کیا اسے ٹکا خان نے کبھی بھلایا نہیں۔ وہ آگے چل کر پیپلز پارٹی کا گرم جوش وفادار ثابت ہوا۔

صدر کی رہائش گاہ کے پچھلے دروازے پر ایک کار انتظار میں کھڑی تھی۔ جنرل ٹکا خان کے عہدہ سنبھالنے تک ان دونوں افسروں کو دنیا بھر سے الگ تھلگ رکھنا ضروری تھا۔ ان کا استعفےٰ دینے سے مکر جانا یا یہ کہنا کہ استعفےٰ جبراً لیا گیا تھا بھٹو صاحب کو مہنگا پڑتا۔ ان دونوں حضرات کو چوری چھپے صدر کی رہائش گاہ سے باہر پہنچا کر کار میں دھکیل دیا گیا۔ سٹیئرنگ وھیل مصطفےٰ نے سنبھالا۔ وہ بہت اچھا ڈرائیور تھا اور اسے کار تیز چلانے میں مزہ آتا تھا۔ ممتاز بھٹو محافظ بن کر مصطفےٰ کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ جتوئی صاحب کو بونا پارٹسٹ بننے کے خواب دیکھنے والے دونوں بدنصیبوں کے درمیان بیٹھنے کا ناقابل رشک فریضہ انجام دینا تھا۔ پی پی پی کے تینوں جیالے مسلح تھے۔ اگر افسران کا کہا ماننے سے انکار کرتے تو وہ اپنے اسلحہ کو کام میں لائے بغیر نہ رہتے۔

مصطفےٰ نے لاہور کا رستہ لیا۔ وہ زناٹے بھرتے ایک شہر کے بعد دوسرے شہر سے گزرتے گئے۔ وہ ابھی تک خاصے نروس تھے۔ اگر افسروں کی غیر موجودگی کسی کے نوٹس میں آ گئی تو کیا ہو گا؟ کیا گل حسن خطرے کو پہلے سے بھانپ کر آئی ایس آئی کو مطلع کر چکا تھا؟ جو اسے ڈی سی انتظار کر رہے تھے اگر انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ ان کے افسرانِ بالا کو اغوا کرنے کی سازش کی گئی ہے؟ مصطفےٰ نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔

ہیڈ لائٹوں کی تیز روشنی میں مصطفےٰ کو ایک چیک پوائنٹ دکھائی دیا۔ روڈ بلاک پر سرتاپا مسلح فوجی ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ یہ ایسا لمحہ تھا جسے پی پی پی کے تینوں آدمی کبھی فراموش نہ کر سکے۔ پل بھر کے لیے انہیں لگا کہ کھیل ختم ہو گیا۔ مصطفےٰ جس رفتار سے کار چلا رہا تھا اسی رفتار سے سوچ بھی رہا تھا۔ اس نے روڈ بلاک سے رکے بغیر گزر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ معمول کی کسی پڑتال کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیا پتہ کوئی فوجی اپنے کمانڈر ان چیف کو پہچان کر سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دے۔ وہ روڈ بلاک سے گزر گئے اور انہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ بہت وقت گزر جانے کے بعد مصطفےٰ نے پچھلا منظر دکھانے والے آئینے پر نظر ڈالی۔ اسے جتوئی صاحب کی جھلک دکھائی دی جو اپنے دونوں قیدیوں کے درمیان پڑے سو رہے تھے۔

وہ لاہور پہنچے، داتا صاحب کے پاس سے گزرے، جلدی سے کچھ دعائیں مانگیں اور

گورنر ہاؤس کے گوشۂ عافیت کا رخ کیا۔ دونوں اعلیٰ افسروں کو کمرا نمبر دس میں ٹھہرایا گیا۔ انہیں غیر سرکاری طور پر نظر بند رکھا جا رہا تھا۔ پنجاب کے گورنر نے انہیں اغوا کیا تھا۔ وہ مصطفےٰ کے بُرے میزبان ہونے کا گلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں شلواریں قمیضیں فراہم کیں اور ان کے کمرے میں بہترین سکاچ پہنچا دی گئی۔ گورنر ہاؤس میں کسی کمرے کو پہلی مرتبہ نا رضامند مہمانوں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اگلے دن انہیں گورنر کے طیارے میں اسلام آباد لے جایا گیا۔ ان کے مستعفی ہونے کی خبر تمام اخباروں کے پہلے صفحے پر چھپ چکی تھی۔ بھٹو صاحب ان سے ملے اور کوشش کی کہ جو بدمزگی پیدا ہو چکی تھی اسے بھلا دیا جائے۔ دونوں کو بیرون ملک سفیر مقرر کر کے بعد ازاں جلا وطن کر دیا گیا۔

بھٹو صاحب اور مصطفےٰ کے تعلقات میں جلد ہی کشیدگی در آئی۔ مصطفےٰ اپنے قائد کے سر سے آزاد ہو چلا تھا۔ اب وہ بذات خود ایک سیاست دان بن چکا تھا، واضح شناخت کا مالک تھا۔ یہ امر بھٹو صاحب کو شاق گزرتا تھا کہ مصطفےٰ اور پنجاب کو لازم و ملزوم سمجھا جانے لگا ہے۔ بھٹو صاحب عمر میں بڑے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ پنجاب کتنا اہم ہے۔ وہ پاکستان کا ووٹ بینک اور پیپلز پارٹی کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ پنجاب کا ان کے ہاتھ سے نکل کر خود ان کے بنائے ہوئے فرینکن شٹائن نما عفریت کے قبضے میں چلا جانا بھٹو صاحب کو بہت مہنگا پڑتا۔ مصطفےٰ جہاں بھی جاتا اس کے خیر مقدم میں "شیر پنجاب" کے نعرے بلند ہوتے۔ وہ محسوس کرتے کہ مصطفےٰ شاید کسی وقت اپنی ابھری ہوئی انا کے بھرے میں آ کر خود ہی ملک کا قائد بننے کی کوشش کرنے لگے۔ اس موقع پر مصطفےٰ کی حرکات سے بھٹو صاحب کے شکوک اور پختہ ہو گئے۔

گورنر نے جتانا شروع کر دیا کہ وہ فیصلے اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ وہ صدر کی منظوری حاصل کیے بغیر بعض کام اپنی صوابدید سے شروع کرا دیتا۔ اسے اپنی خود مختاری عزیز تھی اور جب اسے چیلنج کیا جاتا تو بگڑ بیٹھتا۔ دونوں نے پالیسی کے معاملات حتیٰ کہ افراد کی تقرریوں تک کے حوالے سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اگر بھٹو صاحب مصطفےٰ کے نام زد افراد کو مسترد کر دیتے تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتا اور بھٹو صاحب کے تجویز کردہ متبادل ناموں پر قلم پھیر دیتا۔ وہ بہت اتھل پتھل پر اتر آیا تھا اور اس کی حرکتوں سے یہی تاثر ملتا تھا کہ پاکستان میں بھٹو صاحب کے بعد اگر کوئی ہے تو وہی ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے بعد اس کے لیے صرف ایک ہی جگہ رہ گئی تھی یعنی ملک کے سب سے اونچے عہدے پر فائز ہونا باقی تھا۔ اسے اپنی طاقت پر بڑا اعتماد تھا اور وہ جانتا تھا کہ بھٹو صاحب کو چار و ناچار اس کی بیشتر تجاویز پر صاد کرنا پڑے گا۔ اس نے بڑی استادی سے

خود کو ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا کہ اس کے گلے کو آسانی سے نکالا نہ جا سکتا تھا۔ پنجاب کو سیاسی طاقت کی مضبوط ترین اساس کی حیثیت حاصل تھی۔ مصطفےٰ نے پنجاب کی سرزمین پر بڑی مضبوطی سے قدم جما رکھے تھے۔

رفتہ رفتہ مصطفےٰ اپنے قائد کے احکامات ماننے سے انکار کرنے لگا۔ اس نے صدر پر برملا تنقید شروع کر دی۔ اس کے قابل اعتماد دوستوں میں سے بہت سے ایسے تھے جو ساری باتیں جا کر بھٹو صاحب کو بتا دیتے تھے۔ اقبال لکا نامی تحصیلدار، جسے مصطفےٰ تک رسائی حاصل ہو گئی تھی، ایسا ہی ایک مخبر تھا۔ اسے مصطفےٰ کے دلی خیالات تک کا پتہ تھا اور ان دلی خیالات تک رسائی، جناب لکا کی مہربانی سے، بھٹو صاحب کو بھی حاصل ہو چکی تھی۔ بھٹو صاحب کے ارد گرد رہنے والے لوگ بھی پنجاب کے گورنر کی روز افزوں طاقت پر کڑھتے رہتے تھے۔ وہ شکوک کے شعلوں کو ہوا دینے لگے۔ انھوں نے بھٹو سے کہا کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ بھٹو صاحب مصطفےٰ پر دو ٹوک انداز میں بھروسہ کرتے تھے۔ انہیں اس سے محبت تھی۔ وہ مصطفےٰ کی اس طرح سرزنش کرتے جیسے کوئی باپ اپنی بگڑی ہوئی اولاد کو ڈانٹتا ہے۔

اسلام آباد میں ہر طرف مصطفےٰ کی ہم سا ہو تو سامنے آئے" جیسی خوش فہمی کا چرچا ہونے لگا۔ بھٹو صاحب کو اس کی ڈینگوں سے مطلع کیا گیا۔ بظاہر مصطفےٰ نے کہا تھا کہ ملک کا اگلا صدر وہ بنے گا۔ پنجاب کے عوام اس کی پشت پر ہیں۔ وہ اسے اچانک اٹھا کر اقتدار اعلیٰ تک پہنچا دیں گے۔ بھٹو صاحب کے سیاسی شعور نے انھیں اپنے نائب کی طرف سے خبر دار کیا۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں گورنروں نے بادشاہِ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بھٹو صاحب کی برداشت سے باہر تھا کہ کوئی شخص، جو پس پردہ متنکر ہو اپنے وقت سے پہلے سٹیج پر آدھمکے۔ مصطفےٰ میں صبر کا مادہ نہ تھا۔ جو مکالمے اسے ادا کرنے تھے انھیں وہ بھٹو صاحب کی طرف سے اشارہ ملنے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیتا۔ مصطفےٰ نے اپنے موقف کو حق بجانب ٹھہرانے کی کوشش میں دلیل یہ پیش کی کہ اگر وہ انفرادی طور پر ایک قائد کی طرح ابھر کر سامنے آئے گا تو اس میں بھٹو صاحب کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ پیپلز پارٹی کو مزید رہنما درکار تھے۔ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ بھٹو صاحب بنفس نفیس ہر بات اور کام پر خود نظر رکھیں۔ اس نے بھٹو صاحب کی خدمت میں کئی بار عرض کی کہ وہ ہمیشہ وفادار رہے گا اور جو بھی حمایت اسے حاصل ہو گی وہ ساری کی ساری پارٹی کے سپرد کر دی جائے گی۔ مصطفےٰ کی یہ دلیل بھٹو صاحب نے قبول نہ کی۔ انھیں پتہ تھا کہ مصطفےٰ کو جو بھی حمایت حاصل ہے وہ پارٹی کے اندر سے ہے۔ وہ دوسری جماعتوں کے چھوٹے چھوٹے دھڑوں کو

توڑ کر ساتھ ملانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ وہ صرف بھٹو صاحب کی طاقت کی اساس کو کتر رہا تھا۔ وہ اس کیک کو بانٹ کر کھانا چاہتا تھا جسے بھٹو صاحب نے تیار کیا تھا۔

اقتدار ہاتھ آ جانے سے مصطفےٰ کی خود پسندی حد سے بڑھ گئی۔ بھٹو صاحب کو ہر ایرے غیرے اور خود ان کے وزیروں مشیروں کے ٹولے نے مصطفےٰ کی خیرہ سری کی خبر دی۔ ہر کسی کو آرزو تھی کہ بھٹو صاحب مصطفےٰ کے پر کتریں تو سہی۔

معاملات جلد ہی قابو سے باہر ہو گئے اور دونوں کھلم کھلا خم ٹھونک کر آمنے سامنے آ ڈٹے۔ آئین کی منظوری کے بعد مصطفےٰ کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا تھا۔ کراچی میں کابینہ کے ایک اجلاس کے دوران بھٹو صاحب اور مصطفےٰ کا اختلاف، جو آہستہ آہستہ پک رہا تھا، اچانک ابال کھا کر سامنے آ گیا۔

مسٹر امتیازی نامی ایک بیوروکریٹ نے اجلاس میں ایک مقالہ پڑھا جس میں واضح طور پر پنجاب سے رعایت برتی گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے امتیازی کو بیچ میں ٹوک دیا اور اس پر برس پڑے۔ "کسی کو یہ حق نہیں کہ مجھے بتائے کہ ملک کے صوبوں میں فنڈز کو کیسے تقسیم کرنا ہے۔ اگر میں چاہوں تو تمام فنڈز لاڑکانہ منتقل کر سکتا ہوں۔ مجھے عوام اختیار دے چکے ہیں۔" مصطفےٰ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "جناب، یہ درست نہیں آپ کو پورے ملک کے عوام کی خدمت کرنے کا اختیار ملا ہے۔ بات لاڑکانہ تک محدود نہیں۔ جب تک میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں پنجاب کے حقوق کا تحفظ کروں گا۔" اس مصطفےٰ کھر میں اور 1962ء کے خاموش طبع مصطفےٰ کھر میں، جو بھٹو صاحب کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے ہر لفظ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتا تھا، زمین آسمان کا فرق تھا۔

بھٹو صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنے کاغذات اٹھا کر میز پر پھینک دیے اور چراندے انداز میں بولے۔ "یا میں پاکستان کا وزیر اعظم رہوں گا یا تم وزیر اعظم بن جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ بکتے جھکتے اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔

مصطفےٰ کو اس کے ساتھیوں نے گھیر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ مصطفےٰ نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اندر جا کر وزیر اعظم سے معافی چاہے۔ مصطفےٰ اندر گیا۔ بھٹو صاحب نے اسے خبردار کیا اور آئندہ تمیز داری کا ثبوت دینے کے لیے کہا۔ "تم قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہو۔ میں سرِ عام اس طرح کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگلی بار مجھ سے علیحدگی میں بات کرنا۔"

بھٹو صاحب نے لاہور میں ایک اسلامی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ مقصد یہ تھا کہ بنگلہ دیش میں منہ کی کھانے سے پاکستان کا امیج جو بگڑا تھا اسے سنوارا جائے۔ کانفرنس کی

حیثیت ایسے جشن کی تھی جسے دیکھ کر لوگ واہ واہ کر اٹھیں۔ مختلف ملکوں کے مقتدر سربراہوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ تیل کی قیمتوں میں زبردست اضافے کی وجہ سے بہت سے مسلم ممالک راتوں رات بے انتہا امیر ہو گئے تھے اور بھٹو صاحب ان کا دل جیتنا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان کے لوگوں کو یہ منظر دکھانے کے خواہاں بھی تھے کہ مسلم امہ کے تمام رہنما مل کر بادشاہی مسجد میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ اس طرح ان راسخ العقیدہ حضرات کے اس الزام کی بھی پر زور تردید ہو جائے گی کہ بھٹو صاحب دہریے اور اوباش ہیں۔ اس کانفرنس کو کامیابی سے تکمیل تک پہنچانا مصطفےٰ کی ذمے داری تھی۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں پر انتہا کا دباؤ پڑا لیکن جو کام اس کے ذمے لگایا گیا تھا وہ اس نے کر دکھایا بلکہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کانفرنس کی تمام کارروائی بالکل صحیح طریقے سے بالکل صحیح وقت پر ہوئی۔ ذرا سا مبالغہ ہی سہی۔

ایک تقریب کے موقع پر ڈائس پر تین کرسیاں رکھی گئیں۔ لیبیا کے قذافی کے دائیں بائیں بھٹو صاحب اور مصطفےٰ کو بیٹھانا تھا۔ جب تینوں رہنما نشستیں سنبھالنے لگے تو قذافی نے اپنے نائب عبدالسلام جالود کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانی شروع کی۔ کہنے لگا کہ جالود کو آکر ڈائس پر اس کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔ جالود کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر قذافی کے پاس لایا گیا۔ بھٹو نے مصطفےٰ کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی کرسی جالود کے لیے چھوڑ دے۔ مصطفےٰ اٹھ گیا اور دوسری کرسی لائی جانے کا انتظار کرنے لگا۔ قذافی بیٹھ گیا۔ منچلا رہنما ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانے میں کامیاب رہا تھا۔ مصطفےٰ کے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا۔ اس نے بھٹو سے شکایت کی۔ "قذافی کتنا عظیم انسان ہے۔ جس عزت اور اہمیت کا نائب مستحق ہے وہ قذافی سے اسے ملتی ہے۔ آپ میں اور قذافی میں یہی فرق ہے۔ جب تک جالود کو اس کے پاس نہیں لایا گیا وہ بیٹھا تک نہیں۔"

اسلامی کانفرنس کے انعقاد سے ملاپ کرانے کا کام بھی لیا گیا۔ مجیب الرحمن کو پاکستان بلایا گیا اور بھٹو صاحب نے کانفرنس سے پیدا ہونے والے انبساط کی آڑ میں بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ شالامار باغ میں آناً فاناً استصواب رائے کی مدد سے مدعا حاصل ہو گیا۔

اقتدار میں آنے سے فائدہ اٹھا کر مصطفےٰ نے ان تمام زمینوں پر دوبارہ قبضہ جمالیا جنھیں وہ اپنی سیاسی مہم کے دوران اور اپوزیشن کا ساتھ دینے کے زمانے میں بیچ چکا تھا۔ جب وہ گورنر بنا تو اس کے پاس صرف تیس ایکڑ زمین رہ گئی تھی۔ پولیس ان تمام بد نصیبوں کو پکڑ لائی جنھوں نے مصطفےٰ سے زمین خریدی تھی اور انھیں ڈرا دھمکا کر ساری املاک سابق مالک کو لوٹانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اپنی گورنری کے زمانے میں وہ تقریباً

اپنی ان تمام زمینوں کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔

بھٹو صاحب کے بہت سے دشمن تھے۔ ملک میں جن لوگوں کو صرف اپنے مفادات سے غرض تھی وہ بھٹو صاحب کی پالیسیوں سے خوف زدہ تھے اور ان کا اسلامی سوشلزم تو انھیں زہر لگتا تھا۔ وہ ہمہ وقت انھیں کمزور کرنے اور ملک پر ان کی گرفت کا قلع قمع کرنے کی چالیں گھاتیں تیار کرتے رہتے۔ دشمنوں کو یقین تھا کہ اگر کسی طرح پنجاب کو بھٹو صاحب کے قبضے سے چھڑا لیا جائے تو ان پر زوال آتے دیر نہیں لگے گی۔ انھوں نے اپنی تمام توجہ اس مردِ واحد۔ یعنی مصطفےٰ کھر۔ پر مرکوز کر دی جو بھٹو صاحب کو پنجاب میں للکار سکتا تھا۔ انھوں نے رسم وراہ بڑھانی شروع کی۔ بھٹو صاحب کو کمزور کرنے کے ایک خوب اچھی طرح سوچے سمجھے منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز ہوا۔ اس منصوبے میں مصطفےٰ کو کلیدی عنصر کا مقام حاصل تھا۔

اسلامی کانفرنس کے فوراً بعد مصطفےٰ نے استعفےٰ پیش کر دیا۔ بھٹو صاحب نے اسے منظور تو کر لیا لیکن مصطفےٰ سے استدعا کی کہ استعفےٰ دینے کی بات کو اپنے تک ہی رکھے وہ اسے ابھی عام نہیں کریں گے۔ بھٹو صاحب نے مصطفےٰ سے کہا کہ رات کو وہ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرے اور اگلی صبح ان سے ملے۔ "ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ مستقبل میں ہمارے روابط کی نوعیت کیا ہو گی۔ یہ طے پا جانے کے بعد ہی ہم تمہارے مستعفی ہونے کا اعلان کریں گے۔"

اس رات مصطفےٰ کو بتایا گیا کہ وہ بھٹو صاحب کے دام میں آگیا ہے۔ وہ اعلان کر دیں گے کہ مصطفےٰ کو ہٹا دیا گیا ہے اور پھر اس کی برطرفی کی وجوہ گنا ڈالیں گے۔ مصطفےٰ کو اس برطرفی کا دھچکا سہار جانے یا یہ وضاحت کرنے میں کہ اسے کیوں ہٹایا گیا ہے سخت دشواری پیش آئے گی۔ مصطفےٰ نے اپنے مخبر کے کہے کو صحیفۂ آسمانی سمجھا۔ اس نے پریس کانفرنس طلب کی اور استعفےٰ کا اعلان کر دیا۔ اس نے جلد بازی سے کام لیا۔

بھٹو سخت برہم ہوئے۔ وہ مصطفےٰ سے ملنے اس کے گھر آئے۔ لاہور میں وہ ہمیشہ مصطفےٰ کے پاس ٹھہرتے تھے۔ وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ کی مرمت اور آرائش ہو رہی تھی۔ مصطفےٰ گورنر ہاؤس کی ایک کوٹھی میں مقیم تھا جس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہایت فرسودہ تھی۔ مصطفےٰ نے بھٹو صاحب کا خیر مقدم کیا اور انھیں ایک ایسے کمرے میں ٹھہرایا جس کا ساز و سامان بالکل چیتھڑا تھا۔ اس کے ساتھ جو غسل خانہ تھا اس کی حالت بھی دگرگوں تھی۔

بھٹو صاحب نوجوان میاں ساجد پرویز کو لے کر ٹیرس پر جا بیٹھے۔ انھوں نے اپنے لیے جام انڈیلا اور نظر افق پر جمادی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے۔ انھیں لگتا تھا کہ دوستیوں میں کچھ نہیں رکھا۔ سب فریب نظر ہے۔ میاں ساجد کا کہنا ہے کہ اس نے بھٹو صاحب کو اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بھٹو صاحب کے دل پر واقعی چوٹ لگی تھی اور وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے بڑی تلخی سے میاں ساجد سے مصطفےٰ کا گلہ کیا۔ "مجھے مصطفےٰ سے محبت ہے۔ ہم مل کر اس ملک کے لیے اتنا کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اس نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟ آج رات میں خود کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لوگوں پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ آج کے بعد میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ اگر مصطفےٰ کھر میرے ساتھ یہ کچھ کر سکتا ہے۔ خدایا..." انھوں نے اپنا سر اس طرح جھٹکا جیسے انھیں یقین نہ آرہا ہو۔ "مصطفےٰ کی نمود خواہی ہماری دوستی سے زیادہ اہم بن گئی ہے۔ آج بطور قائد میری ناکامی پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی ہے۔ اگر میں مصطفےٰ کی وفاداری حاصل نہیں کر سکتا تو ملک کو اپنا وفادار کیسے رکھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی حکومت کے موثر ہونے کا اسے قائل نہیں کر سکا تو دوسروں کو قائل کرنے کی امید کیسے رکھ سکتا ہوں۔" بھٹو صاحب وہاں بیٹھے شراب پیتے اور اپنے حال پر افسوس کرتے رہے۔

میاں ساجد نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ انھیں ایسی صورت حال کا سامنا ہے جس کے بحران میں تبدیل ہونے کے تمام امکانات موجود ہیں"۔ جناب، آپ ایک سنگین مسئلے سے دوچار ہیں۔ اس مسئلے سے مصطفےٰ کی بہ نسبت آپ زیادہ متاثر ہوں گے۔" بھٹو صاحب نے جام سے نظر اٹھائی۔ "تمھیں پتہ ہے ایوب کے ہاتھ سے کالاباغ بھی اسی طرح نکل گیا تھا۔ سازش۔ گھٹیا قسم کی سازش جس میں چھری چھری وار کیا جاتا ہے۔"

ساجد اقبال لگا کے ساتھ مصطفےٰ کی کوٹھی سے رخصت ہوا۔ وہ دونوں حالیہ تبدیلیوں پر بات کرتے رہے۔ ساجد نے کہا۔ "بھٹو صاحب کی چھٹی ہو گئی۔ وہ برباد ہو چکے ہیں۔ ان کا سیاسی کیریر ختم ہو گیا۔"

اسی رات اقبال لگا نے قادر حسیٰ نامی ایک شخص کو فون کر کے کہا کہ بھٹو صاحب کی زندگی خطرے میں ہے۔ کھر نے ان کا کام تمام کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ قادر حسیٰ فوراً حرکت میں آگیا۔ بھٹو صاحب کو مصطفےٰ کے گھر سے لانے کے لیے رات کے ڈھائی بجے کاریں بھیجی گئیں۔ بھٹو صاحب مصطفےٰ کو مطلع کیے بغیر کھسک آئے۔ انھوں نے صبح کے وقت مصطفےٰ کو فون کیا۔ مصطفےٰ ورزش کر رہا تھا۔ بھٹو صاحب کی آواز سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب بالائی منزل پر محو خواب ہیں۔ بھٹو صاحب

نے اپنے چلے آنے کی وجہ مصطفےٰ کو نہیں بتائی۔ کوئی بہانہ بنا دیا۔ انھوں نے مصطفےٰ سے کہا کہ ان کا اسباب گورنر ہاؤس پہنچا دیا جائے۔

بھٹو صاحب نے مصطفےٰ سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ لاڑکانہ چلے۔ ہوائی اڈے پر جب مصطفےٰ اپنے قائد کے آگے آگے طیارے پر سوار ہوا تو سناٹا کیا ہے۔ کہ بھٹو صاحب حنیف رامے کو بلا کر وزیر اعلیٰ کے طور پر چارج سنبھالنے کا کہہ رہے ہیں۔ حنیف رامے سیاہ رنگ کی اسی سرکاری مرسیڈیز میں گھر لوٹا جس میں مصطفےٰ کھر بیٹھ کر ہوائی اڈے آیا تھا۔

بھٹو صاحب اور مصطفےٰ نے بظاہر تاثر تو یہی دیا کہ بات کچھ بھی نہیں لیکن زیرک مبصروں نے بھانپ لیا کہ دونوں کے درمیان ایسی خلیج پیدا ہو چکی ہے جسے پاٹنا ممکن نہیں۔ پارٹی کے ارکان کو جو نظر آیا وہ اسی پر یقین لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب انھیں بنا رہے ہیں اور بھٹو صاحب اور مصطفےٰ کی ظاہری ان بن محض ڈرامہ بازی ہے۔ ان کے تعلقات کی خرابی کو نورا کشتی کا نام دیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حنیف رامے کو اپنے لیے حمایت حاصل کرنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ اسمبلی میں کھر کے وفادار وزیر اعلیٰ سے بگڑے بگڑے رہے اور پارٹی میں پھوٹ پڑنے کی نوبت آگئی۔ بھٹو صاحب اور مصطفےٰ اب بھی ملتے رہتے لیکن ان کا یارانہ شدید کھچاؤ کی زد میں آچکا تھا۔ چونکہ دونوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہا تھا اس لیے ان کے تعلقات میں ایک طرح کا رسمی پن آگیا تھا۔ حنیف رامے نے جارحانہ رویے کا آغاز کیا۔ اس نے طے کر لیا کہ مصطفےٰ کی شہ رگ پر وار کیا جائے۔ پریس میں بڑی زور شور سے کردار کشی کی مہم کا آغاز ہوا۔ رامے اور اس کے حواری قلم تیز کر کے مصطفےٰ کی بے راہ روی کی بہت سی مثالوں کے بارے میں صحافیوں کو بڑی بڑی رنگین کہانیاں فراہم کرنے لگے۔

حسن آباد والے واقعے کو بڑھا چڑھا کر کچھ کا کچھ بنا دیا گیا۔ ہوا یہ تھا کہ خٹک قبیلے کے بعض نوجوان دو لڑکیوں کو اغوا کر کے لے اڑے تھے۔ پریس نے اس واقعے سے مصطفےٰ کو زک پہنچانے کا کام لیا۔ حقائق بالکل الٹ تھے۔

ان میں سے ایک لڑکی کے کسی خٹک لڑکے سے تعلقات تھے۔ لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہونے کو تیار تھی۔ لڑکے نے سوچا کہ فرار کو اغواء کا رنگ دینے کے لیے لڑکی کی بہن کو بھی اٹھا لیا جائے۔ لڑکیوں کو اٹھا کر چوری چھپے صوبۂ سرحد کے قبائلی علاقے میں پہنچا دیا گیا اور قید میں رکھا گیا۔ لڑکیوں کی ماں کو سارے معاملے کا پتہ تھا۔ اس نے پولیس کے پاس شکایت درج کرائی اور ملزموں کے نام بھی بتائے۔ اس وقت ریاض خٹک گورنر ہاؤس میں تعینات تھا۔ فرض کیا گیا کہ اغوا میں اس کا ہاتھ ہے۔ پورا

صوبہ دہل کر رہ گیا اور گورنر ہاؤس کے باہر مظاہرے ہونے لگے۔ مصطفےٰ نے اس سلسلے میں ریاض خٹک سے بات کی۔ اسے بتایا گیا کہ اغوا کرنے والے کون ہیں۔ مصطفےٰ نے مفتی محمود کو فون کیا جو اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کر کے پنجابی لڑکیوں کی رہائی کا بندوبست کریں۔ مصطفےٰ نے خٹک خاندان کو الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا کہ اگر لڑکیوں کو چوبیس گھنٹے کے اندر واپس نہ لایا گیا تو خٹک قبیلے کی عورتوں کی خیر نہیں۔ پولیس نے جا کر لاہور میں خٹک ہاؤس کا محاصرہ کر لیا۔ بزرگوں نے مداخلت کی لڑکوں سے کہا کہ دونوں مقید بہنوں کو واپس بھیج دیا جائے۔ خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ لڑکیاں ایک خصوصی طیارے کے ذریعے، جسے مفتی محمود نے ازراہ کرم فراہم کیا تھا، واپس گھر آ گئیں۔

اس کہانی کو توڑ مروڑ کر اخباروں نے مصطفےٰ کو یوں پیش کیا جیسے وہ کوئی بلائے بد ہے جسے جنسی بد فعلیوں کے سوا دنیا میں کوئی کام نہیں۔ کارلیس پریس کی نظر میں مصطفےٰ اب "شیرِ پنجاب" نہ رہا تھا۔ وہ ایسا غنڈہ اور بدمعاش تھا جو اپنی ہوس کی تسکین کی خاطر لڑکیاں اغوا کر نہ جانے کتنے گھر برباد کر چکا تھا۔ پنجاب کی بیویوں اور بیٹیوں سے کہا گیا کہ "اس وقت سے ڈرو جب مصطفےٰ واپس آ جائے گا"۔ رامے اس کا پکا بندوبست کر رہا تھا کہ مصطفےٰ کی واپسی کی راہ میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوں۔

کچھ مدت سیاسی بن باس میں گزارنے کے بعد جہاں اسے محسوس ہوتا تھا کہ کسی سے کوئی تعلق نہیں رہا، مصطفےٰ کو ایک بار پھر گورنر کے عہدے کی پیشکش کی گئی۔ بھٹو صاحب نے اسے آزمائشی طور پر تین مہینے کے لیے مقرر کیا۔ انھوں نے مصطفےٰ کو بتا دیا کہ وہ اس کے رویے پر کڑی نظر رکھیں گے۔ اگر اس نے بھٹو صاحب کی مرضی کے مطابق کام کیا تو اسے وزیر اعلیٰ کا من بھاتا عہدہ واپس مل جائے گا۔

مصطفےٰ راضی ہو گیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ صرف کسی با اقتدار عہدے پر پہنچ کر ہی اپنا امیج بحال کر سکتا ہے۔ بعد ازاں اس کا استدلال یہ ہو گا کہ اگر وہ بدمعاش ہوتا تو بھٹو صاحب ہرگز ہرگز اسے گورنر مقرر نہ کرتے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ ہم پلہ طاقت بن کر وہ حنیف رامے کو بہتر طور پر اڑنگا لگا سکے گا۔ بالادستی کی کشمکش کے لیے سٹیج تیار ہو چکا تھا۔ پلڑا بااختیار وزیر اعلیٰ کے حق میں جھکا ہوا تھا۔ مصطفےٰ کو بے اختیار بادشاہ بنا کر رہنے کی عادت نہ تھی۔

اس کے گورنر بننے کی دیر تھی کہ ایک ایسا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس سے دونوں عہدہ داروں کے اختیار کی آزمائش ہو گئی۔ مصطفےٰ کے ایک قریبی ساتھی، پیر اسرار شاہ، کی خواہش تھی کہ شبیر شاہ نامی کسی مجسٹریٹ کے تبادلے کا حکم منسوخ کر دیا جائے۔ مصطفےٰ

نے بڑے اعتماد سے چیف سیکرٹری کو فون کیا اور ہدایت دی کہ تبادلے کا حکم منسوخ کر دے۔ چیف سیکرٹری کے انداز سے ظاہر نہ ہوا کہ وہ مغلوب یا مرعوب ہو کر بات سن رہا ہے۔ اس نے مصطفےٰ سے کہا کہ وہ بعد میں فون کرے گا۔ چیف سیکرٹری نے بعد میں فون پر کہا۔ "افسوس ہے، جناب لیکن اس کیس کے سلسلے میں آپ کو وزیر اعلیٰ سے بات کرنی پڑے گی۔ تبادلے کا یہ حکم خود انھوں نے جاری کیا تھا۔"

یہ جواب سن کر مصطفےٰ جھنجلا گیا۔ اس نے رامے کو فون کیا۔ وزیر اعلیٰ نے بڑی شائستگی سے لیکن استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ "کھر صاحب، بھلا ایک ادنیٰ مجسٹریٹ سے آپ کی کیا دوستی ہو سکتی ہے۔ براہ کرم اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ آخر میں بھی تو دیکھیے کہ صوبے کا نظم و نسق مجھے ہی چلانا ہے۔ آئیے، ہم ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ یہی بہتر ہے۔"

مصطفےٰ تلملا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ بالکل بے بس ہے اور اسے اپنے احکام پر عملدرآمد کرانے کا کبھی موقع نہیں دیا جائے گا۔ اس نے بھٹو صاحب کو فون کیا اور تلخ ہو کر شکایت کی کہ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ بھٹو صاحب نے اس کا غصہ ٹھنڈا کر کے وعدہ کیا کہ وہ رامے سے بات کریں گے۔

مصالحت ہو جانے کے بعد بھی سیاسی سازش نے مصطفےٰ اور بھٹو صاحب میں تفرقہ ڈالے رکھا۔ جب بھی وہ دونوں ساتھ سفر کرتے کہیں سے لوگ نمودار ہو کر "مصطفےٰ کھر زندہ باد" اور "شیرِ پنجاب" کے نعرے بلند کرنے لگتے۔ کسی کے علم میں تھا کہ بھٹو صاحب مصطفےٰ کی آزادانہ شہرت سے متنفر ہیں۔ جب بھی یہ نعرے لگتے بھٹو صاحب واضح طور پر دبک سے جاتے۔ مصطفےٰ کا خیال تھا کہ اس چال کے پیچھے رامے کا ہاتھ ہے۔ لیکن مصطفےٰ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ رامے کو روک سکتا۔ ایک بار جب داتا دربار میں بڑے بڑے ہجوم قائد عوام کے پاس سے گزر کر شیرِ پنجاب کے گرد جمع ہونے لگے تو مصطفےٰ نے دیکھا کہ بھٹو صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا ہے، ایک رنگ جا رہا ہے۔ شرارت کی جا رہی تھی۔ اب اسے روکا نہ جا سکتا تھا۔ شرارت کے پیچھے جو مقصد تھا وہ پورا ہو کر رہے گا۔ ڈاکٹر مبشر نے، جو وہاں موجود تھا، مصطفےٰ کو بتا دیا کہ قصہ ختم سمجھو۔ اس کے بعد بھٹو صاحب سے نہیں نبھ سکتی۔

آخرش بڑھتی ہوئی کشیدگی کے دباؤ میں آ کر مصطفےٰ نے گورنری سے استعفےٰ دے دیا۔ لاہور کے حلقہ نمبر چھ میں ضمنی انتخاب ہونے والا تھا۔ مصطفےٰ نے بھٹو صاحب سے کہا کہ انتخاب لڑنے کے لیے اسے پارٹی کا ٹکٹ دیا جائے۔ وہ صوبائی اسمبلی کا رکن بن کر حنیف رامے سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ بھٹو صاحب کو علم تھا کہ مصطفےٰ اسمبلی میں

پہنچ کر کیا فساد برپا کر سکتا ہے۔ انھوں نے اسے ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔ پی پی پی کے اندرونی حلقے سے تعلق رکھنے والے تمام ارکان نے بھٹو صاحب کو مصطفےٰ کے عزائم اور ناپاک ارادوں سے خبردار کیا۔ وہ دشمن نمبر ایک بن چکا تھا۔ کوشش کی گئی کہ بھلا پھسلا کر کسی طرح اسے مرکز میں لے جائیں تاکہ اس کا ڈنک نکل جائے۔ مصطفےٰ اپنی طاقت کی اساس سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ ان دونوں میں آخر کار ہمیشہ کے لیے بھوگ پڑنا ہی تھا۔ فرینکن شٹائن نما عفریت جاگ اٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ اپنے خالق پر پیچھے سے وار کرنے کی تاک میں تھا۔

اس نے پی پی پی کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے چالیس ارکان کے ساتھ خیر باد کہا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ اس کے ساتھ چالیس ارکان ہیں۔ لیکن اسمبلیوں کے یہ رکن مصطفےٰ کی پیروی کرنے کے پیمان سے پھر گئے اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے صرف سات ارکان کا چھوٹا سا ٹولا اس کے ساتھ رہ گیا۔ کھر کے وفاداروں میں میاں ساجد، چوہدری حنیف، چوہدری ارشاد، میاں تاری اور طالب حسین شامل تھے۔ ان سب پر ظلم ڈھائے گئے اور آخر دہشت ناک دلائی کیمپ ان کا ٹھکانا بنا جو انتہائی سکیورٹی والا عقوبتی قید خانہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت ہونے تک وہ اسی قید خانے میں پڑے رہے۔

مصطفےٰ نے لاہور کے حلقہ چھ سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آخر کار خم ٹھوک کر اپنے پیرو مرشد کے مقابلے میں اتر آیا تھا اور صوبے کے مستقبل پر اپنا دعویٰ جمانا چاہتا تھا۔ بھٹو دشمن احساس کی جس لہر نے رفتہ رفتہ زور باندھا تھا مصطفےٰ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے ہر طرف پھیلی ہوئی بددلی سے، جو خوش فہمیوں کے خاک میں مل جانے کا نتیجہ تھی، خوب کام نکالا اور کچلے اور روندے ہوئے لوگوں کے دلی جذبات کو گویائی بخشی جو محسوس کر رہے تھے کہ جس حکومت کو وہ اقتدار میں لائے تھے اس نے انھیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اس نے درمیانی مدت کے اس بحران کا بالکل صحیح اندازہ لگایا جس نے حکومت کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ لوگ ہجوم در ہجوم اس کے زور خطابت کی وجہ سے اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ یہ اس کی بہترین گھڑی تھی۔ وہ سیاہ و سفید کے مالک بھٹو نیم دیوتا بھٹو سے ٹکرا گیا تھا۔ جو باتیں بازاروں میں سرگوشیوں میں سننے میں آتی تھیں وہ انھیں برملا کہہ رہا تھا۔ اس کو نکتہ چینی سچائی پر مبنی معلوم ہوتی تھی۔ آخر وہ وزیر اعظم کا قریب ترین ساتھی رہ چکا تھا۔ اگر وہ بھٹو کی غلط کاریاں گنوا رہا تھا تو ضرور سچ بول رہا ہوگا۔

بھٹو صاحب کے اوسان خطا ہو گئے۔ پی پی پی کے تمام اعلیٰ عہدے دار، چھوٹے بڑے، لاہور آدھمکے۔ بغاوت کی اس رو پر بند باندھنے کے لیے آزاد کشمیر کے صدر اور وزرا اعظم، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے گورنروں اور وزرائے اعلیٰ اور وزیروں کی پوری فوج کی فوج نے لاہور آکر ایک بار اپنی صورت دکھائی۔ یہ مصطفےٰ کی طاقت کا اور اس بات کا ثبوت تھا کہ بھٹو صاحب اس طاقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس دنگا فساد سے جو شخص ڈپلومیٹک انداز میں دور رہا وہ مصطفےٰ جتوئی تھے۔ انھوں نے پرانے وقتوں کے اس دوست سے وفا کی جب وہ دونوں قومی اسمبلی کی پچھلی نشستوں پر بیٹھتے تھے اور ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ پاکستان کی اتار چڑھاؤ بھری تاریخ میں یہی دو "غلام مصطفےٰ" تھے جنھوں نے بار بار اپنے اتحاد کا ثبوت دیا۔ بھٹو صاحب نے صوبائی دارالحکومت میں ایک اجلاس کا بندوبست کر کے، جس کی تجویز صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ نے ان کے سامنے رکھی تھی، جتوئی صاحب کو اسی بہانے لاہور بلانے کی کوشش کی۔ جتوئی صاحب نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا کہ انھیں کراچی میں کچھ کام ہے۔

اگرچہ جتوئی صاحب کا تعلق سندھ کے ممتاز ترین جاگیردار خاندانوں میں سے ایک سے ہے ان کے اقدار کے نظام میں مصطفےٰ کے نظام اقدار سے کہیں زیادہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جتوئی صاحب کی شخصیت پرانے وقتوں کے جاگیرداروں کا نمونہ ہے۔ افسوس ہے کہ پرانے جاگیردار ایسی نژاد ہیں جس کا نشان مٹتا جا رہا ہے۔ غیرت مندی، راست بازی، وفاداری، سچائی اور اپنی رعیت کے ساتھ پدرانہ شفقت پرانے جاگیردار کے وہ خصائص ہیں جو فوراً نظر میں آجاتے ہیں۔ میں اکثر اس تضاد کے بارے میں حیران ہوتی رہی ہوں۔ میں نے جتوئی ہاؤس اور کھر ہاؤس دونوں کی فضا دیکھی ہے اور ان میں پائے جانے والے فرق نے ہمیشہ میرے ذہن پر اثر چھوڑا ہے۔ میں صرف اس نتیجے پر پہنچ سکی ہوں کہ اس فرق کے پیچھے بعض تاریخی اسباب کار فرما ہیں۔ کھر، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جاگیردارانہ امنگیں رکھنے والے قبائلی لوگ ہیں۔ وہ ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ، جس میں انھوں نے قبائلی رہن سہن چھوڑ کر جاگیردارانہ زندگی کی طرف قدم اٹھایا ہے، ایسا ہے جو جاگیردارانہ طرزِ بودوباش میں شگاف ڈالتا چاہتا ہے۔ زمانے کی اس چیرہ دستی کے جواب میں کھر خاندان کا عمل کسی نودولتیے جاگیردار کا سا ہے۔ انھیں اس تہذیب اور شرافت کو اپنے میں رچانے کا موقع ہی نہیں ملا جو چیدہ جاگیرداروں کی رگ وپے میں شامل تھی۔ اس ضمن میں کھر خاندان کا بھونڈا ادعا نو دولتیوں کی کرشمیوں میں شامل ہونے کے سوا کچھ نہیں۔

پاکستان میں اور بھی ایسے جاگیردار گھرانے ہیں جو شرافت کے انھیں بلند معیاروں پر پورے اترتے ہیں جن کے جتوئی خاندان کے افراد علم بردار ہیں۔ نواب صادق حسین

قریشی اور ہالہ کے مخدوم خاندان کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ ان کا رویہ دیکھ کر آدمی حیران ہو کر سوچتا ہے کہ کہیں وہ زوال آمادگی اور عیاشی، جنھیں مخصوص جاگیردارانہ عادتیں سمجھا جاتا ہے، محض خلاف از معمول باتیں نہ ہوں۔ بد قسمتی سے اس خیال میں کوئی سچائی نہیں۔ عام جاگیردار، جسے اپنے طبقے کا صحیح نمائندہ کہا جاسکتا ہے، شاید سطحی طور پر شائستہ اور تعلیم یافتہ معلوم ہو لیکن بہت کم لوگوں کو اس سطح کو کریدنے کا حوصلہ ہوا ہے۔

مصطفٰے کی بغاوت نے بھٹو صاحب کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس صدمے سے وہ کبھی پوری طرح سنبھل نہ سکے۔ ایک بار میاں لسان اللہ نے حفیظ پیرزادہ کی بیگم، سعدیہ، کے پاس کسی پیر کو بھیجا۔ سعدیہ نے پیر صاحب سے دریافت کیا کہ اس کا شوہر وزیراعظم کب بنے گا۔ یہ کہانی بھٹو صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ انھوں نے حفیظ کو بتایا۔ "اگلا وزیراعظم پنجاب سے ہو گا۔ اگر میرے بعد پی پی اقتدار میں آئی تو اس کی قیادت مصطفٰے کے ہاتھ میں ہوگی۔"

انتخاب میں دھاندلی ہوئی اور مصطفٰے ہار گیا۔ آخری جلسے میں، جو تاج پورے کے مقام پر ہو رہا تھا، بھٹو صاحب کے گرگوں نے مجمع میں زہریلے سانپ چھوڑ دیے جس سے بھاگڑ مچ گئی۔ گولیاں بھی چلیں۔ کوئی ایک لاکھ سے زیادہ آدمی اندھا دھند ادھر اُدھر بھاگنے لگے اور بہت سے پیروں تلے کچلے گئے۔

یہ واقعہ مصطفٰے کے سیاسی کیریر میں فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ وہ جلسے سے لوٹا تو بہت گھبرایا اور سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ہوش و حواس ٹھکانے نہ تھے۔ میاں ساجد ایک نوجوان کی لاش لے مصطفٰے کے گھر پہنچا۔ اس نے لاش کو ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا۔ مصطفٰے کا ردعمل غیر متوقع تھا۔ اس نے اس لمحے سے، جو سیاسی طور پر آن کی آن میں تہلکہ پیدا کر سکتا تھا، فائدہ نہ اٹھایا۔ وہ ساجد پر برس پڑا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ تم لاش لے کر یہاں کس لیے آگئے؟ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاسکتا ہے؟ لاش فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ تم اتنے احمق کب سے ہو گئے؟" ساجد حیران پریشان وہاں سے واپس چلا آیا۔ جسے وہ شیر نیستان سمجھتا رہا تھا وہ شیرِ قالین نکلا۔ ساجد کو یقین تھا کہ اگر لڑکے کے جنازے کی قیادت مصطفٰے خود کرتا تو بھٹو صاحب کے خلاف ہاری ہوئی بازی جیتی جا سکتی تھی۔ پورا پنجاب سڑکوں پر نکل آتا۔ مصطفٰے میں بھٹو صاحب کے خلاف تحریک چلانے کی اہلیت تو تھی مگر بظاہر قوتِ ارادی اتنی نہ تھی۔ وہ پولیس اور اسٹبلشمنٹ سے بہت ڈرتا تھا۔ یہ خوف اس کے جاگیردارانہ دنوں کی باقیات تھا۔ صرف اقتدار ہی تحفظ کی ضمانت بن سکتا تھا۔

اگلے دن ایک مزدور رہنما کو مار دیا گیا۔ جب مصطفٰے اس کی تعزیت کرنے گیا تو جماعت اسلامی کے آمادہ بہ جنگ کارکن اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ ٹھکائی الگ ہوئی۔ پولیس نے اس کی جان بچائی۔ مصطفٰے اعلان کر چکا تھا کہ وہ مقتول رہنما کے جنازے کی قیادت خود کرے گا۔ آخری وقت پر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وعدے سے پھر جانا بڑا مشکل تھا۔ مصطفٰے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ ایک منصوبہ گھڑا گیا۔

اگلی صبح اخباروں میں مصطفٰے کھر کے سنسنی خیز اغوا کی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس گم شدگی کا بندوبست مصطفٰے اور اس کے قریبی ساتھیوں نے کیا تھا۔ چوہدری حنیف نے مصطفٰے کو سیالکوٹ پہنچایا۔ شیرِ پنجاب کار کی ڈگی میں دبکا ہوا تھا۔ اسے سیالکوٹ اتار دیا گیا۔ ملکہ پکھراج کا بیٹا، تصویر شاہ، اس کے ساتھ تھا۔ انھوں نے لاہور کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ ایک سرِ راہے کیفے پر رکے اور کیفے کے مالک کو ایک من گھڑت کہانی سنائی۔ مصطفٰے نے کہا کہ نا معلوم اشخاص نے اسے اغوا کر کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اسے کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ کیفے کے مالک نے مصطفٰے کو پہچان لیا۔ اور گوجرانوالے کے ایس پی کو مطلع کر دیا۔ وہ فوراً آ موجود ہوا اور مصطفٰے کو ایک جیپ میں بٹھا کر لاہور چھوڑ آیا۔

اس اثنا میں مصطفٰے کی بیوی شیری کی پریشانی کے مارے حالت غیر ہو گئی۔ اس نے ہر اہم نمبر پر ٹیلی فون کیا اور بعد یہ کہ بھٹو صاحب تک سے بات کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ چیخی چلائی، روئی پیٹی۔ اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے بے قصور بھٹو پر اپنے شوہر کو اغوا کرنے کا الزام لگایا۔ "میرے شوہر کہاں ہیں؟ آپ نے انھیں ہلاک کر دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے۔ وہ کہاں ہیں؟"

مصطفٰے کا حوصلہ تو نو دو گیارہ ہو چکا تھا مگر اس کی مکاری نے ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ بھٹو صاحب اب بھی ایک دیو قامت رہنما تھے۔ مصطفٰے اپنی ہی چلائی ہوئی تحریک سے رفتہ رفتہ کنارہ کشی اختیار کر رہا تھا۔ وہ گھٹیا قسم کی اداکاری پر اتر آیا۔ واپسی کے بعد اپنی پریس کانفرنس میں کہنے لگا۔

"میں شکاری ہوں۔ ستارے دیکھ کر پتہ چلا لیا کہ گھر کس طرف ہے۔"

اس کے ستارے نہ صرف اسے راہ دکھاتے تھے بلکہ بظاہر اس کے مقدر کا تعین بھی کرتے تھے۔

رامے کو نا اہلیت کی بنا پر وزیر اعلیٰ کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ وہ مصطفٰے کھر سے مل گیا۔ دو سیاسی رقیب متحد ہو گئے، محض اس لیے کہ دونوں بھٹو صاحب سے

نفرت کرنے لگے تھے۔ انہیں تحفظ کے لیے کسی سیاسی جماعت کی ضرورت تھی۔ انھوں نے قدرے احمقانہ انداز میں مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ کیا۔ یہ ان سے سیاسی چوک ہوئی۔ مسلم لیگی قیادت نے دونوں کو خوشی خوشی قبول تو کر لیا لیکن ان سے سلوک وہی کیا جو کسی سیاسی جماعت میں نئے شامل ہونے والوں سے کیا جاتا ہے۔ پارٹی کے عام ارکان نے ان کے بارے ہیں کسی گرم جوشی کا ثبوت نہ دیا اور قیادت انھیں شک کی نظر سے دیکھتی رہی۔ ان پر بھروسہ نہ کیا جاسکتا تھا۔

مصطفےٰ ہم رنگ زمین نظر آنے کے لیے، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہا۔ کہتے ہیں کہ زندگی میں موقع صرف ایک بار دستک دیتا ہے۔ آدمی موقع پرست ہو تو دستکوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ جس پارٹی کو تشکیل دینے میں مصطفےٰ نے ہاتھ بٹایا تھا اسے چھوڑ دینا اس کے لیے کون سی بڑی بات تھی۔ جس تھالی میں کھانا، اسی میں چھید کرنا، یہ بھی مصطفےٰ سے کب بعید تھا۔ بھٹو صاحب کو ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آنے لگے۔ ہر طرف سازشوں کے جال بچھے دکھائی دینے لگے۔ مصطفےٰ کھر کے تجربے سے گزرنے کے بعد انھوں نے شاذو نادر ہی کسی کو گہرا دوست بنایا۔ انھوں نے اپنے گرد ہی حضور کہنے والے اور ایسے لوگ جمع کر لیے جو بے ضمیر تھے اور جن پروہ دھونس جما سکتے تھے۔ ان کی زبانی اکثر یہ سننے میں آیا کہ مصطفےٰ نے ان کے ساتھ وہی کیا جو بروٹس نے جولیس سیزر کے ساتھ کیا تھا۔ میرے ہم وطنو یہ گراوٹ بھی کیا گراوٹ تھی۔ گندی غداری پھولتی پھلتی رہی اور کوئی اسے روکنے والا نہ تھا۔ تیرہ سال بعد 1990 کے اواخر میں، یہی مصطفےٰ کھر صدر کے سامنے کھڑا اپنے عہدے کا حلف اٹھا رہا تھا۔ ایک منتخب پارلیمنٹ کا آئینی طور پر تختہ الٹنے والوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ اس نے خود اپنی ہی پارٹی کے خلاف کارروائی کی حمایت کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر بھٹو خاندان کے کسی فرد کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔

وہ پُر سکون دکھائی دے رہا تھا۔ غداریاں کرتے رہنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔

باب - ۸

اندھیرے دور ہوتے ہیں

(1986ء - 1988ء)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

ایشیا نے بالعموم اور برصغیر نے بالخصوص ایسی بہادر عورتوں کو جنم دیا ہے جنھوں نے اس جدوجہد کو جاری رکھا جسے ان کے گھر کے مرد نامکمل چھوڑ گئے تھے۔ بیشتر صورتوں میں جب انھوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو وہ مصائب کا شکار تھیں۔ تشدد ہمارے معاشرے میں گھر چکا ہے۔ اندرا گاندھی ہو یا مسز بندرا نائیکے، کوری اکینو ہو یا بے نظیر بھٹو، مسز حسینہ واجد ہو یا مسز ضیاالرحمن، یہ سب جریدۂ عالم پر اپنے نام ثبت کر چکی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے متوفی باپ یا شوہر کی جگہ سنبھالنی پڑی۔ عملی سیاست میں قدم رکھنے سے پہلے ان کی زندگی چین سے گزرتی تھی اور عموماً انھیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ میں ان سے مختلف تھی۔ میں نے ایک ایسے مرد سے شادی کی جو رو بہ زوال تھا، ایسا مرد جو اپنے خوابوں کے سہارے زندہ تھا، جو گرفتار ہونے سے بچنے کے لیے سرگرداں رہتا تھا، جس نے اپنی امیدوں کو بندھتے اور ٹوٹتے دیکھا تھا۔ دہشت زدگی کے اس پورے دور کو جھیل کر اور اپنی جان کی خیر مناکر میں اس کی زندگی کی بہترین ساعت میں شریک تھی۔ جب وہ میرے پہلو میں کھڑا اپنے عوام کی محبت اور اخلاص کے مزے لوٹ رہا تھا تو میرے حصے میں آنے والی شان محض اس کی عظمت کا عکس نہ تھی۔ اگر میری مساعی اور تقدیر کی ساز باز شاملِ حال

ہوتی تو مصطفےٰ کھر شاید آج آزاد نظر نہ آتا۔ زندگی میں ایک بار تو اس کی تقدیر میری مٹھی میں تھی۔ میں اس سے انتقام لے سکتی تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں عظیم تر ہستی بن کر دکھاؤں گی۔ میں نے طے کیا کہ میں اس کے کرب کو طول نہ دوں گی اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کام عوام کی عدالت پر چھوڑ دوں گی۔ عوام ہی داد گر تھے۔ بہترین منصف بھی وہی ہیں۔ آمروں تک کو ایک بار موقع دیا جاتا ہے۔

میں نے جن بہادر خواتین کا ذکر کیا انھیں اب اپنے طور پر اولو العزم ہستیوں کا مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ظلم و ستم اور استبداد کے خلاف ان کی جدوجہد جاری ہے۔ ان کی زندگیاں میڈیا کی چکاچوند میں گزرتی ہیں۔ میں اندھیرے میں دن بسر کرتی رہی۔ بس جب مصطفےٰ کو قید کر دیا گیا تو میں منظرِ عام پر آئی۔ مجھے کٹر اور بے لحاظ سیاست سے پہلی بار حقیقی معنی میں واسطہ پڑا۔ اور واسطہ پڑنے کے ساتھ ہی میری کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ امید رکھنی عبث ہے کہ نظریہ کبھی عمل کی جگہ لے سکتا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اس ہولناکی کو دیکھا، محسوس کیا اور چھوا جسے ہم یکسر بدلنے کے خواہاں تھے۔ یہ کام اتنا بڑا تھا کہ اس کے خیال سے حوصلہ پست ہونے لگتا تھا۔ لیکن کام ایسا تھا کہ اس کی لت پڑ جائے تو چھوٹتی نہیں۔

میری سمجھ میں آ گیا کہ اقتدار کے حصول کی خاطر انسان اپنی جان کیوں ہلکان کرتے رہتے ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ میں گھریلو خاتون کو ایک بے نام و نشاں قبر میں دفنا چکی ہوں۔ میری زندگی اب ایک مشن تھی۔ میں اس مشن کی حدود متعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب کوئی ایسا نہ تھا، حتیٰ کہ مصطفےٰ بھی نہیں، جو مجھے آسودہ خاطری کے ریشمی خول میں دوبارہ زبردستی دھکیل سکتا۔ مارکس کا قول کتنا درست تھا۔ عمل بیرانی یا کسی انقلابی صورت حال میں جسمانی طور پر ماخوذ ہونے کا فعل کسی مکمل مرد یا عورت کی تشکیل میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اندھیروں سے باہر قدم رکھ چکی تھی۔ میری کہانی میں کوئی غیر معمولی پن نہیں۔ ایسی بہت سی عورتوں کو یہ بالکل عام لگے گی جو جاگیر دارانہ نظام کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے انھیں ابھی لبِ گویا کی تلاش ہے۔ ان کے الفاظ یوں تحلیل ہو جاتے ہیں جیسے برف کی چوکوریاں گرم زبانوں پر رکھتے ہی پگھل جاتی ہیں۔ میں نے ان کی اس آہ وزاری کو نیا جنم دینے کی کوشش کی ہے جو ان کے لبوں تک آ کے دم توڑ گئی۔ میں صرف یہی امید رکھ سکتی ہوں کہ میری کہانی پڑھ کر ان میں سے بعض کی ہمت بڑھے گی اور وہ نکل کھڑی ہوں گی۔ ان کے اندھیرے پیچھے چلتے آئیں گے۔

بمعہ مصطفےٰ کو جلاوطنی سے لے کر گھر آئی اور وہ جیل پہنچ گیا۔ اس کا حال

اس سیلانی پرندے جیسا ہوا جو موسم گرما کی تلاش میں برفانی چوٹیوں کے اوپر سے اڑتا آیا ہو اور جسے پتہ چلے کہ آسمان تو خارزار میں تبدیل ہو چکا ہے۔

میں مصطفےٰ کے ساتھیوں کے ہمراہ لاہور پہنچی۔ وہ لندن سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے جتوئی صاحب ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ وہ نیشنل پیپلز پارٹی تشکیل دے چکے تھے۔ اس پارٹی کا مقصد یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کے پرانے اور آزردہ خاطر ارکان کی حمایت حاصل کر کے پی پی پی کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔ نیشنل پیپلزپارٹی بے نظیر بھٹو کے "انکلوں" نے خار کھا کر بنائی تھی۔ ایک تو اس کے ذریعے سے وہ بے نظیر کے تکبر کا علاج کرنا چاہتے تھے، دوسرے یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ بے نظیر اپنے والد کے معاصرین کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔

نیشنل پیپلزپارٹی کے چیئرمین جتوئی صاحب تھے۔ ان کا شفقت آمیز اور مانوس چہرہ نظر آیا تو جی خوش ہو گیا۔ ہوائی اڈے پر غلام عربی کھر بھی موجود تھا۔ وہ بھی این پی پی کا رکن بن چکا تھا۔ میاں ساجد بھی دکھائی دیا۔ وہ ابھی ابھی قید سے چھوٹا تھا۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ جو لوگ میرا استقبال کرنے آئے تھے ان میں چوہدری ارشاد اور چوہدری حنیف بھی شامل تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ لیکن یہ خوشی ابہام آمیز تھی۔ ان کا قائد میرے ساتھ نہ تھا۔ میں اس کی نمائندہ بن کر آئی تھی لیکن ہم دونوں کی تازہ جھڑپ میں کسی ہیجان پرور ڈرامے کے تمام اجزائے ترکیبی موجود تھے اور انھیں کچھ زیادہ یقین نہ تھا کہ بطور نمائندہ میں کتنے دن نکال سکوں گی۔ یہ تو انھیں معلوم تھا کہ میری قوتِ برداشت کا جتنی بار امتحان لیا گیا تھا میں ہر دفعہ کامیاب رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ میرا میاں تو قید ہے، ایسی صورت میں میں کام کیسے چلا سکوں گی۔

میرا پریس سے پہلی بار آمنا سامنا ہوا۔ مصطفےٰ نے بڑے سنسنی بھرے انداز میں میرے بچوں کو اغوا کیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کاش اغوا کی تفصیلات کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ اخبار والوں نے میری پریشانی کو بھانپ لیا۔ انھوں نے مجھے کانٹوں پر نہیں گھسیٹا۔ وہ یہ معلوم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے کہ کیا میں اپنے شوہر کی رہائی کے لیے جدوجہد کروں گی۔ میں یہ جان کر خوش ہوئی کہ انھوں نے مجھے ایسی بیوی کے روپ میں دیکھا ہے جو کسی مقصد کے لیے لڑنے بھڑنے کو تیار ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تہمینہ کے حوالے سے اچھی خبریں تیار کی جا سکتی ہیں۔ میڈیا کے لیے موزوں شخصیت کے طور پر اس کے پنپنے کے بہت امکانات ہیں۔ انھیں امید تھی کہ میں اثبات میں جواب دوں گی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے اخباروں کے کالموں میں مجھے جگہ دے کر اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔ میں ایک طویل اور

حوصلہ شکن سفر پر روانہ ہونے والی تھی۔ میں مصطفےٰ سے کیا ہوا وعدہ نباہ رہی تھی۔

پارٹی کے کارکنوں میں میرا دل زیادہ لگا۔ مصطفےٰ کو جب بھی پارٹی کے سرگرم کارکنوں سے ملنا ہوتا وہ مجھے التزاماً ساتھ لے جایا کرتا۔ میں نے اس کے ساتھ فرانس، بیلجیم، جرمنی اور انگلستان کے متعدد شہروں کا دورہ کیا۔ اکثر اوقات میٹنگ میں میرے سوا کوئی عورت نہ ہوتی۔ جب وہ مردوں سے بات کرتا تو میں اس کے ساتھ بیٹھی خاموشی سے کافی پیتی رہتی۔ میں غور سے سب کچھ سنتی اور عطف ہونے کو اپنے میں رچاتی بساتی رہی۔ مصطفےٰ کے انداز سیاست کے خاص خاص نکتوں کو یاد میں محفوظ کرتی جاتی۔ اس وقت مجھے احساس نہ تھا کہ مصطفےٰ کا رنگ کس حد تک مجھ میں رچ چکا ہے۔ میٹنگ سے لوٹ کے ہم جو کچھ کہا سنا گیا تھا اس پر بحث اور سامعین کے موڈ کا تجزیہ کرتے۔ میں وقتاً فوقتاً اپنی رائے ظاہر کرتی یا کوئی مشورہ دیتی۔ مصطفےٰ کو میری سیاسی بصیرت پر بھروسہ تھا۔

پارٹی کے کارکنوں نے مجھے گرم جوشی سے اپنایا۔ میں ایک علامت بلکہ ایسی ہستی بن چکی تھی جس کے گرد اکٹھا ہوا جا سکتا تھا۔ میں ان سے مانوس تھی۔ ہمیں آپس میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے کسی تکلیف دہ مدت سے گزرنا نہ پڑا۔ میں ویسی اناڑی نہ تھی جیسا کہ ان میں سے بعض مجھے سمجھ بیٹھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میں انہیں حیران کرنے میں کامیاب رہی اور اس حیرانی میں خوشگواری کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ سازشوں اور اہم عہدوں کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کھینچا تانی ہے میں گریزاں نہیں۔ مجھے مخلص کارکنوں اور خوشامد پرستوں میں تمیز کرنے میں دیر نہ لگتی۔ میں ہر وقت چوکس رہتی۔ کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر لطف آتا کہ ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے والے تمام گروہ بیک وقت اپنی اپنی راز کی باتیں میرے گوش گزار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سب سے یکساں سلوک کیا اور آپس کے دنگا فساد کو لگام دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ سیاست کسی طرح کی ہو، اس میں اندرونی مناقشے ناگزیر ہوتے ہیں۔ میرا کام یہ تھا کہ ان امور کا پتہ چلاؤں جو بدمزگی کا سبب بن رہے تھے اور ان کا تدارک کرنے کے لیے کوشاں رہوں۔

میں نانی اماں سے ملی جنہیں میرے باقی اہل خاندان کی طرح اغوا کے ڈرامے کے روح فرسا تجربے سے گزرنا پڑا۔ میرے بچے ان کے گھر پر میرے منتظر تھے۔ ہم پھر سے ملے تو جذبات پر قابو نہ رہا۔ یہی وہ لمحہ تھا جو مجھے واپس وطن کھینچ لایا تھا۔ میں نے آنسوؤں کی دھند کی اس پار بچوں کو کھڑے دیکھا۔ وہ صحت مند نظر آ رہے تھے۔ حقیقت میں مجھے پروا نہ تھی کہ وہ کیسے لگ رہے ہیں۔ اہمیت صرف اس بات کی تھی کہ وہ میرے پاس تھے۔ میں نے تھوڑی سی قربانی دے کر ان کی خاطر سمجھوتہ کیا تھا۔ کیا

تم سمجھ رہے تھے کہ امی کبھی لوٹ کر نہ آئیں گی؟" "نہیں ہمیں پتہ تھا کہ آپ ہمارے پاس لوٹ آئیں گی۔ ہمیں پتہ تھا بس۔" نصیرہ ان کی ترجمانی کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی امی کے دلی جذبات کو اتنی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ہم سب عدیلہ اور صائمہ کے ہاں رہنے لگے۔ لاہور میں ہمارا کوئی گھر نہ تھا۔ ہماری کوٹھی سرکار ضبط کر چکی تھی۔

این پی پی کا کنونشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس میں لوگ بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اخبار والے بھی بڑے بھرپور انداز میں موجود تھے اور اگلے دن اخباروں میں پارٹی کو خاصی جگہ دی گئی۔ جتوئی صاحب نے ڈائس پر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔ یہ میری اولین تقریر تھی۔ میں مصطفےٰ کھر کی نمائندگی کر رہی تھی۔ "مصطفےٰ کھر واپس آ چکے ہیں۔ بدقسمتی سے انہیں براہ راست آپ سے ملنے کا موقع نہیں دیا جا رہا۔ ان کے قید رہنے سے آپ کی طاقت میں اضافہ ہو گا۔ اس ملک کے کچلے اور پسے ہوئے لوگوں کی حالت سدھارنے کا کام ان کا مقدر بن چکا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جنرل انہیں اپنا یہ کردار ادا نہیں کرنے دیں گے۔ اس کے باوجود وہ بہادری سے پاکستان لوٹ آئے۔

"یہ ان کی سرشت ہی میں نہیں کہ سمجھوتہ کر لیں یا حوصلہ ہار جائیں۔ وہ یہاں جدوجہد جاری رکھنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ مارشل لا اور اس کی ناانصافیوں کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ ہم سرسری سماعت کرنے والی فوجی عدالتوں اور ٹریبونلوں کے سنائے ہوئے فیصلوں کو جھوٹا قرار دے کر مسترد کرتے ہیں۔ جنرل نہ تو ہمارے عزم کو شکست دے سکتے ہیں نہ ہماری آوازوں کو دبا سکتے ہیں۔ مصطفےٰ کھر ان بدنصیبوں کے ساتھ رہنے کے لیے واپس آئے ہیں جنہیں مارشل لا نے اپنا نشانہ بنایا ہے۔ ان بدنصیبوں کے درمیان ان کی موجودگی نے انہیں ستم رسیدہ کارکنوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ انہیں فخر ہے کہ وہ عام آدمی کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہیں۔ جنرلوں کو یہ احساس دلانا ضروری ہو گیا ہے کہ پاکستانی عوام کو ان کی غیر قانونی حکومت قبول نہیں۔

"مصطفےٰ کھر اپنے تمام ساتھیوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ جتوئی صاحب کی قیادت میں متحد ہو جائیں۔ آپ کی یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کو مصطفےٰ کی قیادت پر یقین تھا، ہے اور رہے گا۔ آپ نے ہمارا ساتھ دیا تو مصطفےٰ جلد ہی رہا ہو کر ہم سے آملیں گے۔"

مصطفےٰ کے سوا کوئی قابل ذکر رہنما جیل میں نہ تھا۔ اپنے اثاثوں کا اعلان نہ کرنے کے جرم میں اس پر اس کی غیر موجودگی میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلا تھا اور سولہ سال

قید با مشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔ مزید براں عدالت نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ اس کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ املاک اور اثاثوں کو ضبط کر لیا جائے۔

میرے پاس تھک کر بیٹھنے اور خود کو پاکستان کے حالات کے مطابق ڈھالنے کے لیے پندرہ دن تھے۔ کسی قسم کے جذباتی صدمے سے گزرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ سیاسی دوڑ دھوپ کی وجہ سے مجھے یہ موقع بھی نہ ملا کہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنی جذباتی شکستوں کا حساب کتاب کرتی۔ آخر کار ہمیں پتہ چل گیا کہ مصطفیٰ کو کہاں رکھا گیا ہے۔

اسے کراچی سے فیصل آباد کے مرکزی جیل پہنچا دیا گیا تھا۔ میں کار سے فیصل آباد روانہ ہوئی۔ بذریعہ کار لاہور سے فیصل آباد پہنچنے میں تین گھنٹے لگتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں میری اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ پُر اعتماد انداز میں کمرے میں داخل ہوا جیسے اقتدار میں ہو۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی کیفیت نہ تھی جسے دیکھ کر ترس آنے لگے۔ یہ اکھاڑہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ یہاں قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسے پتہ تھا کہ قوانین کو اپنے حق میں کیسے توڑ مروڑا جاسکتا ہے۔ وہ جیل کے عہدے داروں اور پولیس کو ڈرا دھمکا سکتا تھا۔ مصطفیٰ جو چاہتا، اسے مل جاتا۔ میں نے جلاوطنی کے برسوں میں اس کو کبھی ایسے عالم میں نہ دیکھا تھا۔ اب وہ ایسی فضا میں سانس لے رہا تھا جو اسے سراسر اپنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے پالے میں کھڑا تھا۔

این پی پی کو منظم کرنے کا کام جاری تھا۔ پارٹی کے وفادار اور سرگرم کارکن عہدے حاصل کرنے کے لیے اپنے حق میں فضا ہموار کرنے میں مصروف تھے۔ بعض اناؤں کو چرکا لگائے بغیر چارہ نہ تھا، بعض پھول کر کپا ہو چکی تھیں۔ میں درمیان میں رہ کر الہام و تفہیم کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ پارٹی کے کارکن مجھے اپنی اپنی اہلیت کا قائل کرنے کی کوشش کرتے تاکہ میں ان کے حق میں بات کر سکوں۔ میں ان کا جوش و خروش دیکھ کر خوش تو ہوئی لیکن سیاسی عہدوں کے لیے ان کی ہوس نے مجھے پریشان کر دیا۔ زیادہ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پنجاب کا صدر اور سیکرٹری جنرل کسے بنایا جائے اور مرکزی کمیٹی میں کون کون شامل ہو۔ یہ بڑا مشکل وقت تھا کیونکہ پارٹی کے کرتا دھرتا تمام جوشیلے کارکنوں کو کہیں نہ کہیں کھپانے کا جتن کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے فیصلوں کی وجہ سے ناراض کارکنوں کا ایک ریزرو جیش وجود میں آرہا ہے۔

مجھے یہ تمام معاملات مصطفیٰ کے سامنے رکھنے پڑتے۔ وہ باخبر رہنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں تو اسے صرف اتنی فکر تھی کہ کہیں اس قضیے کی وجہ سے، جس میں وہ گرفتار تھا، سب سے الگ تھلگ ہو کر نہ رہ جائے۔ اس کے نقطۂ نظر سے ضرورت اس بات کی تھی کہ کلیدی عہدوں پر اس کے اپنے آدمی فائز ہوں۔ اس کے اپنے لوگ پیش پیش ہوں

گے تو وہ اپنی باتیں منوا سکے گا۔ وہ آنے والے زمانے کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ پارٹی میں بعض عناصر اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ناجائز حربوں سے اس کا حق مار لیں گے۔ مرکزی کمیٹی لازمی طور پر ایسے لوگوں پر مشتمل ہونی چاہیے جو اس کے فیصلوں پر صاد کریں۔ وہ پارٹی کے اہم ترین ارکان میں سے ایک تھا اور اپنی اس پوزیشن سے کسی حالت میں دست بردار ہونا نہ چاہتا تھا۔

میں میدان جنگ سے ملنے والی تمام اطلاعات مصطفیٰ تک پہنچا دیتی۔ مجھے احساس تھا کہ جتوئی صاحب حکم ماننے کو تیار نہیں۔ کلیدی عہدے جتوئی صاحب کے وفاداروں میں بانٹے جا رہے تھے۔ مصطفیٰ کے ہمنواؤں کو لطیف انداز میں پس منظر کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ میں پارٹی کے جذبات کا بالکل صحیح صحیح اندازہ لگانے میں کامیاب رہی۔ ضرورت تھی کہ مصطفیٰ اپنے آپ کو خصوصاً پنجاب میں، منوائے۔ اس موقع پر اگر وہ اپنے آپ کو منوانے میں ناکام رہا تو اس کی چھٹی ہو جائے گی۔ یہ میں نے اس پر واضح کر دیا۔

پارٹی کے ایک حصے کی خواہش تھی کہ مصطفیٰ کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا جائے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر یہ کلیدی عہدہ اسے نہ ملا تو وہ عملاً تماشائی بن کر رہ جائے گا۔ ان کی رائے میں مصطفیٰ قومی سطح کا قائد تھا اور اپنے صوبائی پس منظر کو کوسوں پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ پنجاب کی سطح پر عہدہ قبول کر کے وہ اپنے قومی قد و قامت کا ناس مار دے گا۔ میں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ میں پیغامات لے کر لاہور سے فیصل آباد اور وہاں سے واپس لاہور آنے جانے میں مصروف تھی۔ بیوی کی وساطت سے قائد تک رسائی ممکن ہو گئی تھی۔ مصطفیٰ اور پارٹی کی قیادت دونوں کو پتہ تھا کہ مجھ پر تکیہ کیا جاسکتا ہے۔ میں پیغامات کو ایمانداری سے اور من و عن پہنچاؤں گی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میری اپنی بھی آراء ہیں جن کا اظہار کرنے سے مجھے اب کوئی باک نہیں اور میری ان آراء کا مصطفیٰ احترام کرتا ہے۔

پورا ہفتہ لاہور میں پارٹی کے کارکنوں کے دلائل اور دلائل کا رد سننے میں گزر جاتا۔ میں فیصل آباد تک تین گھنٹے کی ڈرائیو کے دوران اپنے خیالات کو ترتیب دیتی رہتی تاکہ مصطفیٰ کے روبرو انہیں قرینے سے بیان کر سکوں۔

مصطفیٰ میری باتیں سنتا، فراہم کردہ معلومات کا تجزیہ کرتا اور پھر اپنے پیغامات کو لفظوں کی شکل دیتا۔ میں ڈرائیو کرتی ہوئی واپس لاہور کا رخ کرتی جہاں گھر پر پارٹی والے اپنے روزانہ کے راتب کے انتظار میں ہوتے۔ پہلے میں ان سے نمٹتی۔ پھر تشویش میں مبتلا پارٹی کے کارکنوں سے ملتی جن کے مستقبل کا دار و مدار قائد کے پیغام پر تھا۔

جتوئی صاحب سے ٹیلی فون پر بات کرتی اور پھر کچھ وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزارتی اور ان کے تقاضے بجالاتی۔ مجھے شاید ہی کبھی نیند آئی ہو۔ عموماً تو بستر پر لیٹتے ہی مجھے غش آجاتا تھا۔

مصطفےٰ کی اسیری واقعتاً ہماری راہ میں رکاوٹ بنتی جارہی تھی۔ حنیف رامے کو جو این پی پی میں شامل ہو چکا تھا، پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔ حنیف رامے کی حیثیت سیاست میں اسی لڑھکنے پتھر کی سی تھی جس کے بارے میں کہاوت ہے کہ اس پر کائی نہیں جمتی لیکن میں نے اسے مہربان، شفیق اور حساس پایا۔ راؤ فرمان علی کو بھی یاد رکھا گیا۔ یہ وہی جنرل تھا جس نے ہمیں پاکستان چھوڑنے میں مدد دی تھی۔ اسے ایک اہم عہدہ دیا گیا۔ مصطفےٰ کو پنجاب میں این پی پی کا صدر مقرر کیا گیا چونکہ ان دنوں اس تک رسائی محال تھی اس لیے اس انتہائی اہم عہدے کا چارج چودھری ارشاد کو دیا گیا۔ چودھری حنیف پنجاب کا سیکرٹری جنرل مقرر ہوا۔ میاں ساجد پرویز مرکزی کمیٹی کا رکن بنا غلام عربی کھر کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ بعضوں کا خیال تھا کہ صدر اسے بنانا چاہیے تھا۔ مصطفےٰ کے پاس اپنے ساتھیوں کو یہ عہدے دلانے کا ایک ذرا ہیر پھیر والا استدلال تھا۔

اس کا خیال تھا کہ پارٹی کے عہدے داروں کو عام ارکان میں سے چنا جانا چاہیے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پارٹی کی مشینری سے ان رہنماؤں کو الگ کرنا ضروری تھا جو مستقبل میں پارلیمانی گروپ تشکیل دینے والے ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ پارٹی کے عہدے ان لوگوں کو دیے جائیں جنہوں نے ہر برے بھلے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا کہ انہیں وفاداری کا صلہ دیا جائے۔ بظاہر معلوم یہ ہوتا تھا کہ مصطفےٰ حقیقی نمائندگی میں یقین رکھتا ہے اور پارٹی کے بعض رہنماؤں کو بتوں کی طرح پوجنے کی رجحان کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔

مصطفےٰ نے جو تانا بانا بُنا تھا وہ اتنا بے غرضانہ نہیں تھا۔ وہ اپنے اتحادیوں کو اگلی صف میں اس لیے رکھنا چاہتا تھا کہ جو مصیبت آئے ان پر آئے، جو الزام لگے ان پر لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جو ہر قابل ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ اسے یقین تھا کہ جب انہیں کچھ عرصے بڑے بڑے عہدوں پر کام کرنا پڑے گا تو ان کی کمزوریاں بالکل بے نقاب ہو جائیں گی۔ اسے پتہ تھا کہ کسی سیاسی پارٹی کی تنظیم میں وہی لوگ کسوٹی پر پورے اترتے ہیں جو ہر لحاظ سے بہترین ہوں۔ ہنگامہ پسندی پر مبنی سیاست کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ان میں سے کوئی آدمی بھی امتحان میں پورا نہ اتر سکے گا۔ جب مصطفےٰ قید خانے سے باہر آئے گا تو یہ لگے گا کہ پارٹی کو منظم کرنا اس کے سوا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ آزمودہ اور تیر بہدف چال اس نے بھٹو صاحب

سے سیکھی تھی۔ ہمیشہ دھماکا کرو۔ اٹھنے والے دھوئیں میں قدم رکھو۔ پیچھے ٹکڑے اٹھاؤ۔ ثابت کردو کہ تمہارے سب ساتھی خواہ مخواہ کا بوجھ ہیں۔ خود سربلند رہو۔

مصطفےٰ محسوس کرتا تھا کہ اپنے قریبی ساتھیوں کو اہم عہدے دلا کر وہ انہیں ان تمام قربانیوں کا، جو وہ پیش کر چکے تھے، اجر دے رہا ہے۔ وہ ایک ہی وار میں کئی شکار کرنے چلا تھا۔

مصطفےٰ اور جتوئی صاحب کے درمیان طویل رفاقت کی وجہ سے میرا شوہر قائل ہو چکا تھا کہ سندھ کا یہ وڈیرا بہت ہی شریف النفس سیاست داں ہے جو اپنے ہاتھ آلودہ کرنے پر تیار نہ ہوگا۔ مصطفےٰ کا اندازہ درست تھا۔ جتوئی صاحب بنی بنائی تنظیموں کے اندر کام کرنے کے عادی تھے۔ اس کے برعکس مصطفےٰ کو اور ہی سطح پر سیاست کرنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ یہ توقع اسے پُر جوش بنانے کے لیے کافی تھی کہ ان دنوں کی یاد تازہ کرنے کا پھر موقع ملنے والا ہے جب پی پی پی کے ابتدائی دنوں میں وہ ملک کا دورہ کر کے پارٹی کو منظم کر رہا تھا۔ اپنے ذہن میں مصطفےٰ اس ابتری کا تصور کر سکتا تھا جو جتوئی صاحب کے سب کا بھلا چاہنے والے مزاج کی وجہ سے پیدا ہو کر رہے گی۔ وہ قید خانے کی کوٹھری میں بیٹھا، جسے تقریباً گوشۂ عافیت سمجھنا چاہیے، اس وقت کا منتظر تھا جب ڈانواں ڈول ناؤ سے اسے مدد کے لیے پکارا جائے گا۔ وہ ایسا فرد بننا چاہتا تھا جس کے بغیر کام نہ چل سکتا ہو۔ مصطفےٰ جانتا تھا کہ این پی پی عوام میں دور تک نفوذ نہ کر سکنے کے باعث بری طرح ناکام ہو جائے گی۔ اس کا منشور اور پمفلٹ آخرکار انہیں سجاوٹی کتابوں کا حصہ بن جائیں گے جن کے جتوئی ہاؤس میں بڑے قرینے سے ڈھیر لگے رہتے تھے اور جنہیں کوئی کبھی کھول کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

مصطفےٰ کی سٹرٹیجی یہ تھی کہ اس طرح غیر جانب دار بنے رہو جیسے کسی بات میں دلچسپی نہ رہی ہو۔ وہ شاذ و نادر ہی مداخلت کرتا۔ بڑی آسانی سے ہر بات مان لیتا۔ اس نے استغنا اور الگ تھلگ رہنے کا انداز اپنانا شروع کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ معاملات بگڑ جائیں۔ جب وقت آئے گا تو الزام دھرنے کے لیے وہ موقع پر موجود ہوگا۔ یہ سب اداکاری تھی۔ بہت سے لوگ یہ سمجھے کہ شیر اب کٹ کھنا نہیں رہا۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ اس کے کچھار میں جا گھسے۔ اس کا شکار بننے والوں میں خود جتوئی صاحب بھی شامل تھے۔

نئی محاذ پر مصطفےٰ نے، اور کچھ ہو نہ ہو استغنا کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ میں ابتدا میں پندرہ دن میں صرف ایک بار فیصل آباد جا کر اس سے مل سکتی تھی۔ یہ قطعی طور پر ناکافی تھا۔ ہم میں ایک روح فگار اور ڈرامائی ماجرے کے بعد پھر سے ملاپ ہوا تھا۔

ہمارے تعلقات ابھی سرسری تھے۔ جو زخم اس نے مجھے لگائے تھے ان میں اب تک جلن محسوس ہوتی تھی۔ واقعات بہت تیزی سے پیش آئے تھے۔ وہ میرا دل ابھی پوری طرح جیت نہ سکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملے تاکہ دماغ شوہری کے عمل کا ازسر نو آغاز کیا جاسکے۔ اسے میری آزادی سے چڑ تھی اور کڑھتا رہتا تھا کہ میں اتنا وقت اس سے دور رہ کر کیوں گزارتی ہوں۔ صاف عیاں تھا کہ وہ خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اس سے انتقام نہ لوں اور جانتا تھا کہ وہ مجھ سے بدلا لینے کی پوزیشن میں نہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کا ذہن ہر وقت ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے مجھ سے زیادہ بار ملنا ضروری تھا۔ وہ تن تنہا اسیری کی صعوبت اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ میں بھی قید ہو کر رہ جاؤں۔

میں نے کچھ سن کر مصطفیٰ سے یہ منوالیا کہ میں لاہور میں کوئی مکان کرائے پر لے لوں تاکہ بچوں کے ساتھ کہیں ٹک کر رہنا تو شروع کیا جائے۔ میں مکان حاصل کرنے کے لیے مری جارہی تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ میرے ہاتھ میں ہر وقت سوٹ کیس رہے۔ زندگی اس طرح نہیں گزاری جاسکتی۔ بچوں کو اچھے انگریزی سکولوں میں داخلہ مل گیا۔ اغوا کے واقعے سے انہیں بہت زیادہ نفسیاتی صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ اس بات کا ان کے پاس ایک ہی ثبوت تھا کہ وہ پاکستان کی اجاڑ جنگلوں میں گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ ان کے سروں میں جوویں ہی جوویں تھیں۔ میں دہشت زدہ ہو گئی۔ مجھے بچ بچ انہیں دھونی دینی پڑی۔ یہ ایک طویل اور سخت جنگ تھی۔ آخر کار اس وبال سر پر جراثیم کش دواؤں کو فتح حاصل ہوئی۔ میں نے سوچا، خدا کا شکر ہے، میں لوٹ آئی ورنہ جوویں میرے بچوں کو کچا کھا جاتیں۔

ہمیں ابھی چین سے بیٹھنا نصیب ہی ہوا تھا کہ مصطفیٰ نے کھنڈت ڈال دی۔ اس نے مجھے مہلت دی تھی۔ وہ مجھے فوراً بہت سختی سے رگیدنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے بڑے صبر سے کام لیا لیکن اس کی ذات میں چھپا ہوا تخریب پسند ایک بار پھر جیت گیا۔ ایک صبح ناشتے پر اخبار اٹھا کر جو دیکھا تو اس میں خبر تھی کہ مصطفیٰ کو جیل میں دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں حواس باختہ ہو گئی۔ ہوم سیکرٹری سے اپنے بیمار شوہر سے ملنے کی خصوصی اجازت حاصل کر کے جھٹ پٹ فیصل آباد کی راہ لی۔ غلام عربی اور غلام ربانی کھر میرے ہمراہ تھے۔

مصطفیٰ کو فیصل آباد ہسپتال منتقل کیا جاچکا تھا۔ ہسپتال کے ایک حصے کو ضمنی جیل کی شکل دے دی گئی تھی۔ ہسپتال کی اس طرح حفاظت کی جارہی تھی جیسے وہ کوئی

قلعہ ہو۔ اہل اقتدار کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ ہسپتال میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں کو رات بھر جاگتے رہنے پر مامور کیا گیا تھا۔ بہت سے مرد عورتیں ادھر ادھر بیٹھے کلام پاک کی تلاوت کرنے یا تسبیح میں مشغول تھے۔ وہ اپنے قائد کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔

میں نے مصطفیٰ کے کمرے میں قدم رکھا۔ مجھ پر خوف طاری تھا۔ مصطفیٰ بستر پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ "یہ پاکستان ہے۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ میں نے یہ چکر جیل کے ڈاکٹر سے مل کر چلایا ہے۔ جیل مینول میں لکھا ہے کہ اگر قیدی کی زندگی خطرے میں ہو تو اسے ہسپتال منتقل کر دیا جائے۔ یہ مینول انگریزوں نے مرتب کیا تھا۔ آؤ ان کا شکریہ ادا کریں۔ ہمارا کام قانون میں رخنے تلاش کرنا تھا، سو ہم نے تلاش کر لیے۔"

دوسری حسب مطلب شق جو مصطفیٰ نے ڈھونڈ نکالی تھی یہ تھی کہ قیدی ہسپتال میں ہو تو اس کے لواحقین روز ملنے آسکتے ہیں۔

جیل مینول میں یہ شقیں صرف انسانی ہمدردی کی خاطر شامل کی گئی تھیں لیکن مصطفیٰ نے انہیں ایک ظالمانہ چال میں بدل ڈالا جس سے الوسیدھا کرنا مقصود تھا۔ اصرار کرنے لگا کہ میں روز اس سے ملنے آیا کروں۔ اگر میں ان قواعد کی پابندی نہ کرتی جو ہمارے استعماری آقا مرتب کر کے ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے تو مجھے احساس دلایا جاتا کہ میں خطاوار ہوں۔

اب میرے وقت کو یرغمال بنا لیا گیا۔ میں ڈرائیو کر کے فیصل آباد جاتی۔ وہاں دو گھنٹے کے قریب گزارتی۔ مصطفیٰ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتی۔ ڈرائیو کر کے لاہور واپس آتی۔ اخبار والوں سے ملتی۔ کچھ وقت اپنے بچوں کے لیے نکالتی اور تھکن سے چور ہو کر بستر پر جا گرتی۔

درحقیقت مصطفیٰ کو معدے میں جلن کی شکایت تھی۔ دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ وہ مکمل طور پر صحت مند تھا۔ اس کی صحت یابی کی دعا مانگنے کے لیے روزانہ جمع ہونے والے لوگ حیران ہوتے کہ اس کے کمرے سے دھم دھم کی آواز کیسی آرہی ہے۔ ان کا قائد ورزش کر رہا تھا۔ وہ سر کے بل کھڑا، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، دنیا کو ایک ٹیڑھے میڑھے تناظر میں دیکھنے میں محو تھا۔ میری زندگی کا پھر کوئی سرپیر نہ رہا تھا۔ اگر میری نانی اور صائمہ اور میری خالائیں، ثمر اور نسرین مجھے سہارا نہ دیتیں تو میرے اعصاب بھی جواب دے جاتے اور صحت بھی۔ میری کوئی سہیلیاں تو تھیں نہیں۔ انھوں نے سہیلیوں کی کمی پوری کر دی۔ بیس دن تک مجھے بلاناغہ فیصل آباد جانا پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ بس بے ہوش ہو کر گری کہ گری۔

میرا کوئی عذر قبول نہ کیا جاتا، کوئی شکایت نہ سنی جاتی۔ میرا اس کی خدمت میں حاضر ہونا لازمی تھا چاہے مجھے تیز بخار کیوں نہ چڑھا ہو۔ وہ کبھی یہ نہ کہتا کہ تمہاری طبیعت اتنی خراب تھی تو تم نہ آتیں۔ اس کے خیال میں مجھے تو آنا ہی تھا۔ بیوی ہونے کے ناتے یہ میرے فرائض میں شامل تھا۔ وہ قیدی ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی ہمدردی کا مستحق تھا۔ محض اس لیے کہ وہ مصیبت میں گرفتار تھا میں نے خود کو اس کی ہر من مانی کے آگے سر جھکاتے دیکھا۔ گو وہ نامعقولیت اور بے حسی کا ثبوت دے رہا تھا میں اس سے جھگڑ نہ سکتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں اس وقت برابری کی سطح پر بات نہ کر سکتے تھے میں صورت حال کو مزید بگاڑنا نہ چاہتی تھی۔ وہ مستقل غیر یقینی کے عالم میں جی رہا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس کے مستقبل کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ کتنی مدت جیل میں رہنا پڑے گا۔ اس کی بے چارگی بالکل عیاں تھی۔

اچانک اس کی ماں جی بیمار ہو گئیں۔ انھیں ملتان کے نشتر ہسپتال لے جایا گیا۔ مصطفیٰ کو بھی وہیں منتقل کر دیا گیا۔ قدرتی طور پر مجھ سے بھی یہی توقع کی گئی کہ آزمائش کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہوں گی۔ ملتان میں میں نے میاں مشتاق اور اس کی بیوی شاہدہ کے پاس قیام کیا۔ دونوں میاں بیوی بڑے کمال کے میزبان ثابت ہوئے۔ مصطفیٰ کی ماں جی پر مہینے بھر غشی کا عالم طاری رہا۔ میں ایک دن بھی ان کے پاس سے نہ ہلی۔ میرے بچے سکول کی وجہ سے لاہور میں تھے اور صرف جمعرات اور جمعے کو ہمارے پاس آ سکتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال دائی عائشہ کے ذمے تھی اور میں نے محسوس کیا کہ انھیں اتنی توجہ نہیں مل رہی جتنی ملنی چاہیے۔ میں مصطفیٰ سے کہتی رہتی کہ مجھے لاہور جانے دو۔ وہ ہمیشہ انکار کر دیتا۔ مجھے اس بارے میں لیکچر پلایا جاتا کہ بطور بیوی اور بہو مجھے کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا کہ جو کردار مجھے دیا جا رہا تھا اس کے لیے میں سراسر ناموزوں تھی۔ ماں کا کردار ادا کرنے کی آرزو مند تھی۔

آخر کار مصطفیٰ کی ماں جی وفات پا گئیں۔ مجھے لگا کہ میری جبری قید ختم ہونے کا وقت آ پہنچا۔ مصطفیٰ کے ذہن میں کچھ اور منصوبے تھے۔

دل کے ایسے عارضے کے علاج کے لیے جس کی تشخیص نہ ہو سکی تھی، جو اتنا نادر تھا کہ اسے معدوم سمجھنا چاہیے، مصطفیٰ ملتان ہی میں ٹھہرے رہنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں بچوں سمیت ملتان چلی آؤں۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں ابھی ابھی لاہور میں ایک مکان میں منتقل ہوئی تھی جس کا ظاہری روپ تازہ تازہ سنوارا گیا تھا۔ بچوں کا اپنے اپنے سکولوں میں دل لگ گیا تھا۔ مصطفیٰ کی بات کی کوئی تک نہ تھی۔

میرے بچے جس معیار کے سکولوں میں پڑھنے کے عادی ہو چکے تھے ویسا ایک بھی سکول ملتان میں نہ تھا۔ "تم جیل میں ہو۔ تمہیں چاہیے کہ جیل میں زندگی گزارنا سیکھو۔ بطور سیاست دان۔ وقار کے ساتھ۔ تم آخر مجھ سے کیوں چمٹے رہنا چاہتے ہو؟ ہمیں بچوں کی زندگی کوئی ترتیب پیدا کرنی ہے۔ اگر تمہیں چودہ برس جیل میں رہنا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ بھی بے آرامی کی زندگی گزاریں؟" مصطفیٰ کا ردعمل یہ تھا۔ "مجھے پتہ تھا۔ مجھے پتہ تھا تم یہی کرو گی۔ تم نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔ اور اب تم اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔"

ہمارے وکیل اور دوست، ایس ایم ظفر نے ملتان میں مجھ سے کہا کہ بری بھلی جس طرح زندگی گزرتی ہے گزار دو۔ مجھے مصطفیٰ کی من مانیوں کے سامنے جھکنا یا اس کا دم چھلا بنے پھرنا نہ چاہیے۔ کاش یہ بات وہ مصطفیٰ سے کہتے۔ لیکن پھر یہ بھی تو ہے کہ اچھے وکیل اپنے مؤکلوں سے ہدایات لیتے ہیں، مؤکلوں کو ہدایات دیتے نہیں۔

حسب معمول مصطفیٰ نے مجھے زچ کر دیا۔ ہمارے گھر کے سارے سازو سامان کو اٹھا کر ملتان پہنچانا پڑا۔ بچوں کو ایسے سکولوں میں داخلہ ملا جہاں کے استاد انگریزی لفظوں کے تلفظ اور معنی کے لیے میرے ننھے منوں سے رائے طلب کرتے تھے۔ بچے حیران بھی ہوئے اور تھوڑے سے پریشان بھی۔ ہم سب میاں مشتاق اور شاہدہ کے پاس مقیم تھے۔ وہ بہت مہمان نواز تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری وجہ سے وہ خاصے بے آرام رہتے ہوں گے۔ ان کے تین اپنے بیٹے تھے اور مکان بھی حویلی نما نہ تھا۔ اپنے چار بچوں اور ملازمہ کے ساتھ ان کے ہاں رہتے ہوئے مجھے لگتا تھا جیسے میرا کسی نامعقول قسم کے قبضہ گروپ سے تعلق ہے اور میں زبردستی وہاں ٹکی ہوئی ہوں۔ بہرحال، خرابی صحت کے باعث مجھے وہاں سے بے دخلی کا نوٹس مل گیا۔

میں بیمار ہو گئی۔ میرے سینے پر ایک CYST نمودار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ بایوپسی کرانی پڑے گی۔ مجھے سخت فکر لاحق ہوئی۔ نانی اماں بھی بہت پریشان ہوئیں۔ انھوں نے تقاضا کیا کہ کم از کم کچھ دیر کے لیے تو میں مصطفیٰ کو بھلا کر اپنی صحت کا خیال رکھوں۔

مصطفیٰ کو مطلع کیا گیا کہ مجھے آپریشن کرانا پڑے گا۔ "کرا لو۔ یہیں پر۔ اسی ہسپتال میں۔" میں نے بلا تامل انکار کر دیا۔ وہاں آپریشن کرانے کے خیال ہی سے مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ہسپتال کیا تھا، ڈراؤنا خواب تھا۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ حفظان صحت کا کوئی خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں ہولناک کہانیاں صرف سنی ہی نہ تھیں بلکہ اپنی ساس کی بیماری کے دوران وہاں کے حالات کو بچشم خود بہت

قریب سے دیکھا تھا۔ آپریشن تھیٹر کی روشنیاں نازک مزاج واقع ہوئی تھیں اور جنریٹر اپنی مرضی کا مالک تھا۔ لوڈشیڈنگ کسی طرح سے عین اسی وقت ہوتی تھی جب بنگامی آپریشن کیے جارہے ہوں۔ آپریشن کے بعد مریض کی دیکھ بھال کے تصور سے ہسپتال کا عملہ بالکل ناآشنا تھا۔ ٹانکوں میں پیپ پڑ جانے کے کیس نشتر میڈیکل ہسپتال میں روز ہوتے تھے۔

میں مصطفےٰ کی ماں جی کے کیس کا ذکر کیا۔ "دیکھو ان لوگوں نے ماں جی کے ساتھ کیا کیا۔ میں یہاں آپریشن نہیں کرا سکتی۔ میں کراچی جارہی ہوں۔ شاید مجھے سرطان ہو۔ میں یہاں آپریشن کرانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ فرض کرو یہ افزائش خبیث نکلے۔ یہاں والے تو بتا بھی نہ سکیں گے کہ یہ خبیث ہے یا نہیں۔ میرے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤ۔ کیا میری زندگی کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں؟ کیا تم چاہتے ہو میں مر جاؤں؟"

مصطفےٰ مربیانہ قسم کے گھٹیا فلمی مکالمے بولنے پر اتر آیا۔ "کم از کم میں تمہارے پاس تو ہوں گا۔ میں تمہارا ہاتھ تھامے رہوں گا۔" زندگی کے اس مرحلے میں اگر کوئی چیز میرے نزدیک سب سے کم اہم تھی تو وہ اس کے ہاتھ تھے۔

میں نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ میں کراچی میں آغا خان ہسپتال جانا چاہتی تھی۔ اس کی خواہشات کو ٹھکرا کر اور ان شکایات کی پروا کیے بغیر، جو اس نے میرے اڑیل پن، خودغرضی اور نافرمانی کے بارے میں اپنے بھائیوں سے کی تھیں، میں کراچی جتوئی ہاؤس کے لیے روانہ ہو گئی۔ جتوئی صاحب کی بیگم، لیکس، نے مجھے اتنا سہارا دیا کہ سارے خاندان کی کمی پوری کر دی۔ جب میرا آپریشن ہوا تو وہ آپریشن تھیٹر کے باہر انتظار کرتی رہیں۔ جب میں صحت یاب ہونے اور اپنی بائیوپسی رپورٹ ملنے کا انتظار کر رہی تھی اور میرے ٹانکے ابھی تازہ تھے تو ملتان سے فون آیا۔ پارٹی کا کوئی کارکن بول رہا تھا۔ "مجھے کھر صاحب نے یہ پیغام دینے کے لیے کہا ہے کہ براہ کرم فوراً واپس آجائیں۔" "کھر صاحب کو بتا دو کہ ابھی میرے ٹانکے نہیں کھلے۔ میں نہیں آسکتی۔" مصطفےٰ کو اندازہ تھا کہ میری طرف سے یہ جواب ملے گا۔ کارکن نے بہت مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "کھر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ان کا حکم ہے۔ ٹانکے ملتان میں کھولے جاسکتے ہیں۔"

جتوئی صاحب میرے پاس تھے۔ انھیں مصطفےٰ پر بڑا تاؤ آیا۔ "کھر صاحب کو بتا دو کہ میں ان کے نامعقول احکام ماننے کو تیار نہیں۔ وہ مجھے ایسے حکم نہ دیں جن کے بارے میں وہ خود بھی جانتے ہیں کہ میں انھیں ہرگز نہ مانوں گی۔" میں نے فون کو

واپس تھما دیا۔

جتنا وقت درکار تھا میں اتنی دیر وہاں رہی۔ CYST بے ضرر نکلا۔ موذی تو خود مصطفےٰ تھا۔

میں طیارے کے ذریعے ملتان پہنچی۔ جو کارکن جمع تھے ان کے چہروں پر تشویش کے آثار تھے۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کی مہربانی سے ہماری تازہ ترین جھڑپ کی خبر عام ہو چکی تھی۔ میں پارٹی کے عہدے دار کا کردار اتنی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی کہ کارکن غالباً یہ بھول چکے تھے کہ میں ان کے قائد کی بیوی بھی ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں مصطفےٰ کے ردعمل کے بارے میں خوف زدہ کیوں نہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس کا رویہ غیر معقول تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس سے خوف کھاؤں۔

میں مصطفےٰ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ وہ اول فول بکنے لگا اور جب اس نے محسوس کیا کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو مجھے کندھوں سے دبوچ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "اب بہت دیر ہو گئی۔ بس چلی جاؤ۔" میں نے ایک یا دو سیکنڈ کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور چلی آئی۔

میں دو دن اس سے ملنے نہ گئی تو مصطفےٰ پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے پیغاموں کا تانتا باندھ دیا۔ معافی مانگ لی۔ میں اس کے سامنے جھک گئی۔ مجھے اس کی سنگ دلی سے بڑا دکھ پہنچا تھا۔ اسے میری صحت کا کوئی خیال نہ تھا۔ صرف اپنے تنہا رہ جانے کی فکر ستا رہی تھی۔

بچے روز اپنے باپ سے ملنے جاتے اور دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاتے۔ پھر وہ پرائیویٹ ٹیوشنیں پڑھنے چلے جاتے۔ میں شام کے چھ بجے مصطفےٰ سے رخصت ہوتی اور اپنے ذہن میں میڈیکل بلیٹن مرتب کرتی۔ جو کچھ سوچتی اسے پریس کے آگے اگل دیتی اور اگلی صبح اپنا کہا بے جان عبارت کی صورت میں چھپا ہوا پڑھ لیتی۔ یہ سلسلہ چھ ماہ جاری رہا۔

میں بہت بیمار ہو گئی۔ میرے رحم میں سنگین نوعیت کی اندرونی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ عارضہ ایک تو زیادہ بچے جننے سے اور دوسرے نشتر میڈیکل کالج ہسپتال کی سیڑھیاں اترتے چڑھتے رہنے سے لاحق ہوا تھا۔ مجھے سرجری کی ضرورت تھی۔ یہ کہنا آسان تھا اور کرنا مشکل۔ مصطفےٰ کا اولین ردعمل بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس نے ایک بار پہلے بھی ظاہر کیا تھا۔ "خوب۔ یہیں آپریشن کرالو۔" میرا ردعمل بھی میرے پچھلے ردعمل سے مختلف نہ تھا۔

بحث کا آغاز ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر کراچی بہت دور ہے تو میں لاہور میں شیخ زید ہسپتال میں داخل ہو جاتی ہوں۔ مصطفیٰ کہنے لگا کہ وہ مجھے امراض نسواں کے کسی مرد معالج کے پاس ہرگز نہ جانے دے گا۔ میں نے کہا کہ میرا کسی مرد معالج کے پاس جانے کا پہلے ہی کوئی ارادہ نہیں۔ یہ پیچ در پیچ اختلاف جاری رہی یہاں تک کہ مصطفیٰ نے ہار مان لی۔ لیکن اپنی طرف سے بعض شرطیں جڑ دیں۔

بچوں کو چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ لاہور لے جاؤں گی۔ ٹکٹ خریدے جا چکے تھے۔ ہم ہسپتال پہنچے تاکہ بچے اپنے والد کو الوداع کہہ لیں۔ مصطفیٰ نروس نظر آ رہا تھا۔ "بے فکر رہو مصطفیٰ میں پندرہ دن تک واپس آ جاؤں گی۔ میرا وعدہ ہے۔"

اس نے مجھ سے قرآن مجید پر لکھوا لیا کہ میں ٹھیک پندرہ دن میں واپس آ جاؤں گی۔ میں نے لکھ تو دیا لیکن ایک شرط اپنی طرف سے بڑھا دی۔ میں نے لکھا کہ اگر میرے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا تو پندرہ دن میں واپس آ جاؤں گی۔ "یہ کیا لکھ دیا؟" "مصطفیٰ، میں کلام پاک پر کوئی ایسا حلف نہیں اٹھا سکتی جسے شاید پورا نہ کیا جا سکے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اتنی قطعیت سے بات کرنا مناسب نہیں۔" "کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" "بھئی--- مثلاً میں مر سکتی ہوں۔" "پھر کیا؟ اگر تم مر بھی جاؤ تو بھی تمہاری میت آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد میرے پاس پہنچ جانی چاہیے۔ اگر تم بیمار پڑ جاؤ تو سٹریچر پر لیٹ کر یہاں آ جانا۔ مجھے پروا نہیں۔" میں اس کی طرف تکتی رہ گئی۔ اس آدمی کی اصلاح ناممکن تھی۔ اس نے فی الفور نئی چال چلی۔ "ٹھیک ہے۔ تم جا سکتی ہو۔ ثنا اور علی کو میں اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔" بلیک میل۔ "مصطفیٰ ہوش سے کام لو۔ بچے لاہور جانا چاہتے ہیں۔ وہ کب سے آس لگائے بیٹھے ہیں کہ لاہور جائیں گے۔ انہیں اس طرح جدا کر دینا بے انصافی ہے۔" "نہیں۔ وہ یہیں رہیں گے۔ میرے پاس۔" "یہاں کمرے میں اس طرح بند رہ کر وہ کیا کریں گے؟ اس سے ان کی نفسیات پر برا اثر پڑے گا۔ یہ مت کرو۔ یہ ظالمانہ حرکت ہے۔ ثنا اور علی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ انہیں لگے گا کہ وہ بالکل بے اختیار ہیں۔ انہیں پتہ ہو گا کہ نصیبہ اور حمزہ لاہور میں خوب مزے اڑا رہے ہیں۔" "میں نے کہہ دیا نہیں۔ میرے انکار کو انکار سمجھو۔ یہ میرے ساتھ ہسپتال میں رہیں گے۔ تمہیں وقت پر واپس آنا ہو گا۔"

اس کا ساتھ چھوڑ جانے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اسے تو خود ہی عدم تحفظ کا احساس کھائے جا رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے بچوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں لاہور جانے سے باز آ جاؤں گی۔ میں بچوں کی

خاطر ملتان میں رک جاؤں گی۔ اب میں بھی مزاج کی بڑی سخت ہو چکی تھی۔ میں نصیبہ اور حمزہ کو لے کر چلی گئی۔

جب مجھے وھیل چیئر پر بٹھا کر آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا رہا تھا تو مجھ پر اداسی طاری ہو گئی۔ مجھے اس آدمی پر ترس آیا جو مجھے ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا موقع دینے کو تیار نہ تھا۔ جو مجھے اپنے سے دور دھکیلنے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ میں تو اپنی تذلیل گوارا کر کے اس کی ہر الٹی سیدھی من مانی پوری کرتی رہی اور وہ تھا کہ اسے میرے احساسات کا شمہ بھر لحاظ نہ تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتے وقت مجھے اپنے ان بچوں کی یاد آئے گی جو جیل میں اس کے ساتھ بند تھے۔ اسے معلوم تھا کہ میں بالکل اکیلی ہوں۔ میرے والدین اور بہنیں میرے پاس نہ تھیں۔ میں نے اس کی خاطر ان سب سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ ان کے بجائے مجھے دوستوں کا سہارا حاصل تھا۔ میرے خاندان کی جگہ جتوئی صاحب اور ان کے اہل خانہ لے چکے تھے۔ میرے شوہر کو میری علالت اس لیے ناگوار گزرتی تھی کہ خود غرضی کے مارے وہ چاہتا تھا کہ میں ہر وقت اس کے پاس رہوں۔ مجھے امی کا خیال آیا۔ میرے پچھلے آپریشن کے وقت وہ کراچی میں تھیں۔ انہوں نے میرا حال معلوم کرنے کی زحمت تک نہ کی تھی۔ صرف زرمینہ باقاعدگی سے مجھے فون کرتی رہی۔ روبینہ، عدیلہ اور منو میرے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ میں یہ بھلا نہ سکی کہ وہ ایک ایسی بہن کے پاس آنے سے پہلو بچا رہی تھیں جو شاید سرطان میں مبتلا تھی۔

خوش قسمتی سے لاہور میں میرے رشتے دار میرے گرد جمع ہو گئے۔ میرے خالو اور خالائیں اور نانی اماں۔ زرمینہ نے بھی میرا ساتھ دیا حالانکہ امی اسے سختی سے منع کر چکی تھیں کہ مجھ سے نہ ملے۔ امی نے میرے رشتے داروں کا بائیکاٹ کر دیا۔ زرمینہ کے خلاف بھی سرد جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں مصطفیٰ کے پاس لوٹ گئی تھی۔ میں نے امی کی حکم عدولی کی تھی۔

آپریشن کے بعد نانی اماں نے میری صحت کا خیال رکھا۔ اس اثنا میں مصطفیٰ نے اپنے سب بھائیوں کو بلا کر شکایت کی کہ مجھے اس کی بیماری کی کوئی پروا نہیں اور میں ہمیشہ اپنی ہی خیر مناتی رہتی ہوں۔ مجھے بڑا طیش آیا۔

میں کراچی جا کر والد صاحب سے ملنا چاہتی تھی۔ مصطفیٰ نے سختی سے منع کیا کہ میں نہ جاؤں۔ میں نے اس کی مناہی کو نظر انداز کر دیا۔ میں والد صاحب سے ملی اور ان کے ساتھ اپنے نئے مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ میں لاہور لوٹ آئی۔

میں صبح سویرے ملتان روانہ ہونے والی تھی۔ اس رات زیاں اور ملال کے ایک

احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجھے لگا جیسے مجھ پر کوئی بھاری بوجھ آپڑا ہے۔ میرے وجدان نے خبر دی کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ جب امی تو یہ خبر ملی کہ مصطفیٰ کو رات کے اندھیرے میں ملتان سے اٹھا کر بذریعہ کار راولپنڈی کے اڈیالا جیل پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ کارروائی ایک طرح کی بدشگونی تھی۔ اڈیالا جیل کو راولپنڈی جیل بند کر دینے کے بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ یہیں پر بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تھی۔ چار وناچار مجھے برے برے خیال آنے لگے۔ اوپر والوں نے آخر کیا کرنے کی ٹھانی ہے؟ اگر وہ جیل سے کبھی زندہ واپس نہ آسکا تو کیا ہوگا؟ مجھے محسوس ہوا جیسے پھندا تنگ ہوتا جارہا ہے۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ ایک کو پھانسی دے چکے ہیں۔ اب کسی اور کو پھانسی نہیں دے سکتے۔

لشا اور علی اسی روز، انتظامیہ کی مہربانی سے، میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے اخباری کانفرنس بلائی اور مصطفیٰ کو اڈیالا منتقل کرنے کی مذمت کی۔ میں نے کہا کہ میرا شوہر دل کا مریض ہے اور کار کے ذریعے ملتان سے پنڈی تک کا طویل سفر اس کے حق میں خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

دو اگست کو جو اس کا یوم پیدائش ہے، میں اس سے ملنے راولپنڈی پہنچی۔ غلام مرتضیٰ کھر اور اس کی بیوی، فرح، غلام، عربی، بلال، عبدالرحمٰن اور بچے، سب میرے ساتھ تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں ہماری مصطفیٰ سے ملاقات ہوئی۔ مصطفیٰ مجھ سے بہت خفا تھا۔ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ میں اتنی تھک چکی تھی کہ اس سے جھگڑنے کا دم بھی نہ رہا تھا۔ دو مہینوں میں دوبار آپریشن کراچکی تھی۔ میں اپنے بچوں کی ماں ہی نہ تھی، باپ کا رول بھی مجھے ہی ادا کرنا پڑتا تھا۔ میں ایک دفعہ پھر بے گھر ہوگئی تھی۔ سب کچھ غتربود ہوچکا تھا۔

مصطفیٰ سپرنٹنڈنٹ سے خصوصی اجازت حاصل کر کے ہمیں اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے کا دروازہ کواڑوں سے بے نیاز تھا۔ ایک چک لٹکی ہوئی جھول رہی تھی۔ تخلیہ فراہم کرنے کا ایک ڈھیلا ڈھالا معذرت خواہانہ انداز۔ میں اپنا ایک فوٹو اس کے لیے لے گئی تھی۔ وہ ابھی تک روٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ اسے فوٹو نہیں چاہیے۔ میں نے فوٹو واپس بیگ میں رکھ لیا۔ اس نے گھر والوں سے کہا کہ وہ باہر جاکر انتظار کریں۔ وہ سب باہر جاکر چک کے ارد گرد پہرے داروں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

مصطفیٰ مجھ سے ہم بستری کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے نہ تو وہ جگہ موزوں تھی نہ وقت۔ تخلیے نام کی کسی چیز کا وہاں وجود نہ تھا۔ باہر کھڑے گھر والوں کی باتیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ میری صحت بھی ٹھیک نہ تھی۔ مجھے میرے ڈاکٹر

نے مشورہ دیا تھا کہ ٹانکوں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کروں۔ میں بہت خوف زدہ ہوگئی۔ میں نے اسے بتانے کی کوشش کی میری صحت ٹھیک نہیں اور مجھے صحت مند ہونے میں کم از کم چھ ہفتے لگیں گے۔ اس نے ذرہ برابر پروا نہ کی۔ میں نے اسے بتایا کہ گھر کے لوگ باہر کھڑے ہیں، پولیس والے باہر کھڑے ہیں۔ یہ وقار سے بہت ہی گری ہوئی بات ہوگی۔ "تمہاری جتنی عمر کو پہنچنے کے بعد لوگ اس طرح کی حرکتیں نہیں کرتے۔ مجھے بعد میں باہر جاکر ان سے آنکھیں چار کرنی ہیں۔ میرا سر شرم سے نیچا ہو جائے گا۔" مصطفیٰ کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ "مصطفیٰ، میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں، میں رسولؐ کی قسم کھا کے کہتی ہوں کہ اگر تم نے، یہ جانتے بوجھتے کے باوجود کہ میری صحت خراب ہے، مجھے چھونے کی جرأت کی تو میں آئندہ کبھی تم سے ملنے نہ آؤں گی۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ میں طلاق لے لوں گی۔"

اس نے کوئی پروا نہ کی۔ ابتدا میں جو خوف مجھ پر طاری ہوا تھا اصلیت اس سے کہیں زیادہ خوف ناک ثابت ہورہی تھی۔ آخر کار میں متنفر ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ "تم بیمار ہو۔ اس قدر بیمار۔" میں اس کی زندگی سے گرتی پڑتی نکل آئی۔ اس نے صلح کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے معاف کردو۔" "تمہاری بیوی بن کر رہنا ناممکن ہے۔" "مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خدا کے لیے۔ میرا کیا بنے گا۔ تم چلی جاؤ گی اور مجھے یہاں بند کر دیا جائے گا۔ مجھے اتنی پریشانیاں گھیر لیں گی۔ تمہارے سوا مجھے کسی سے پیار نہیں۔ تمہارے سوا کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ تمہارے سوا مجھے امید کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر تم چلی جاؤ گی تو میرے پاس کچھ بھی نہ رہے گا۔ امید کا سہارا بھی چھن جائے گا۔"

اس نے مجھ سے میرا فوٹو مانگا۔ میں نے بیگ سے فوٹو نکالا اور پھر بالکل دیدہ و دانستہ اسے پرزے پرزے کر کے کمرے میں بکھیر دیا۔ اس کی منت سماجت جاری رہی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اسے معاف کر چکی ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا۔ میں اس پاگل، بیمار جانور کو معاف نہیں کرسکتی تھی۔ دکھ کے بجائے رسوائی محسوس ہورہی تھی۔ میں شرمندہ ہو کر مگر اس یقین کے ساتھ باہر آئی کہ یہ میری مصطفیٰ سے آخری ملاقات تھی۔

ڈپٹی ایل کی وساطت سے ایک خط اڈیالا بھیجا گیا۔ اس میں طلاق کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ مفتی ڈاک سنسر کرتا تھا۔ اس نے خط پڑھ لیا۔ خبر باہر نکل گئی۔ اسے اخباروں کے صفحۂ اول پر جگہ ملی۔ خبر سے کسی کو دھچکا لگا۔ ابھی چند دن پہلے تک میں ایسی بیوی کے طور پر پہچانی جاتی تھی جو کسی بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہی تھی

میں اپنی شرمندگی کی وجہ منظرِ عام پر نہ لاسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسی عورت بن کر رہنے سے کیا فائدہ جس کے ساتھ خود اس کا شوہر زنا بالجبر کر چکا ہو۔ اس کے بجائے ایسی عورت بن کر جینا بدرجہا بہتر ہے جو اپنی تلون مزاجی کے لیے بدنام ہو چکی ہو۔

مجھے سنگدل قرار دے کر برا بھلا کہا گیا۔ میرا شوہر بیچارہ قید بند کی اذیتیں سہہ رہا تھا اور میں بظاہر اس کا ہاتھ جھٹک کر چل دی تھی۔ جو زیادہ بدزبان تھے انھوں نے کہا کہ میں رنگ رلیاں منانے اور عشق لڑانے کے لیے رسی تڑانا چاہتی تھی۔ آخر مصطفیٰ نے جیل میں رہتے ہوئے ایسی کون سی زیادتی کی ہوگی، وہ پوچھتے؟ مصطفیٰ بیچارے کی حالت پہلے ہی غیر تھی، اوپر سے میں نے دھکا دے دیا۔ میں ایسی عورت بن گئی جسے برا کہنا ہر کسی کو اچھا لگتا تھا۔

میری وکیل، عاصمہ جہانگیر، جس کے لیے میرے دل میں بڑا احترام پیدا ہو گیا، مصطفیٰ سے ملنے گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے عاشق کا بہروپ بھرنے کا حق ادا کر دیا اور اقرار کیا کہ میرے لیے اس کی محبت امر ہے۔ اس نے عاصمہ سے کہا کہ مجھے کسی طرح منا کر واپس لے آئے اور غضب یہ کہ طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے خلع کے لیے درخواست پیش کر دی۔

ایک بار پھر اپنا سامان پیک کرنے کی نوبت آگئی۔ میں نے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ مصطفیٰ اتنی زیادہ بار ایسی حرکتیں کر چکا تھا جن سے میری تذلیل کا پہلو نکلتا تھا اور میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ہمارے تعلقات کی اصلاح ممکن نہیں۔ مصطفیٰ کی وجہ سے سیاست کے لیے میرا جوش بالکل ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ میں بہت تنہا تھی۔ میرا کوئی ذاتی دوست نہ تھا۔ پارٹی کے کارکن، جو خلا پر کرنے کے کام آتے رہے تھے، جا چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے قصہ ختم ہو گیا ہو۔ میں ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچتی رہتی جن سے مجھے ان پچھلے برسوں کے دوران ملنے ملانے کا اتفاق ہوا تھا۔

میرے بے قرار ذہن میں چہرے اور نام بجلی کی سی تیزی سے گزرتے رہے۔ انہیں یاد کرتے کرتے مجھ پر ایک ناگوار حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ سب مصطفیٰ کے ساتھی تھے۔ مصطفیٰ کے اتحادی تھے۔ مصطفیٰ کے پچھ لگو تھے۔ مجھے یقین نہیں کہ ان میں کوئی مصطفیٰ کا دوست بھی تھا۔ ہم دونوں نے جو زندگی ایک ساتھ گزاری تھی اس کے دوران جو لوگ بھی ہمیں ملے تھے ان کی اور ہماری زندگیاں سیاست کے پھیلے ہوئے جال کے ایک حصے کے طور پر آپس میں بیلوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ ہمیں ایک دفعہ بھی ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا جو سیاست کے جال سے یکسر آزاد ہوں۔ ہمارے

جو بھی تعلقات تھے وہ لین دین پر مبنی تھے۔ ان میں جذبات کو دخل نہ تھا۔ صبیحہ، اینڈریو اور گیکس کو البتہ اس کلیے سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ المیہ یہ تھا کہ میرے پرانے یار دوست اب کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ ان کی زندگیوں نے میری زندگی کو چھونے کے بعد ایک بالکل ہی مختلف رخ اختیار کر لیا تھا۔ جو وقت میں نے ایک جلاوطن سیاسی رہنما کی بیوی کے طور پر گزارا تھا اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے نارمل، پیش پا افتادہ زندگی بسر کرنے کے قابل نہ رہنے دیا تھا۔

یہی وہ دن تھے جب نصرت جمیل یا نصی، جیسا کہ اسے دلار سے کہا جاتا ہے، میری زندگی میں داخل ہوئی۔ وہ صحافی تھی اور انگریزی اخبار "دی نیشن" کے لیے کام کر رہی تھی۔ میں اس سے پہلے کبھی نہ ملی تھی۔ اس نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگی کہ میرا انٹرویو لینا چاہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ ایک سیاست دان کی روٹھی ہوئی بیوی کے مصائب پر مبنی دل خراش کہانی میں لوگوں کی دلچسپی کا سامان ضرور ہوگا۔ میں اس سے ملنے پر راضی ہو گئی۔ وہ آئی۔ ہم نے گفتگو کی۔ نصی نے میری زندگی بدل ڈالی۔

نصی نے اپنے گھر مجھے ڈنر پر مدعو کیا۔ پاکستان میں جن گھروں میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا یہ گھر ان سے مختلف نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس گھر کے بانکپن میں ٹھہراؤ بھی ہے اور اطمینان بھی۔ کتنی چابک دستی سے کام لیا گیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ گھر میں رہنے والوں کا اسلوب زندگی بھی مختلف ہے۔ نصی کا شوہر بھی موجود تھا، جسے میں جے جے کہنے لگی، اور یوسف صلاح الدین بھی، جو علامہ اقبال کا نواسا ہے۔ بڑے لطف کی شام گزری۔ ڈنر کے بعد ہم قلفیاں کھانے انار کلی گئے۔ آزاد ہو جانے کا احساس تو تھا لیکن میں ابھی اپنے بہت سے تحفظات سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکی تھی۔ تینوں ساتھی میری موجودگی کو بڑے اطمینان سے قبول کر چکے تھے۔ انہیں مجھ سے نہ تو ڈر لگ رہا تھا نہ پروا تھی کہ میں کون ہوں۔ انار کلی پہنچ کر مجھے محسوس ہوا جیسے میں سکول سے چوری چھپے بھاگ آئی ہوں۔ فکر لاحق تھی تو یہ کہ کہیں مجھے اس طرح گھرے اڑاتے نہ دیکھ لیا جائے۔ میں گھر جانا چاہتی تھی۔ خاصی دیر ہو چکی تھی۔ لطف تو بہت آرہا تھا لیکن میں اس احساس سے دامن نہ چھڑا پا رہی تھی کہ کوئی جرم کر رہی ہوں۔ انہیں کوئی جلدی نہ تھی۔ میں ابھی ان سے اتنی بے تکلف نہ ہوئی تھی کہ ان پر حکم چلا سکتی۔ آدھی رات ہونے کو آئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی رات گئے میں اکیلی باہر گھوموں پھروں۔ بیک وقت مجھے ڈر بھی لگا اور دل میں گدگدی بھی ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں بری نٹ کھٹ ہو گئی ہوں۔ میں اپنے پر عائد کرفیو کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ لیکن مجھے سوچنے اور محسوس کرنے کے جس سانچے کا عادی بنا دیا گیا تھا وہ اپنی طاقت منوا کر

رہا۔ میں نے جی کڑا کر کے ان سے کہا کہ بہت دیر ہو چکی ہے اور میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ ان کے لیے وقت کوئی ایسی چیز نہ تھا جو ان کی کلائیوں پر ہتھکڑیوں کی طرح بندھا ہو۔ وہ تو وقت کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتے تھے۔ وقت خود منتظر رہتا تھا کہ وہ آئیں اور اسے برباد کریں۔ وہ مجھے گھر اتار گئے۔ مجھے پتہ تھا کہ ان سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔

مصطفےٰ سے قطع تعلق کے دو دن بعد غلام رحمانی کھر لندن میں فوت ہو گیا۔ اس کی موت سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ رحمانی لندن میں ہمارے ساتھ رہ چکا تھا۔ وہ صرف تیس برس کا تھا۔ میں نے اُسے محبت سے یاد کیا۔ وہ ہمیشہ نہایت احترام سے پیش آتا تھا اور میرا بڑا لحاظ کرتا تھا۔ اس کی موت کے بارے میں کوئی سرسری رویہ اختیار کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں ہوائی اڈے گئی۔ وی آئی پی لاؤنج میں داخل ہوئی جہاں غازی کھر اور عبدالرحمٰن کھر رحمانی کی میت کا انتظار کر رہے تھے۔ طیارہ آ پہنچا۔ میں دونوں غم زدہ مردوں کے ساتھ طیارے تک گئی، طیارے کے ہولڈ میں جا کر میت کے لیے دعائے مغفرت کی اور چلی آئی۔ غلام غازی کھر کو پتہ تھا کہ میں مصطفےٰ کو چھوڑ چکی ہوں۔ اس موقع پر میرے حاضر ہونے سے اس کے دل پر اثر ہوا۔ مصطفےٰ کو پیرول پر چھوٹے بھائی کے جنازے میں شرکت کی اجازت دی گئی۔ کہتے ہیں کہ جنازے پر وہ کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ بہت سوں نے کہا کہ اسے دو بڑے نقصان اٹھانے پڑے تھے، ایک تو رحمانی کی موت کا غم، دوسرے تہمینہ سے بچھڑ جانے کا غم، اور اس کے جتنے آنسو رحمانی کے لیے بہے تھے اتنے ہی تہمینہ کی خاطر بھی بہتے رہے تھے۔ وہ سن چکا تھا کہ جس وقت رحمانی کی میت ہوائی اڈے پر پہنچی تو میں وہاں موجود تھی۔ مصطفےٰ سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں آزمائش کی کسی گھڑی میں اس کے ساتھ نہ تھی۔

اگلے دن میں بچوں اور اپنی ملازمہ، شگفتہ، کو ساتھ لے کر کراچی روانہ ہو گئی اور اپنے اپارٹمنٹ میں جا اتری۔ کیکس میری قریب ترین دوست تھی۔ میں ترستی رہتی تھی کہ کوئی تو ہو جو یہ احساس دلائے کہ میرا بھی کوئی خاندان ہے۔ کیکس کی موجودگی نے خاندان کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے صبیحہ یاد آجاتی تھی۔ وہ منکسر مزاج تھی اور فطرتاً بہت شفیق۔ بچوں کو اس سے پیار تھا۔ وہ ان کے لیے وقت نکالتی اور ہر طرح کے مشغلوں کو سکس اور ویڈیو فلمیں لے کر آتی۔ اس نے خاص اہتمام کیا کہ ہمیں ایک لمحے کے لیے عدم تحفظ کا احساس نہ ہو کبھی یہ خیال نہ آئے کہ ہمیں چاہنے والا کوئی نہیں۔

نصی اور جے جے کا کراچی آنا ہوا۔ ملنے آئے تو انھوں نے بھٹ شاہ چلنے کی دعوت دی۔ عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کا عرس منایا جا رہا تھا۔ بھٹ شاہ سندھ

کے عوام کے لیے جائے اجتماع بن گیا تھا۔ یہاں تصوف کے زیر سایہ، چڑھتے چاند کی چھاؤں تلے، آمادہ بہ جنگ سندھی جمع ہو کر موسیقی اور رقص کے ذریعے اپنے احتجاج کو آہنگ عطا کرتے تھے۔ ولی کامل کی آرام گاہ ان کے لیے جائے امان تھی۔ بھٹو صاحب کے زیاں اور پھر 1983ء میں فوجی کارروائی سے سندھی قوم پرستی میں نئی جان پڑ گئی تھی۔ وفاقی حکومت سے اختلاف غالب آچکا تھا اور ہر سال بھٹ شاہ واضح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔ شاہ لطیف کی شاعری دلوں میں ولولہ پیدا کرتی تھی اور بہت ہی برمحل اور بامعنی معلوم ہونے لگی تھی۔ سچل سرمست کی انقلابی شاعری کے برعکس شاہ لطیف سنجیدہ اور لطافت آمیز پیرائے میں بات کرنے کے ماہر تھے۔ جس ثقافتی احیا کی زد میں پورا سندھ آچکا تھا اسے بچشم خود دیکھ کر میرے جوش و خروش کی انتہا نہ رہی۔

اس سے پہلے میں نے کسی عرس میں شرکت نہ کی تھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ دیکھنے کو کیا کیا ملے گا۔

میرے لیے بھٹ شاہ بہت عجیب تھا۔ مشرقی وضع کے جشن کا سماں تھا۔ ہماری کار میں جھانکنے والے چہروں سے آزردگی اور غیرت جھلکتی تھی۔ بھٹ شاہ کی سرزمین تقدیس کی حامل ہے۔ وہ انھیں ایک دم گھونٹنے والے نظام سے تحفظ اور چھٹکارا فراہم کر رہی تھی۔

بھٹ شاہ میں میری بعض ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن سے میرا لگاؤ مرورِ ایام کے ساتھ بڑھتا گیا۔ میں عمران اسلم سے ملی جو "ستار" کا مدیر تھا۔ ہم دونوں میں بڑا زبردست ذہنی ارتباط قائم ہو گیا۔ جن بہترین ذہنوں کو جاننے کا مجھے شرف حاصل رہا ہے ان میں عمران اسلم کا ذہن بھی شامل ہے۔ اس کے خیالات مجھے بہت انقلابی معلوم ہوئے۔ یہ بات مجھے بہت بھائی۔

جے جے یا جیلو تجزیہ پسند ذہن کا مالک ہے۔ اس کی مدد سے میں بعض ایسے اسرار کی گتھیاں سلجھانے میں کامیاب ہو گئی جو میرے ذہن کو مدتوں سے پریشان کر رہے تھے۔ ہم سب کو تجزیہ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ جے جے فرائیڈین طریق کار کا قائل تھا اور گفتگو کے ذریعے علاج کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ میں نے اسے آزاد طبع مرد پایا اور آج تک مجھے جن سب سے بردبار اور ہمدرد شوہروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اسے بھی انھیں کی صف میں رکھنا پڑے گا۔

نصی خوبصورت تھی۔ وہ بہت ذہین اور اپنے مفہوم کو صحت سے بیان کرنے پر قادر تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس قسم کی طرزِ زندگی سے مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے۔ اس نے ذہن میں طے کر لیا کہ میرے معاملے میں عجلت سے کام نہیں لے گا۔ جو ہونا

بے آپ ہوتا رہے گا۔ اس نئی طرزِ زندگی کے اسرار سے واقف ہوتے ہوتے مجھے دیر تو لگے گی لیکن میری واقفیت ہوگی مکمل۔ میں نے جو زندگی گزاری تھی اس میں مجھے ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا اور میرے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز ایک خاص طرح کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ نعمی ان باتوں کو سمجھ گئی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ مجھے ایسے مرد کے ساتھ رہنا پڑا ہے جو عمر میں مجھ سے بڑا تھا اور جاگیر دارانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ اپنی اقدار کی حد تک میں لکیر کی فقیر تھی لیکن میرے اندر کوئی چیز مجھے ہمیشہ بغاوت کرنے پر ورغلاتی رہتی تھی۔ میری سرشت میں شامل تجسس مجھے کوئی نہ کوئی نئی چیز دریافت کرنے کے لیے کچھ کے دیتا رہتا تھا۔ اب تک تو میں اپنے ذہن کی اُجاڑ پہنائیوں میں بھٹکتی رہی تھی۔ نعمی چاہتی تھی کہ میں اپنے ذہن کو کشادہ کروں اور متبادل حقیقت پر بھی نظر ڈالوں۔ طلاق کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی بس ختم ہو گئی۔ ایسی شادی کو جسے گھن لگ چکا ہو محض اس لیے قائم رکھنا کہ اس کی بدولت معاشرے میں پذیرائی حاصل رہے گی کوئی زیادہ معقول بات نہیں۔ نعمی نے میرے اندر کا توازن بحال کر دیا۔ اس کی رفاقت میں مجھے محسوس ہوتا کہ جو کچھ کر رہی ہوں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ کسی کی نقل نہیں اتار رہی۔ میں نے "بیگمات" والا بناؤ سنگھار ترک کر دیا اور اس چادر کو اتار پھینکا جس نے شخصیت کو مسخ اور مقید کر دیا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے میری خاطر ملتے تھے، میری کوئی حالیہ یا سابقہ حیثیت ان کے پیشِ نظر نہ ہوتی تھی۔

میں مبہم سا تاثر تھی۔ سوشل پوزیشن واضح کرنے والا بیان تھی۔ ایسی گفتگو تھی جس سے تمیزداری ظاہر ہوتی ہو۔ نعمی سے مل کر میں اندھیروں کو مار بھگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اگرچہ ماضی سے میرا رشتہ ابھی مکمل طور پر منقطع نہ ہوا تھا تاہم مجھے احساس تھا کہ اس رشتے کو توڑنے کے لیے میں زور لگا رہی ہوں۔ نعمی نے مجھے حوصلہ دیا۔

ریسٹ ہاؤس میں سونے کے انتظامات سے میرے احساسات کو ٹھیس لگی۔ مجھے سرسری انداز میں بتایا گیا کہ ہم سب ایک ہی کمرے میں رات بسر کریں گے۔ ہم چھ یا سات آدمی تھے۔ مرد بھی، خواتین بھی۔ میرا چہرہ ضرور شرم سے لال ہو گیا ہوگا۔ یہ بہت ہی نرالی بات تھی۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ جس کمرے میں نعمی کا میاں سوئے گا اسی کمرے میں مجھے سونا ہوگا۔ ان کو ذرہ برابر پروا نہ تھی۔ ان کے لیے یہ بالکل فطری بات تھی۔ ان کی بے پروائی دیکھ کر میری ہمت بڑھی۔ میں نے ایسی خام حجابی کا مظاہرہ کرنے پر دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا ڈپٹا۔ جو لوگ بیچ بیچ ساتھ سوتے ہیں در حقیقت وہ سوتے کب ہیں۔

ہم ان لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں سے گزرے جو عارضی طور پر بنے ہوئے بازار میں قدم مارتے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے گھٹیا ریستورانوں میں جھانکا جہاں ہیجڑے فحش انداز میں ناچتے ہوئے ناپاک صحبتوں کے لیے وقت اور جگہ طے کر رہے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس معاشرے کی ریاکاری، جس میں مردوں کو غلبہ حاصل ہے، اس سے زیادہ واضح انداز میں کبھی سامنے نہ آئی تھی۔ مردوں نے بیچ بیچ عورتوں کا کردار اپنا لیا تھا۔ یہ سارا منظر جسے ہم نے آگے کو جھک جھک کر دیکھنے والوں کی گردنوں کے بیچ بیچ میں سے ملاحظہ کیا جتنا بھونڈا اتنا ہی افسانہ بھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایسا وحشت ناک خواب شاید مشہور ہدایت کار، فیلینی، ہی دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے ایک بڑے شامیانے والے سرکس کا جائزہ بھی لیا جس میں پسوؤں کے ستائے ہوئے چند بیزار ہاتھی اور شیر کھڑے تھے۔ مجھے رہ رہ کر دبلے بدنوں سے چپکے ہوئے لباس یاد آ رہے تھے جو ہیجڑوں نے اپنے جھالر دار گھگھروں کے نیچے پہن رکھے تھے۔ ہم قسمت کا حال بتانے والوں، دانتوں کے معالجوں، بھنگ فروشوں اور ان بڑے بڑے خیموں کے پاس سے گزرے جن میں شاہ لطیف کے عرس پر آنے والے زائرین قیام کرتے ہیں۔ یہ جگہ مشرق کی خوبصورت ترین زیارت گاہوں میں سے ایک ہے۔ لوگ احاطے میں پڑے سو رہے تھے۔ تھکے ہارے لوگ جو اپنی اپنی التجائیں لے کر زیارت گاہ آئے تھے۔ شفاعت کے طلبگار بن کر حاضر ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں نہ تھیں ہزاروں کشکولِ گدائی تھیں۔ ہم ان زمین پر دراز صورتوں کے درمیان سے گزرے۔ ایک پُرہیبت لے ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ زیارت گاہ کے سامنے فقیر ہم آہنگ ہو کر گا رہے تھے۔ ان کے لبوں پر دعا تھی کہ صبح ہو اور زیارت گاہ کا دروازہ کھلے۔ صبح گویا رہائی کی ساعت تھی۔ بعینہ جیسے موت صوفیائے کرام کے لیے رہائی کی گھڑی ہوتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں دوبارہ اپنے پیر و مرشد کے مزار کے دیدار سے مشرف ہونے کا موقع دیا جائے۔ ایک قتیلہ مو فقیر پر حال طاری ہو گیا۔ وہ عشق کے نشے میں ڈوب کر ناچنے لگا۔

میرے دل کو چین آگیا۔ میرا نقاب خاموش دعائیں مانگنے والے ہونٹوں پر پڑ گیا۔ دور دور سے چل کر اس جائے امن تک پہنچنے والے باقی تمام لوگوں سے ہم مختلف نظر آ رہے تھے۔ مجھے اپنے گرد و پیش کا ہوش نہ رہا۔ میں نے عظیم صوفی کے مزار پر مصطفےٰ کی رہائی کی دعا کی۔ میں خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی کہ اپنے لیے تو دعا مانگ لی اور مصطفےٰ کا خیال تک نہ کیا جو جیل میں پڑا ہے۔

ہم جی بھر کر موسیقی سے لطف اندوز ہوئے۔ ہم نے الن فقیر، عابدہ پروین، وحید اور اقبال چانڈیو کو سنا۔ زعفرانی چرغوں میں ملبوس سونگ ناچنے والوں کو ایک تارہ،

کھر مثال اور مستی کی دھن پر گاتے اور چکر کھاتے دیکھا۔ حواس آسمان کی خبر لانے لگے۔ دو دن وجد کے عالم میں گزرے۔ وہاں جتنے بھی لوگ موجود تھے سب نے ہماری مدد کی اور دوستوں کی طرح پیش آئے۔ مجھے اشعار کا مطلب بتایا گیا اور میں موجودہ صورت حال کے حوالے سے ان کی اسرار آمیز معنویت کو سمجھ گئی۔ دو دن کے بعد ہم بھٹ شاہ سے رخصت ہوئے۔ صفر کا چاند گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ کراچی واپس جاتے ہوئے کار یوسف صلاح الدین نے چلائی اور میں بے بے اور ایک مرد دوست کے ساتھ پیچھے بیٹھی اس بات کی شعوری کوشش کرتی رہی کہ جب کار کوئی موڑ مڑے تو میرا بدن ان دونوں میں سے کسی کے بدن سے نہ لگے۔ میری یہ کوشش ان کے لیے تفریح کا سامان بن گئی۔

نصی اور بے بے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے مجھے راضی کر لیا کہ میں بھی ان کے ساتھ لاہور چلوں۔ ایک اور ہی وضع کی زندگی کی جو جھلکیاں میں دیکھ چکی تھی وہ میرے تجسس کو بھڑکانے کے لیے کافی تھیں۔ یہ میری ہی عمر کے لوگ تھے۔ میری طرح ہی سوچتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں کوئی بالکل انوکھی عورت نہیں۔ عجیب عورت بھی نہیں۔ دنیا میں میری جیسی اور بھی عورتیں ہیں جنھیں دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ وہ خاموشی سے دکھ نہیں سہتیں۔ اپنا ردعمل ظاہر کر کے رہتی ہیں۔ اپنی شادی کی وجہ سے میں بہت سی چیزوں سے بے خبر رہ گئی تھی۔ مصطفےٰ مجھے اپنی دنیا میں لے گیا تھا اور وہاں لے جا کر اس نے تمام کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔

یہ گروپ میرے خاندان کا نعم البدل ثابت ہوا۔ میں ایسے لوگوں سے ملی جنھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا۔ ضروری نہیں کہ ایسی زندگی کو جس میں بہت جوکھم ہو یا جو قومی معاملات یا سیاست سے متعلق رہی ہو۔ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ سیاست زندگی کا ایسا تجربہ نہیں جس کے بعد کسی اور تجربے کی گنجائش نہ رہتی ہو اگرچہ سیاست میں دوسرے طبقات اور واقعات سے دوچار ہونے کے ایسے مواقع ملتے ہیں جن کو زندگی کے کسی اور دائرۂ عمل میں رہ کر حاصل کرنے کی امید عبث ہے۔ اس گروپ میں جتنے بھی لوگ تھے وہ سب اپنے اپنے طور پر زندگی کے عملی تجربات حاصل کر چکے تھے۔ ان سب کو ادبار اور کشمکش کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا تھا اور وہ ان آزمائشوں سے زیادہ مضبوط ہو کر ابھرے تھے۔ وہ ذہن رکھتے تھے۔ یہ ذہن ان کی زندگیوں کا تجزیہ کر کے اصلاح کا راستہ سجھا سکتے تھے۔ وہ سوچنے سمجھنے والے لوگ تھے۔ ان کے نقطۂ نظر سطحی نہ تھے۔ کھیل تماشے اور سیر و تفریح ان کے لیے جذبات کے نکاس کے ذرائع تھے۔ اس کھلنڈرے پن کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک کی زیادہ گہری اور کسی بڑے مقصد سے وابستہ ذات پر پردہ پڑا رہتا تھا۔ انہیں سیکھنے سے نفور نہ تھا۔ وہ آسانی

سے مطمئن ہو جانے والوں میں سے نہ تھے۔ میں بڑی آسانی اور بہت خوشی سے ان میں گھل مل گئی۔ انھوں نے مجھے اپنے گروپ میں شامل کر لیا۔ میں ہی وہ چوب پارہ تھی جو ان کے گچ مچ چوبی ٹکڑوں سے بنے معمے میں سے غائب تھا۔ میں خالی جگہ میں بالکل ٹھیک آ گئی۔ یا تقریباً ٹھیک آ گئی۔

لاہور کی رونقیں اپنے شباب پر تھیں۔ عالمی کپ کی دعوتوں کا زور شور تھا۔ سمجھا جا رہا تھا کہ پاکستان کپ جیت لے گا۔ ہم نے ویسٹ انڈیز کی زبردست ٹیم کو ابھی ابھی شکست دی تھی۔ میں نے نصی اور بے بے کا دامن تھام کر ان دعوتوں میں شرکت کی جو ہمارے فاتح کھلاڑیوں کے اعزاز میں دی جا رہی تھیں۔ ان کے بغیر اپنے طور پر کہیں جانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں میری خفیہ بیساکھیاں تھے۔ میں نے نوجوانوں اور جوانوں کی زندگی کا دوسرا رخ بھی دیکھا۔ میں نوجوان لڑکیوں سے ملی جو بہت ماڈرن اور بہت پر اعتماد تھیں اور اس بات پر شرماتی نہیں تھیں کہ دوسرے انہیں غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ نئی پاکستانی لڑکی نفسیاتی اور معاشرتی حجابات سے آزاد ہو چکی ہے اور چست جینز اور منی سکرٹ پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی۔ مجھے یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ لڑکیاں اپنی ٹانگیں کھلی رکھتی ہیں۔ کسی اور کو ان باتوں سے وحشت نہیں ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ایسی چیزیں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہ وہ نسل تھی جو ضیاء کے دور میں بڑی ہوئی تھی۔ یہ نسل بے اور ماؤ اور سوئیکار نو پر جان نہیں دیتی تھی۔ یہ میڈونا، اپا کوکا اور ڈونلڈ ٹرمپ کی پرستار تھی۔ جدلیاتی مادیت کی جگہ مادہ پرستی لے چکی تھی۔ جو محروم تھے وہ سڑکوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور مفلسی سے مراد یہ تھی کہ آدمی کے پاس رہنے کا فلیٹ تو ہو مگر فلیٹ میں ایئر کنڈیشن نہ لگا ہو۔ یہ شہر کا بالائی طبقہ تھا۔ افغانستان کی جنگ اور منشیات کے کاروبار میں اچانک بے پناہ اضافے کے اثرات چھن چھن کر نیچے تک پہنچ گئے تھے۔ نسلی خصوصیات اور امتیازات کے بارے میں کہا جانے لگا تھا کہ یہ تو انسانیات دانوں کے مطلب کی باتیں ہیں۔ میں نے ان لڑکیوں کو رقص گاہ میں ناچتے اور پھرکیوں کی طرح گھومتے دیکھا۔ ناچنے کے یہ انداز تازہ ترین پوپ ویڈیوز سے چنے گئے تھے۔ ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی میڈونائیں۔ جنہیں بھی دیکھو جنہیں بھی چاہو کہنے والی نسل۔

اتنی دیدہ دلیر بننے کا تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی لیکن ان کے بارے میں کسی پاکستانی نقطۂ نظر سے فیصلہ دینا نہ چاہتی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہی تھیں وہ مجھ سے خواب و خیال میں بھی نہ ہو سکتا تھا۔ میں کسی ایسے مرد کے ساتھ ناچ ہی نہ سکتی تھی جو میرا شوہر نہ ہو۔ ایک بار میں مصطفےٰ کے ساتھ ناچ کر سخت مشکل میں

پھنس گئی تھی۔ تعلقات میرے لیے تقدس کے حامل تھے۔ یہ لڑکیاں چاہتی تھیں کہ جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے۔ کون فردا کا انتظار کرے۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ میں کسی اور زمانے میں سانس لے رہی تھی اور نئی نسل کسی اور زمانے میں۔ میں وقت کے کسی پھاٹک میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

جو تضاد نظر آیا درحقیقت میں سب سے زیادہ اسی سے خوف زدہ ہوئی۔ میں جاگیردارانہ نظام کے سائے میں جینے والی عورتوں کی زندگی کو اندر سے دیکھ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم بیک وقت کئی صدیوں میں جی رہے ہوں۔ جدید جیٹ باش ٹولے سے تعلق رکھنے والیاں اس قدر آگے نکل چکی تھیں کہ ان کے سامنے دور دراز دیہی علاقوں میں رہنے والی عورتیں قصے کہانیوں میں ملنے والے کردار بن کر رہ گئی تھیں۔ اس نئے طبقے کو کیا خلوت اور کیا جلوت دونوں میں بدچلنی کی کھلی چھٹی تھی۔ پھر تعجب ہی کیا جو ان کی نظر میں حدود آرڈیننس اور شریعت بل کوئی چیز نہ تھے۔

میں نے کوشش کی کہ عورتوں میں ہی اٹھا بیٹھا کروں۔ میں الگ تھلگ رہنے والی تماشائی تھی۔ مجھے اپنا کردار جاننے میں لطف آرہا تھا۔ کسی سرگرمی میں حصہ لینے کی کوئی خواہش مجھ میں نہ تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر مزہ آتا تھا کہ لوگ لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن جانتی تھی کہ میری زندگی نہیں میری زندگی اس سے کہیں زیادہ بھر پور تھی۔ میں اپنی نوجوانی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ایک بار پھر بائیس برس کی ہو جاؤں۔ لیکن میں نے آئینے میں اپنی طرف دیکھا تو وہاں مجھے پھرکیوں کی طرح گھومتی شکلیں نظر نہ آئیں۔ چونتیس برس کی ہو کر میں حقیقت میں اس تصور تک کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ ایسی دعوتیں جن میں سو سو مہمان بلائے گئے ہوں محض جشن آرائیاں معلوم ہوتی تھیں۔ کسی سے جان پہچان کا موقع تک نہیں ملتا تھا۔ جیسے جاتے ویسے ہی لوٹ آتے۔ موسیقی بہت اونچے سُروں میں جاری رہتی اور اس کان پھاڑ شور میں گفتگو کرنا نہ کرنا برابر تھا۔ میں شور کا بہانہ بنا کر راز بھری سرگوشیوں والے کھیلوں کا مزہ لوٹنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھی۔ میری نظر میں دعوت کا تصور یہ ہے کہ کھانا بیٹھ کر کھایا جائے اور سب کو ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے۔ تاہم میں ان پارٹیوں کے گھیر سے محظوظ ہوتی رہی۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ان میں شرکت کی۔

یاد آتا ہے کہ جن دنوں عالمی کپ کی وجہ سے ہر طرف کرکٹ کا تیز بخار پھیلا ہوا تھا مجھے یوسف کی حویلی جانے کا موقع ملا۔ وہاں کرکٹ کے عظیم کھلاڑی، عمران خاں سے ملاقات ہوئی جس کا ایک عالم پرستار ہے۔ میں کرکٹ کی شوقین نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوتا

تھا کہ کرکٹ ضرور کوئی دانشورانہ کھیل ہو گا۔ آخر یہ صرف دانشوروں کے لیے ممکن ہے کہ پانچ دن تک اکٹھے رہیں اور پھر کسی فیصلے پر پہنچے بغیر اٹھ کھڑے ہوں۔ عمران خاں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ہمارا تعارف کرایا گیا۔ اس پہلی ملاقات نے مجھ پر کوئی تاثر نہ چھوڑا لیکن جب اس سے واقفیت بڑھی تو میں اسے بہتر طور پر سمجھنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اصولوں کا بڑا پکا، بہت کھرا اور بہت راست باز ہے۔ میں نے دیکھا کہ پٹھان کی کچی اقدار اس کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ اس کی غیرت مندی اور جان لڑا کر مقابلہ کرنے کی عادت سے ملک کو بہت فیض پہنچا ہے۔

جب میں نے اندر قدم رکھا تو سارے نوجوان فرش پر دراز تھے۔ میرے داخل ہونے پر کسی نے اٹھنے کی زحمت نہ کی۔ یہ مجھے بہت عجیب لگا۔ میں ایک ایسی دنیا سے آئی تھی جہاں شرفاء ہمیشہ مجھ سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے میں کوئی بہت معزز خاتون ہوں۔ میری کبھی ایسے مردوں سے ملاقات نہ ہوئی تھی جو میرا خیر مقدم کرنے کے لیے اٹھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کریں۔ یہ نوجوان مرد اور عورتیں آداب محفل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

یوسف کو تو براہ راست کسی مغل منی ایچر تصویر سے نکال کر پیش کر دیا گیا تھا۔ بظاہر وہ وقت کے کسی اور دھارے سے بچھڑ کر ہمارے زمانے میں آنکلا تھا۔ اپنا ماضی وہ ساتھ لایا تھا۔ مستقبل کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ اس کا قائل تھا کہ کھانے ہوں تو اچھے سے اچھے، مشروبات ہوں تو اعلیٰ سے اعلیٰ۔ ماضی ہر طرف حال پر چھایا نظر آتا تھا جس سے عجیب سا ان مل بے جوڑ پن وجود میں آگیا تھا۔ وہ مرمریں تخت پر نیم دراز ہو کر منظر کا شاہانہ تحقیر سے جائزہ لیتا۔ خراماں خراماں پھرنے والی کنیزوں نے ایسی پشوازیں اور چوڑی دار پاجامے زیب تن نہیں کر رکھے تھے جن سے بدن صاف دکھائی دے۔ انھوں نے منی سکرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے بال بنانے کے انداز مغل اور PUNK طرزوں کا آمیختہ تھے۔ یوسف پدرم پدر نواب دکھائی دیتا۔ ادھر وہ شاہی دربار کو ازسر نو تخلیق کر رہا تھا، اُدھر جمہوریت کی بحالی کے پوسٹر اس کی حویلی کے باہر دیواروں کو داغ دار کر رہے تھے۔

میری مبشر سے ملاقات ہوئی جو موبی کہلاتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو جتنے قوی تن ہوتے ہیں اتنے ہی خاموش رہتے ہیں۔ میں بتا سکتی تھی کہ وہ بڑا گہرا آدمی ہے، جیسا کہ کہاوت میں ہے کہ "ساکت پانی، گمبھیرتا کی نشانی"۔ ہم دونوں میں بڑی دوستی ہو گئی۔ ہماری خاموشیاں ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئیں۔

میں پہلی بار کرکٹ میچ دیکھنے گئی۔ نعمی اور جے جے کو بڑا جوش چڑھا ہوا تھا۔

میں ان کے جوش کے حوالے سے پیچ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اچھل کھڑے ہوتے اور داد دیتے تو میں بھی ویسا ہی کرتی اور جب وہ مغموم ہو کر بیٹھے رہتے تو میں بھی اپنے چہرے پر کوئی ملتی جلتی کیفیت طاری کر لیتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب عمران سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ "میں نے دیکھا آپ نے کس طرح ویسٹ انڈیز کو اپنی بیٹنگ سے آؤٹ کر دیا۔" عمران نے چڑ چڑے انداز میں اپنی مشہور آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس دن سے مجھ سے صرف ایک ہی حماقت نہیں ہوئی۔ میں نے معلی سے پوچھا کہ کیا وہ بھی کرکٹر ہے۔ جس ٹیم کے بارے میں ہر کوئی رطب اللسان تھا میں اس کے ارکان کو پہچانتی تک نہ تھی۔ میری زندگی، حالات میں تبدیلی لانے کی کوشش میں، کہیں اور ہی گزری تھی اور ادھر کرکٹ کے کھلاڑیوں کی یہ نسل سپر سٹاروں کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔

میں نے اپنے نئے دوستوں کے درمیان خود کو محفوظ محسوس کیا۔ یہ لوگ مجھ سے میری خاطر ملتے تھے۔ مجھے کسی سیاست دان کی توسیع سمجھ کر ملنے نہ آتے تھے۔ میں نے اپنے دوست آپ چنے تھے۔ وہ مجھ پر مسلط نہیں کیے گئے تھے۔ یہ دوست میں نے اس وقت بنائے تھے جب مصطفےٰ میرے پاس نہ تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

عاصمہ جہانگیر کا خیال تھا کہ اگر میں نے بچوں کو ساتھ لے کر ملک چھوڑنے کی کوشش کی تو مصطفےٰ شاید حکم امتناعی حاصل کر لے اور انہیں باہر نہ جانے دے۔ میں نے طے کیا کہ بچوں کو لندن بھجوائے دیتی ہوں۔ اکیلے چلے جائیں۔ سوچا یہ تھا کہ ان کے جانے کے دو دن بعد میں بھی روانہ ہو جاؤں گی۔ میں نے لندن اپنی بہن منو کو فون کیا۔ مصطفےٰ کے پاس واپس آجانے کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ہوائی اڈے جا کر بچوں کو لے آئے اور دو دن انہیں اپنے پاس رکھے۔ اتنی دیر میں میں آپ لندن پہنچ جاؤں گی۔ منو نے حامی بھری اور بچوں سے دوبارہ ملنے کا موقع ہاتھ آنے پر بہت خوش ہوئی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ منو بول رہی تھی۔ اس نے امی سے بات کی تھی اور امی نے کہا تھا کہ مجھ سے بالکل کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ بچوں کو لینے ہوائی اڈے نہ جائے۔ اگر اس نے امی کی حکم عدولی کی تو بچوں کو اگلے طیارے پر بٹھا کر پاکستان واپس بھیج دیا جائے گا۔ منو کہنے لگی کہ اس کے پاس امی کے حکم کی تعمیل کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ امی نے کہا کہ اس دفعہ بچوں کو اغوا میں نے کیا ہے! امی مجھے مصطفےٰ کی پاس لوٹ جانے کی سزا دینا چاہتی تھیں۔ ہمارے اس بیکار کے کھیل میں

بیچارے بچے ایک بار پھر مہرے بنے ہوئے تھے۔

میرے بچے طیارے پر تھے۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کس سے رابطہ قائم کروں۔ پریشانی کی مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لندن میں بہتیرے دوست موجود تھے لیکن میں ان میں سے کسی کو اس معاملے میں الجھانا نہ چاہتی تھی۔

میں نے منو کو فون کیا۔ اس سے کہا کہ وہ بچوں کو لینے ہوائی اڈے نہ جائے۔ "وہ خود ہی تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم امی کو فون کر کے بتا دینا کہ بچے آپ ہی آگئے ہیں اور اب تم انہیں گھر سے نکالنے سے تو رہیں۔"

اس کے لیے وہ آمادہ ہو گئی۔ میں نے پی آئی اے کے منیجر کو فون کیا اور کہا کہ بچوں کو ٹیکسی دلا کر منو کے پتے پر بھجوا دیا جائے۔

لندن میں جن جن لوگوں کو میں جانتی تھی انہیں فون کرنا چاہا۔ کسی سے بات نہ ہو سکی۔ بیچارے بچے ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر اترے۔ وہ سہمے ہوئے تھے۔ رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ وہ اپنی خالہ کو ڈھونڈتے رہے جس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پی آئی اے کا منیجر ان کے پاس آیا اور انہیں لے جا کر ٹیکسی میں بٹھا کر چلتا کر دیا۔ وہ اس کاغذ کو جس پر منو کے گھر کا پتہ درج تھا اس طرح مضبوطی سے پکڑے بیٹھے تھے جیسے ان کی زندگی کا دارومدار اسی چٹ پر ہو۔ چیسٹر ایونیو میں انہیں منو کا مکان نہ مل سکا۔ ٹیکسی ڈرائیور جھنجلا اٹھا۔ اس نے بیچارے ننھے ننھے بچوں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ نصیبہ نے بعد میں مجھے بتایا کہ ان سب کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ ڈر رہے تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور انہیں کہا چھپا جائے گا یا اس سے بھی بدتر یہ کہ انہیں کسی بالکل انجانی جگہ اتار کر چلتا بنے گا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہر شے نامانوس معلوم ہو رہی تھی۔ بچوں کا کہنا ہے کہ ہیتھرو سے منو کے گھر تک کا سفر ان کے پاکستان آنے کے سفر سے کہیں زیادہ ڈراؤنا تھا۔ اس وقت کم از کم عربی تو ان کے ساتھ تھا۔ اس بار وہ بالکل اکیلے تھے۔

آخر کار مکان انہیں مل ہی گیا۔ منو انہیں اندر لے گئی۔ ان سب کو منو بہت اچھی لگتی تھی۔ منو نے ان کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے امی کو فون کیا۔ یہ خبر سنتے ہی امی کا تو فیوز اڑ گیا۔ انہوں نے منو سے کہا کہ بچوں کو اگلی پرواز پر بٹھا کر کراچی روانہ کر دیا جائے۔ منو کے شوہر علی نے کہا کہ وہ ایسی بیہودہ اور سنگدلانہ حرکت میں ماں بیٹی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے اپنے خاندان کو ایک بار پھر بحران میں مبتلا کر دیا تھا۔ بچوں نے رات بھر منو کے ہاں قیام کیا۔ اگلی صبح امی نے منو کو فون کیا۔ وہ میرے بھائی، عاصم، سے بات کر چکی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ بچوں کو فوراً گھر واپس بھجوا دیا جائے۔ منو پر بجلی گر پڑی۔ اس نے حواس باختہ ہو کر مجھے بار بار فون کیا۔ اس

کو دی گئی ڈیڈلائن کا وقت ختم ہونے کو تھا۔ میں ذہنی طور پر بری طرح تھک چکی تھی۔

نعمی نے اپنی بہن، جنی، سے کہا کہ بچوں کو اپنے گھر لے آئے۔ بیچاری جنی۔ وہ بوکھلا گئی۔ میرے خاندان کے نامعقول رویے کی لم کو پہنچنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ حیران تھی کہ امی کو میری بہن پر اتنا غلبہ حاصل ہے۔ منو اتنی زیادہ خوف زدہ تھی کہ ایک اصولی موقف پر بھی قائم نہ رہ سکی۔ اس کا شوہر بھی اتنا ہی حیرت زدہ اور پریشان تھا لیکن منو کا یہ خوف کہ امی کہیں اسے عاق نہ کر دیں ہر چیز پر غالب آگیا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ امی نے اپنے نواسوں نواسیوں کو ایسی اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے اس فعل کو کسی دلیل کی رو سے حق بجانب قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

جنی کے اپنے بھی بچے تھے۔ اسے کالج جانا ہوتا تھا اور وہ انھیں اکیلے چھوڑ کر نہ جا سکتی تھی۔ میں نے پاکستانی سفارت خانے سے ایک بہت باکمال خاتون، منصورہ، کا بندوبست کر دیا۔ منصورہ نے ازراہ کرم دن کے وقت بچوں کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لی۔ نعمی کی امی بھی میرے بچوں کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آئیں۔ میں کبھی بھول نہیں سکتی کہ میں انھیں جانتی تک نہ تھی اور میں نے ان پر اتنا بوجھ ڈال دیا۔

میں ننھے حمزہ کو ساتھ لے کر لندن پہنچی۔ اب بچے پھر میرے پاس تھے۔ میں اپنے اپارٹ منٹ میں منتقل ہو گئی۔ طے کیا کہ انھیں انگلینڈ میں کسی بورڈنگ سکول میں داخل کرا دینا چاہیے۔ میں نے کینٹ میں ایک خوبصورت سکول تلاش کر لیا جسے اسلامی خطوط پر چلایا جارہا تھا۔ ایک لبنانی اس کا مالک بھی تھا اور ناظم بھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ مصطفےٰ اپنے پرانے دلائل استعمال کرے اور بچوں کو اس بہانے واپس بلا لے کہ انھیں مغرب کے اخلاق باختہ طرزِ زندگی سے دوچار ہونے سے بچانا مقصود ہے۔

مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ یہ اپنے حالات اور معاملات کا جائزہ لینے کا زمانہ تھا۔ میں نے تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں مغموم تھی اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ مجھے یہ احساس جرم ستا رہا تھا کہ ایک قیدی کو اپنے حال پر چھوڑ کر چلی آئی ہوں۔ جب تصور کرتی کہ وہ اکیلا قید خانے میں بند پڑا ہے تو راتوں کی نیند اڑ جاتی۔ اسے چھوڑ کر چلے آنے کا کوئی معقول جواز میرے پاس نہ تھا۔ مجھے یہ بہت ناگوار گزرتا تھا کہ وہ تو پہلے ہی پچھڑ چکا تھا اور اوپر سے میں اسے ٹھوکریں ماروں۔ یہ میرے مزاج کے خلاف تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ بے سہارا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ میری جگہ کسی اور عورت کو لے آئے۔ کوئی بیوی جو اس سے ملنے آسکتی ہو۔ یہ سوچ کر میری طبیعت خراب ہونے لگتی کہ میں ایک زبوں حال مرد سے لڑتی رہی ہوں۔ مجھے دکھ یہ تھا کہ مصطفےٰ کو چھوڑ کر بھاگ آنے

کے لیے جو وقت میں نے چنا تھا وہ غلط تھا۔ فرار ہونے کی وجوہ غلط نہ تھیں۔

میری شخصیت میں تبدیلی آچکی تھی۔ مجھے ہر طرف آنکھیں نظر آنے لگیں۔ کھوکھلی بے جان آنکھیں۔ غصیلی آنکھیں۔ للکارنے والی آنکھیں۔ سہمی سہمی آنکھیں۔ آنکھیں جو خوابوں کا ذائقہ تک بھول چکی تھیں۔ کہتے ہیں کہ آدمی کی آنکھیں اس کے تمام اجتماعی تجربات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وہ ایک طرح کا ریکارڈ ہیں۔ ایک مسلسل آئینہ جس پر یکے بعد دیگرے تصویر پر تصویر چھپتی رہتی ہے۔ یہ آنکھیں لندن میں میرے فلیٹ میں میرا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ مجھے استقامت کی کمی کے طعنے دیتیں۔ مجھے چڑاتیں کہ میں نے ان سے منہ موڑ لیا ہے۔ میں ایک کام ادھورا چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ ان کی امیدیں جونکوں کی طرح مجھے چمٹی ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے بے وفائی کی تھی۔ میں ان کی جدوجہد کا حصہ بن چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے حالات بہتر بنائے جاسکتے ہیں۔ ان کے افلاس، ان کی خستہ حالی اور غربت کے ہاتھوں تذلیل کو میری خطابت پردازی کے لیے محض خام مواد کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ مصطفےٰ گو میرا شوہر نہ رہا تھا لیکن وہ اب بھی میرا قائد تھا۔ اس کے وژن کو میں اپنے میں جذب کر چکی تھی۔ یہ اس کا خواب تھا جسے میں حقیقت میں بدلنے کی خواہاں تھی۔ اسے میری ضرورت تھی۔ میں تصور کرتی کہ وہ اکیلا پڑا ہے، ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور نومیدی کا شکار ہے۔ موجودہ بے بسی کی حالت تک وہ اپنے مزاج کی وجہ سے پہنچا تھا۔ اس نے اس وقت مجھے دھکیل کر پرے کر دیا۔ جب اسے اپنا مشن پورا کرنے کے لیے میری ضرورت تھی۔ میں تاریخ میں اپنا نام ایسی عورت کے طور پر درج نہ کرانا چاہتی تھی جس کی وجہ سے ایک خواب ادھورا رہ گیا۔

میری پینٹنگز نے مجھے راہ دکھائی۔ میں تقریباً بے خودی کے عالم میں کینوس پر اپنے ان تجربات کو ازسر نو تخلیق کرتی رہی جو دنیا کے پسے اور کچلے ہوئے انسانوں کے درمیان رہ کر مجھے حاصل ہوئے تھے۔ جب میں تذبذب کے متلاطم پانیوں میں سفر کر رہی تھی تو فیض احمد فیض کی انسان دوست شاعری نے میری لیے چپوؤں کا کام کیا۔ ان کے لفظوں نے انسانی شکلیں اختیار کر لیں۔ برش سے کھینچی ہوئی ہر لکیر مجھے اس فیصلے سے قریب تر لاتی گئی کہ مجھے لوٹ جانا چاہیے۔

فیض نے اپنا شاہکار لکھا تھا "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ۔" یہ نظم خالص جدلیات ہے۔ نصف اول عشقیہ نظم ہے۔ اس میں عشق کی اس قوت کا ذکر ہے جس کی زد میں آکر سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ عاشق دنیا سے منہ موڑ چکا ہے اور اسے اپنے محبوب کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں۔ نظم کا نصف

آخر سیاق و سباق کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں حسن کا سودا ہوتا ہے اور فریب نظر کے کھیتوں میں بھوک اگتی ہے، محبت کیا معنی رکھ سکتی ہے۔ "لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے/اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے/اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔"

یہ مصرعے مجھے اپنی روداد معلوم ہوئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اپنے ذہنی سکون کی خاطر میں نے عوام کی خوشیوں کو بیچ کھایا ہے۔ زندگی کی طرف کھلنے والے دروازے بند کیے جا سکتے تھے۔ میں اپنے ریشمی خول میں محفوظ و مامون تھی لیکن -- وہی "اور بھی دکھ ہیں"۔ میں نے گلی کوچوں میں پلنے والے میلے کچیلے اور خراب و خستہ لڑکوں کی تصویریں بنائیں جن کا ماضی، حال اور مستقبل گندگی کے ایسے ڈھیروں سے وابستہ تھا جہاں کرکٹ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی پسلیاں سوکھ کر کانٹا جسم پر منڈھی ہوئی کھال کی بندشوں سے باہر آنا چاہتی تھیں۔ میں نے ان ماؤں کے چہروں پر طاری کیفیتوں کی تصویر کھینچی جن کی چھاتیاں سوکھ گئی تھیں۔ میں نے اپنی تصویروں کو ایسے بوڑھے مردوں اور عورتوں سے بھر دیا جو ایک گلی میں، تھکن سے چور ہو کر، سر جھکائے بیٹھے تھے۔ امید کسی مثلون سورج کی طرح ان کے قریب سے گزر گئی تھی۔ رنگ کالے، خشری اور کھتئی تھے۔ شکلیں میری طرف تک رہی تھیں۔ وہ تقاضا کرتی معلوم ہوتیں۔ "لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے/اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا/اور بھی دکھ ہیں۔"

فیض کی ایک اور نظم دبے پاؤں میرے کینوس تک چلی آئی۔ "نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں/چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔"

میں نے ایسی عورتوں کی تصویریں بنائیں جن کے سر جھکے ہوئے تھے۔ جن کے بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے وہ ماتم کر رہی ہوں۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے لیے فیض نے شعر کہے تھے، جن کے لیے آنسو بہائے تھے۔ عام لوگ جن کی محدود سی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ وہ میرے ذہن میں سرایت کر گئے اور پھر کینوس پر ایک واضح پیغام لے کر نمودار ہوئے۔ تمھاری سرزمین، اس کی سڑکیں، اس کے گلی کوچے، تمھیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ تمھیں اپنی جان اس سرزمین پر، ان لوگوں پر، وارنی پڑے گی۔ خاموشی کو ہرگز پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔ خوف کے مقابلے میں ڈٹ جانا ضروری ہے۔

جیل کی تصویریں سیل رواں بن کر میرے ذہن میں امڈ آئیں۔ میں نے جیل میں ایسی عورتیں دیکھی تھیں جن کے ساتھ جیل کے عملے نے زنا بالجبر کیا تھا۔ خوف زدہ جیلر انھیں اسقاط حمل کے لیے لے جاتے تھے کیونکہ وہ اپنے مجرمانہ افعال کے تمام شواہد مٹا دینا چاہتے تھے۔ ان عورتوں کو معصوم جنینوں کے قتل کی کوششوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ بعض کے بچے پیدا ہو گئے تھے۔ کھوٹ ملے انصاف کی ناجائز اولادیں۔ میں نے ان کو پینٹ کیا۔ ماں بچہ دونوں سلاخوں کے پیچھے۔ رہائی سے خائف کیونکہ ان کے بارے میں باہر کی دنیا کا رویہ مخالفانہ بھی تھا اور غیر یقینی بھی۔

تصویریں بنائیں تو مجھے پتہ چلا کہ میں پاکستان سے اپنے رشتے منقطع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہوں۔ اپنے ماضیٔ قریب سے میرا تعلق بدستور قائم تھا۔ عوام کے روبرو اپنی غیر حاضری کا جواز پیش کرنا مجھ پر لازم تھا۔ میری طرف سے اس بارے میں کوئی بیان آنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے مجھے کسی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔ مصطفےٰ کھر مجھے ایسا پلیٹ فارم فراہم کر چکا تھا۔ میں بذات خود ابھی اس طرح کا کام انجام دینے کے لیے لیس نہ تھی۔ عوام کے درمیان میری جو بھی حیثیت تھی صرف مصطفےٰ سے میرے رشتے کی بنا پر تھی۔ مجھ میں ابھی اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اپنے لیے کوئی مقام پیدا کرنے کی کوشش کر سکتی۔ میں مصطفےٰ کی سیاست پر یقین رکھتی تھی۔ اس کے آج پر یقین رکھتی تھی۔ اس کا سیاسی حال قابلِ احترام تھا۔ جو سیاست مجھے آتی تھی میں نے اسی سے سیکھی تھی۔ مجھے اپنے محرکات سے موقع پرستی کی بُو آئی۔ لیکن کاز کے لیے میرے خلوص نے مجھے یقین دلایا کہ میں صحیح راستے پر ہوں۔ مصطفےٰ ہی وہ شخص تھا جس کا سہارا لے کر میں بلندیوں کو چھو سکتی تھی۔ جب وہ جیل سے باہر آئے گا تو میں اسے اپنی اہلیت ثابت کرنے کا موقع دوں گی۔ میں قید و بند سے اسے چھڑانے کی کوشش میں ہاتھ بٹاؤں گی۔ مجھے واپس جانا ہی پڑے گا۔ سیاست کا دل فریب گیت مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے خود کو ایک کمزور مستقبل سے، یعنی اپنے بارے میں خوش گمانیوں کے مستقبل سے، باندھ رکھا تھا۔ مجھے یاد آ گیا میں نے اس کا ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک بار پھر میں سامان پیک کرنے میں جت گئی۔ پر چھتی سے کیبن ٹرنک اتارے گئے۔ میں نے بچوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔ سکول میں ان کا دل نہ لگا تھا۔ ان کو پاکستان کی یاد ستا رہی تھی۔ انھیں اپنے والد کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ بورڈنگ سکول سے انھیں نفرت تھی۔ ہم پاکستان روانہ ہو گئے۔

مصطفےٰ کی حالت خستہ تھی۔ وہ روتا رہتا۔ کوئی اسے ڈھارس دینے والا نہ تھا۔ اس کا وزن خاصا کم ہو گیا تھا۔ اسے عدالت میں پیش ہونا پڑتا۔ لیاقت باغ فائرنگ کے مقدمے کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ میں نے بچوں کو اس سے ملنے بھیجا۔ پریس کے مزے ہو

گئے۔ اخباروں میں "شیر" اور اس کے بچوں کے آنسوؤں بھرے ملاپ کی تصویریں چھپیں۔

اگلے دن میں مصطفیٰ سے ملی۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ ہم نے دوبارہ تعلق استوار کرنے کے موضوع سے احتراز کیا۔ دونوں بہت محتاط تھے۔ میں نانی اماں کے ساتھ لاہور واپس آ گئی۔ نانی اماں میری زندگی کے بارے میں بہت فکرمند تھیں جس میں کسی قسم کا استحکام پیدا ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس بارے میں بھی کچھ زیادہ پُر اعتماد نہ تھیں کہ میں جو قدم اٹھانے والی ہوں وہ صحیح ہے۔ میرے بچوں کو یقین تھا کہ میں صحیح قدم اٹھا رہی ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے والدین میں صلح صفائی ہو جائے۔

تعی اور بے بے یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ میں مصطفیٰ کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ وہ سمجھ گئے کہ میں ایسا قدم کیوں اٹھانے والی ہوں۔ میں مصطفیٰ سے ملنے گئی۔ وہ کھانا پکا رہا تھا۔ اس نے مجھے پلاؤ اور تیتر کھلائے۔ ہم بات کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ مصطفیٰ نے پہل کی۔ "آؤ اپنی شادی کو ایک موقع اور دیتے ہیں۔ میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ آؤ اسے بھول جائیں۔"

مجھے بتانے لگا کہ جتنے عرصے میں اس سے الگ رہی وہ اپنی جان سے بیزار رہا۔ وہ جانماز پر بیٹھا روتا رہتا۔ وہ سسکیاں لیتا اور زور زور سے گریہ وزاری کرتا۔ یہ دیکھ کر کہ اس جیسا دلیر آدمی بھی رونے دھونے پر مجبور ہو گیا ہے باہر تعینات پہرے دار اور خدمت گزار غم زدہ ہو جاتے باہر کھڑے کھڑے وہ اس کے حال پر آنسو بہاتے۔ مصطفیٰ نے کہا کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے ہولناک برتاؤ کرتا رہا ہے۔ اپنے پُرتشدد رویے کی یاد اس کے حق میں عذاب بن گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا چہرہ اکثر اسے خواب میں دکھائی دیتا۔ اس کے تشدد کی وجہ سے سہمی سہمی اور بت بنی نظر آتی۔ خواب میں نظر آنے والے چہرے اسے عذاب دے رہے تھے۔ اس نے عدیلہ والے واقعے کا ذکر کیا۔ اسے یقین تھا کہ اس میں شیطان حلول کر گیا تھا۔ اللہ نے اسے سزا دی تھی۔ اب وہ جیل میں تھا اور میں آزاد۔ اس نے یاد کیا کہ میں کس طرح اپنے کمرے میں بند جانماز پر بیٹھی، آنسوؤں سے تسکین اور تربتر قرآن مجید کو سینے سے لگائے، اللہ کے حضور میں آنسو بہاتی رہتی تھی۔ اب اس کے پاس اس کوٹھری اور کلام الٰہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں اس سے جدا ہو چکی ہوں۔ وہ پریشان تھا۔ میں جوان اور دلکش تھی۔ مجھے بڑی آسانی سے کوئی اور مرد مل سکتا تھا اور میں نئے سرے سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ ایسی زندگی جس میں مصطفیٰ کھر کی طرف سے دی گئی اذیتوں کا

کہیں پتہ نہ ہو۔ اس نے میری آزادی کے دنوں کے قصے سنے تھے۔ اس کا حسد دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ عدیلہ والے معاملے میں اس نے میرے جذبات کو کس طرح ٹھیس پہنچائی تھی، مجھے کتنا دکھ دیا تھا۔ اس پر انکشاف ہوا تھا کہ ہمارا گھر دراصل میرے لیے جیل تھا۔ میری تنہائی اس کی قید تنہائی سے مشابہ تھی۔ یہ ایک راست بازانہ انداز تھا۔ وہ اپنا احتساب آپ کرنے میں مشغول تھا۔ ہمارے درمیان کشیدگی کی وجوہ اس پر واضح ہو چکی تھیں۔ اور وہ اپنے رویے کی تلافی کے لیے تیار تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ پہلے جیسی حرکتیں نہیں کرے گا۔ ہم نے صلح کر لی۔

میں پُر اعتماد تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں دنیا اور پریس کو بدل سکتی ہوں۔ میں ایسا بے لچک رویہ اپنانے کے حق میں نہ تھی جس کا مقصد صرف اپنے امیج کو تحفظ دینا ہو اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ان باتوں کو جو میرے خیال میں صحیح ہوں، قربان کر دیا جائے۔ مجھ میں اپنی غلطیاں تسلیم کرنے کی جرأت تھی۔ جو تکلیف تھی سو میرے حصے میں آئی تھی۔ میں نے اپنے شوہر کو چھوڑتے وقت یہ تک نہ سوچا تھا کہ اس بارے میں عوام کس قسم کی رائے ظاہر کریں گے میں دوسروں کی آراء کے خوف کو اپنے فیصلوں پر اثر انداز نہ ہونے دوں گی۔ لوگ جو کچھ سوچ رہے تھے وہ موقع محل سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ میں ان کے سامنے وضاحتیں پیش کرنے کو تیار نہ تھی جب اخبار والوں نے کہا کہ میں اپنے متلون طرز عمل کا جواز سامنے لاؤں تو مجھ میں اتنا اعتماد آ چکا تھا کہ میرے جواب میں شیشے کی رمق تک نہ تھی۔ میں نے کہا۔ "چھوڑنے کا فیصلہ بھی میرا تھا اور لوٹ آنے کا فیصلہ بھی میرا ہے۔ میں اسی جوش و خروش سے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے مہم جاری رکھوں گی۔" میرا کہا مان لیا گیا۔ میں نے بات جو انتہائی اعتماد سے کہی تھی۔ یہ نکتہ میں نے مصطفیٰ سے سیکھا تھا۔ احمقانہ انداز میں ہر وقت ایک ہی بات پر اڑے رہنے سے متضاد باتیں کرنا بہتر ہے۔ غلطیاں تسلیم کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ میں تہیہ کر چکی تھی کہ مصطفیٰ کو رہا کرانے کی کوشش پورے خلوص سے جاری رکھوں گی۔ اگر وہ رہنمائی کرنے کے قابل ثابت نہ ہوا تو میں اس کا قبلہ درست کرنے میں مدد دے سکتی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مصطفیٰ کو ہمیشہ میری موجودگی کا احساس رہے گا اور وہ اس خیال سے کہ کہیں میں سیاست کی طرف سے بد دل نہ ہو جاؤں، جوش میں آ کر شاید وہ کچھ کر دکھائے جس کا اسے دعویٰ ہے۔ میں اپنے احساسِ جرم کو دھو چکی تھی۔

میں نے اپنی دوستیاں قائم رکھیں۔ مصطفیٰ چاہتا تھا کہ میں اس کے بغیر اپنے دوستوں سے نہ ملوں۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت ماڈرن اور روایتی اقدار سے محروم

ہیں۔ بنیادی طور پر وہ خود عدم تحفظ کے احساس کا مارا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے جو دوست بنائے ہیں وہ ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تمہارے دوستوں کی کوئی جڑیں نہیں اور معاملات کو وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو ان جیسوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

اڈیالہ جیل میں میری سیاسی تعلیم کا پوری سنجیدگی سے آغاز ہوا۔ لگتا تھا وہ کوئی یونیورسٹی ہے جہاں میں ہر ہفتے اپنے ٹیوٹوریل کے لیے جاتی ہوں۔ پریکٹیکل عوام کی معمل گاہ میں کرنے پڑتے تھے۔ میڈیا میری ہر چال کا جائزہ لے کر مجھے کامیاب یا ناکام قرار دیتا۔ مصطفیٰ نے مجھے ہر بات کا سبق دیا۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ میں اس پر یقین لے آؤں۔ اس نے میری حوصلہ افزائی کی کہ میں سوال پوچھوں اور میں نے محسوس کیا کہ وہ جوابوں کو پہلی بار تشکیل دے رہا ہے۔ اچھے طالب علم کی طرح میں اسے اکسا کر غور و فکر کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے بہترین رویہ اپنائے رکھا۔ وہ مکمل شوہر اور مکمل باپ تھا۔ مکمل رہنما تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جسے میں اپنا قائد تسلیم کروں اس کے لیے مثالی انسان ہونا کتنا اہم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ سیاست اور آدرش پسندی کے لبھاؤ نے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ میری اشتہا کو بڑھاتا رہا۔

تاج الملک کے گھر کی انیکسی میرے حوالے کر دی گئی اور میں نے اسے دفتر میں تبدیل کر لیا۔ این پی پی کے کارکن جوق در جوق میرے پاس آنے لگے۔ پارٹی کو ایسا مرکزی نقطہ مل گیا جس کی اسے انتہائی شدید ضرورت تھی۔ جیسا کہ مصطفیٰ نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کارکن چوہدری حنیف اور چوہدری ارشاد سے بدظن ہو چکے تھے۔ ان کے بارے میں لہر سے لے کر زیادہ سنجیدہ نوعیت کی طرح طرح کی کہانیاں سننے میں آرہی تھیں۔ تمام کارکن میرے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت پڑی جو تجربہ کار بھی ہو اور وفادار بھی۔ میں نے ساتھ مل کر کام نمٹانے کے لیے ملتان سے میاں ساجد پرویز کو بلا لیا۔ اسے 1967ء سے بھٹو صاحب اور مصطفیٰ کے ساتھ کام کرنے کا جو تجربہ تھا وہ اس مرحلے پر میرے لیے بے بہا ثابت ہوا۔ ساجد وہاں میری رہنمائی کرنے اور مصطفیٰ کی چالوں گھاتوں پر عمل درآمد میں میرا ہاتھ بٹانے کے لیے موجود تھا۔ وہ سارے وقت میرے پاس رہا۔ میں چوہدری مختار اور رانا ایوب کو بھی تنظیم میں لے آئی جنہوں نے سیاست کا درس بطور طالب علم رہنما حاصل کیا تھا۔ میں انہیں اس وقت سے جانتی تھی جب میری مصطفیٰ سے نئی نئی شادی ہوئی تھی۔

ہم نے این پی پی کے ان ارکان سے رابطہ کیا جو مالدار تھے۔ ہم انہیں ایسے پوسٹر

چھپوا کر دینے پر آمادہ کرنا چاہتے تھے جن میں مصطفیٰ کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ مصطفیٰ کی رہائی کے لیے میڈیا میں مسلسل مہم چلانے کا وقت آپہنچا ہے۔ ان رہنماؤں کی طرف سے دیے گئے اشتہار اخباروں میں شائع ہوئے۔ مصطفیٰ کے کاز کو زندہ رکھنا اہم تھا۔

کارکنوں میں میری روز افزوں مقبولیت بعض رہنماؤں پر گراں گزری۔ وہ میرے اور مصطفیٰ کے بارے میں افواہیں اڑانے لگے۔ انہوں نے کارکنوں سے کہا کہ میرے گرد جمع نہ ہوں کیونکہ مصطفیٰ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔ انہوں نے مجھ پر نکتہ چینی کی کہ میں مصطفیٰ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی اور الزام لگایا کہ میں فوج سے ساز باز کر رہی ہوں تاکہ مصطفیٰ ساری عمر جیل ہی میں سڑتا رہے۔ "وہ چاہتی ہے کہ مصطفیٰ کھر مر جائے۔" انہوں نے کہا۔ کارکن پھر بھی میرے پاس آتے رہے۔ جب میں مصطفیٰ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی تو انہیں خاصا صدمہ پہنچا تھا۔ ان میں سے بعض کو اب بھی میری نیت پر شک تھا۔ رہنماؤں نے شکوک کی فصل بونے کے لیے زرخیز خطۂ زمین چنا تھا۔ میری توقیر اور اہمیت گھٹانے کی اس سازش سے مصطفیٰ کو مطلع کر دیا گیا۔ اس نے بیان جاری کیا۔ "میری بیوی میری نمائندگی کر رہی ہے۔ یہ وہی کچھ کہتی اور کرتی ہے جو میں چاہتا ہوں۔"

میرے حریفوں کا منہ بند تو ہو گیا مگر وہ زیادہ دیر چپ نہ رہے۔ وہ میری روز افزوں طاقت سے خائف تھے۔ ان کے حملوں نے ثابت کر دیا کہ وہ سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ میری وجہ سے ان کے اقتدار کی اساس خطرے میں پڑ گئی ہے۔

مصطفیٰ کے بھائی بھی میری سیاست آرائی کے خلاف تھے۔ مرتضیٰ کھر جونیجو کی حکومت میں قومی اسمبلی کا رکن تھا۔ ربانی کھر بھی پارلیمنٹ کا رکن اور میاں نواز شریف کا ساتھی تھا۔ غلام عربی این پی پی میں تھا اور اس سے میری دوستی قائم رہی۔

میں نے اپوزیشن کے رہنماؤں سے ملنا شروع کیا تاکہ ان سے کہوں کہ وہ مصطفیٰ کو رہا کرنے کا تقاضا کریں۔ ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں نے 1985ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور وہ پارلیمنٹ سے باہر تھیں۔ ملک میں حقیقی اپوزیشن انہیں جماعتوں پر مشتمل تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سیاسی قیدیوں کے مسئلے پر ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کو سخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ان قیدیوں کو چھڑانے کی کوشش کرنا ان کا اخلاقی فرض تھا۔ مصطفیٰ سیاسی قیدی تھا۔ وہ جمہوریت کی بحالی اور مارشل لا اٹھائے جانے کے لیے بڑی کٹھن جنگ لڑتا رہا تھا۔ اسے جلاوطن ہونا پڑا تھا اور فوجی عدالت کی طرف سے بحال رکھی ہوئی سزا کی وجہ سے جیل میں پڑا تھا۔

جن اپوزیشن رہنماؤں سے میں ملی ان میں سے بیشتر مجھ سے بہت خوش اخلاقی اور تلطف سے پیش آئے۔ ان تمام باتوں سے جو میں نے ان سے کہیں انھوں نے اثر قبول کیا لیکن ان میں سے کسی نے مدد کرنے میں زیادہ تردد سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے بیانات بے شک جاری کیے جنھیں برسر اقتدار سیاست دانوں اور جنرلوں نے حقارت سے نظر انداز کر دیا۔

جے یو آئی کے سربراہ مولانا فضل الرحمن، سے میری ملاقات یادگار ثابت ہوئی۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ جوان نکلے۔ میں نے ان کے دفتر میں قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ صحیح قسم کا لباس پہنے ہوئے ہوں اور میرے سر پر دوپٹہ ہے۔ مجھے اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ میں مصطفےٰ کی ناموس ہوں اور کسی مولانا کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہوں۔ وہ انتہائی احترام سے پیش آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں بیان دیں اور مصطفےٰ کے لیے ان سے جو بن پڑے وہ کریں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ مولانا صاحب چاہتے تھے کہ میں ان کے اہلِ خانہ سے ملاقات کروں۔ جب میں ان سے رخصت ہو کر زنان خانے میں جانے لگی تو مولانا نے کہا۔ "آج مصطفےٰ صاحب کو ایسی بیوی کی ضرورت ہے جو ان کا ساتھ دے۔ اگر آپ ان کے لیے مسائل پیدا نہ کریں تو وہ آزمائش کے اس دور کو کہیں زیادہ آسانی سے برداشت کر لیں گے۔" انھوں نے کہا تو یہ سنجیدگی سے اور تاثر یہ دینا چاہا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔

میں اندر پہنچی جہاں ان کی دونوں بیویوں نے میرا استقبال کیا۔ دونوں نے بالکل یکساں لباس پہن رکھے تھے۔ مجھے ان کی زندگیوں کے بارے میں بڑا تجسس تھا۔ ان خواتین کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ مولانا نے وہ طعن آمیز جملہ کیوں کہا تھا۔ میں انھیں بہت ہی آزاد عورت معلوم ہوئی ہوں گی۔ میں اپنے شوہر پر مقدمہ دائر کر چکی تھی۔ میں نے پولیس سے کہا تھا کہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے جائیں۔ میں تین مرتبہ طلاق حاصل کرنے کے لیے درخواست دے چکی تھی۔ میری فوراً سمجھ میں آ گیا کہ عورتوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے۔ انھیں میرے بارے میں بہت کم معلوم تھا۔ ان دونوں خواتین کو، جنھوں نے یکساں لباس پہن رکھے تھے، اگر ویسی زندگی جھیلنی پڑتی جیسی میرے حصے میں آئی تھی تو وہ شاید اپنے میاں کا اس طرح ساتھ نہ دے پاتیں جیسے میں دے رہی تھی۔

نوابزادہ نصر اللہ نے میرے خیالات کی سب سے زیادہ پذیرائی کی اور اپنی بساط سے بڑھ کر مجھے مدد دی۔ ایئر مارشل اصغر خان نے اپنا مافی الضمیر بڑی عمدگی سے بیان کیا

اور بہت دل آویز شخصیت ثابت ہوئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے ایک تحریک چلانے کا منصوبہ تیار کر رہی ہوں۔ ان کا احساس تھا کہ ایسی تحریکوں کو شروع کرنا اور جاری رکھنا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ مجھے ان کی اخلاقی حمایت حاصل رہے گی۔

مجھے زندگی میں جو صبر آزما تجربے ہوئے ہیں ان میں سے ایک منصورہ میں جماعت اسلامی کے امیر سے میری ملاقات ہے۔ اگر یہ ملاقات صبر آزما ثابت ہوئی تو اس میں میاں طفیل کا کوئی قصور نہ تھا۔ میں ان کے سامنے خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ میاں طفیل کی انتہا سے زیادہ رسوائی اور تذلیل کا حکم خود مصطفےٰ کھر نے دیا تھا۔ میاں طفیل کے ساتھ جیل میں وہ سلوک کیا گیا جو صرف چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ان کو پہنچائی جانے والی اذیت اتنی ہولناک تھی کہ اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً ایک عورت کے لیے تو بہت مشکل ہے۔

مصطفےٰ کے علم میں تھا کہ جماعت اسلامی جنرل ضیاء کے بہت قریب ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جنرل ضیاء کو نظریاتی گولا بارود جماعت کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کا ایک اور عنصر یہ امر تھا کہ میاں طفیل جنرل ضیاء کے عزیز بھی تھے۔

میں جانتی تھی کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ جو صاحب میرے سامنے بیٹھے تھے وہ مجھے معاف کر کے خدا رسیدہ ہونے کا ثبوت بھی دے سکتے تھے یا مجھ سے انتقام لے کر اپنی حمیت کو برقرار بھی رکھ سکتے تھے۔ میں ان سے صرف یہی التجا کر سکتی تھی کہ ہمیں معاف کر دیا جائے اور ہمارے لیے کچھ کیا جائے۔ مجھے لگا جیسے کوئی چھچھوری حرکت کر رہی ہوں اور احتیاط سے چنے ہوئے الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت تھوڑی بہت پُر وقار نظر آنے کی جان توڑ کوشش کرتی رہی۔ "میں یہاں مصطفےٰ کی طرف سے آئی ہوں۔ اسے پتہ ہے کہ اس کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں۔ آج اس نے اپنی بیوی کو اپنی ناموس کو آپ کے پاس بھیجا ہے کہ..." میاں طفیل نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ کہنے لگے کہ وہ بات سمجھ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ مصطفےٰ سے کوئی عداوت نہیں رکھتے لیکن انھیں دکھ یہ ہے کہ مصطفےٰ اور اس جیسے لوگ کبھی بدلتے نہیں۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ مصطفےٰ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا ہے۔ وہ ان تمام ناشائستہ حرکات کا اعتراف کرتا ہے جن کا وہ مرتکب ہوا تھا۔

میاں طفیل کا صاحب زادہ بھی وہاں موجود تھا۔ مصطفےٰ نے اس کے والد کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا اس پر وہ اب تک غصے سے کھول رہا تھا۔ "آپ کو تو علم ہی نہیں کہ آپ کے شوہر نے میرے والد صاحب کے ساتھ کیا کیا تھا۔" ایک بار پھر میاں طفیل

نے ہاتھ بلند کیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو تاکید کی کہ وہ خاموش رہے۔ میں ان کی قابل احترام مہمان تھی۔ اس کے بعد میاں طفیل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مصطفےٰ کی زیادتیوں کو معاف فرما دے گا بشرطیکہ اس کے دل میں آنے والی تبدیلی حقیقی ہو۔ "اللہ دلوں کے بھید جانتا ہے۔" میں نے کہا کہ مصطفےٰ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے اور رو رو کر عفو کا طلبگار ہوتا ہے۔ میں نے میاں طفیل سے کہا کہ مصطفےٰ کی مدد فرمائیں۔ انھوں نے نہایت خوش خلقی سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا کریں گے۔

میں نے امیر جماعت سے "تفہیم القرآن" کے سیٹ کی فرمائش کی جو جماعت کے بانی، مولانا مودودی کا عمر بھر کا کام ہے۔ میں نے کتاب کی تعریف کی اور میاں طفیل سے کہا کہ یہ قرآن کی سب سے عمدہ تفسیر ہے۔ وہ مسکرائے۔ میں نے کہا کہ مصطفےٰ اسے پڑھنا چاہتا ہے۔ وہ دوبارہ مسکرائے۔ اس مسکراہٹ میں زہریلا پن نہ تھا۔ ان کے تبسم سے طمانیت جھلکتی تھی۔

انھوں نے بس اتنا کہا۔ "مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی۔" انھوں نے ازراہ کرم گھر کے اندر چلنے کی دعوت دی اور مجھے گھر کی خواتین سے متعارف کرایا۔ وہ سب مجھ سے بہت شفقت سے پیش آئیں، میری بڑی عزت کی۔ میاں طفیل نے مجھے مولانا مودودی کی تفسیر کا ایک سیٹ عنایت کیا۔ میں ان سے رخصت ہوئی۔ ان سے زیادہ مہربان انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی شفقت چہرے سے نمایاں تھی۔ اس وقت بھی جب ان کا حریف ان کے رحم و کرم پر تھا انھوں نے اُسے معاف کرنا ہی احسن سمجھا۔ یہ ان کے خدا رسیدہ ہونے کی دلیل ہے۔

میں "تفہیم" اٹھائے مصطفےٰ سے ملنے پہنچی۔ بعض صحافیوں نے دیکھ لیا کہ میرے ہاتھ میں "تفہیم" ہے۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا تفسیر کی فرمائش مصطفےٰ نے کی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اخبار والے تو ایسی خبروں کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ خبر ان کے لیے سکوپ سے کم نہ تھی۔ مجھے مصطفےٰ کا ایک خط ملا جس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ لکھا تھا کہ میں نے اسے ایسا ضرر پہنچایا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ نجی طور پر وہ خواہ کچھ پڑھے اسے مشتہر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مصطفےٰ نہیں چاہتا تھا کہ اسے ایسے شکست خوردہ انسان کے روپ میں پیش کیا جائے جو اپنے دشمن سے مدد کا طالب ہو۔ اس طرح اس کا امیج خراب ہو جائے گا۔ میرے لیے زیادہ اہم یہ تھا کہ میاں طفیل کو مایوس نہ ہونے دوں۔ وہ یہ خبر پڑھ کر ضرور اسی شفقت بھرے انداز میں مسکرائے ہوں گے جو ان کا خاصہ ہے۔

آزاد کشمیر کا صدر، سردار قیوم، اس طرح معاف کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ میں اس

سے اسلام آباد میں کشمیر ہاؤس جا کر ملی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جنرل ضیاء کا پکا ساتھی ہے۔ ہم نے مجموعی سیاسی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس نے میری پیش گوئی سے اختلاف کیا کہ پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آجائے گی۔ میرے خیال میں اسے زیادہ اختلاف اس بنا پر تھا کہ کسی عورت سے بحث کرنی پڑ رہی ہے۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ مصطفےٰ کھر کی بیوی سے مل کر اسے مایوسی ہوئی۔ اس کی رائے میں میں ضرورت سے زیادہ مغرب زدہ تھی۔ اگرچہ میں نے اپنا سر ڈھک رکھا تھا لیکن میرے خیالات کی چمک کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ سیاسی قیدیوں کی حالتِ زار پر ایک سیمینار کا اہتمام کرنا چاہیے۔ میں نے معراج محمد خاں سے ملاقات کی جو ازراہِ کرم سیمینار میں تقریر کرنے کراچی سے لاہور آئے۔ صدارت نوابزادہ نصر اللہ نے کی۔ سیمینار میں لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور اخباروں نے اسے خاصا اچھالا۔ اس کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہ نکل سکا۔ یہ احساس تو موجود تھا کہ سیاسی قیدیوں کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے لیکن اس احساس کے پیچھے اتنا زور نہ تھا جو حکمرانوں کو باز آجانے پر مجبور کر سکتا۔ جتوئی صاحب جنرل ضیاء سے مسلسل کہتے رہتے تھے کہ مصطفےٰ کو رہا کر دیا جائے۔

کوئی زیادہ ڈرامائی حرکت کرنی ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ این پی پی کے کارکنوں کو بھوک ہڑتالوں کے سلسلے کا آغاز کرنا ہوگا۔ دباؤ ڈالنے کا یہ حربہ بعض دوسرے مقاصد کے ضمن میں کامیاب ثابت ہو چکا تھا۔ ہم نے بندوبست کیا کہ این پی پی کے پچاس کارکن سینیٹ کے سامنے بھوک ہڑتال کریں۔ حکام نے بھوک ہڑتالیوں کے پہلے دستے کو خودکشی کرنے کے الزام میں فی الفور گرفتار کر لیا۔

ہم نے سینیٹ کی طرف مارچ کرنا چاہا جس کا اجلاس جاری تھا۔ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جتنے زیادہ سے زیادہ حفاظتی انتظامات ممکن تھے کیے جا چکے تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر موقع پر موجود تھا تاکہ پوری کارروائی پر نظر رکھی جا سکے۔ کارکن کسی طور سینیٹ تک پہنچ ہی نہ سکتے تھے۔ پولیس نے انھیں آدبوچا اور وہ پولیس سے ہاتھا پائی اور مارشل لا کے خلاف اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ آخر کار پولیس انھیں پکڑ کر لے گئی۔

میں صرف مصطفےٰ کی رہائی کی بات نہ کر سکتی تھی۔ مارشل لائی عدالتوں سے سزا یافتہ ہزاروں قیدیوں کو کسی ایسے فرد کی تلاش تھی جو ان کے لیے آواز بلند کر سکے۔ میں ان سب کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔

میں نے سینیٹر جاوید جبار اور سینیٹر طارق چوہدری سے درخواست کی کہ باہر آکر

ہم سے ملیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہماری بہت مدد کی۔ وہ ہمیں سینیٹ کے اندر لے گئے تاکہ ہم وہاں اپنے نقطۂ نظر کے حق میں رائے ہموار کر سکیں۔ میں جن سینیٹروں سے ملی ان میں سے بیشتر نے ہماری باتوں پر بہت مثبت انداز میں توجہ دی۔ سینیٹر عبدالحمید جتوئی نے ہمارے معاملے میں گہری دلچسپی لی۔ میں نے سینیٹ میں جاکر سیاسی قیدیوں کا مسئلہ اٹھایا اور اچھی بھلی کھلبلی مچا دی۔ میں چودھری شجاعت سے ملی اور اس سے کہا۔ "اگر آپ کی بیوی یہاں ہوتی اور آپ کی جگہ مصطفےٰ گھر ہوتے تو بلاشبہ ان کی طرف سے اس مسئلے کے بارے میں کوئی مثبت جواب ملتا۔" میں وزیر قانون، وسیم سجاد سے ملی اور کہا کہ میری مدد کی جائے۔

بھوک ہڑتالیں جاری رہیں۔ این پی پی کے پچاس کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ ہم نے کوشش کی کہ میڈیا کے ذریعے، جس حد تک ممکن ہو لوگوں کو اس مسئلے کی طرف راغب کیا جائے۔ ہم حکومت کو شرمندہ کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے اپنا کام معمول کے مطابق جاری رکھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بھوک ہڑتال کے لیے ہم نے ایک زیادہ ڈرامائی جگہ کا انتخاب کیا۔ کارکنوں سے کہا گیا کہ وہ اسلام آباد کی فیصل مسجد میں بھوک ہڑتال کریں۔ ہم نے محسوس کیا کہ ایسی حکومت کے کارندے، جو ہر وقت اسلام کی خدمت کی رٹ لگائے رکھتی ہے، شاید بھوک ہڑتالیوں کو گرفتار کرنے کے لیے مسجد کے تقدس کو پامال نہ کریں۔ اگر پولیس نے مسجد میں قدم رکھا تو ہمیں یقین تھا کہ پریس اسے خوب لعن طعن کرے گا اور خبر کا سیکنڈل بنتے دیر نہ لگے گی۔

کارکن مسجد میں جاکر عبادت کرنے لگے۔ پولیس بھی جمع ہو گئی۔ میں نے پولیس والوں سے کہا کہ جب تک کارکن عبادت کر رہے ہیں وہ انھیں گرفتار نہیں کر سکتے۔ پولیس والے ہچکچائے اور انتظار کرنے لگے کہ کارکن کب اپنی عبادت ختم کرتے ہیں۔ کارکنوں نے ایسا نہ کیا۔ عبادت ختم ہونے میں نہ آئی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ فریقین میں کس کا ضبط پہلے جواب دے جائے گا۔ کارکنوں کے پائے ثبات کو ذرا لغزش نہ ہوئی۔ ان کی عبادت نے ختم ہونے کا نام نہ لیا۔ پولیس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ انھوں نے کارروائی شروع کر دی۔ یہ شرمناک حرکت تھی۔ بھوک ہڑتالیوں کو مسجد سے کھینچ کر نکالا گیا اور پولیس انھیں گرفتار کر کے لے گئی۔ ہم نے اس امر کو یقینی بنا دیا کہ پوری قوم سن لے کہ ایک نام نہاد اسلامی حکومت اور اس کی انتظامیہ نے کس طرح مسجد کی حرمت پامال کیا ہے۔

ہم نے بھوک ہڑتالوں کے لیے ایسے مقامات چنے جہاں یا تو لوگوں کا ہر وقت آنا جانا تھا یا جو تقدس کے حامل تھے۔ سینیٹ، صدر کی رہائش گاہ، شاپنگ سنٹرز اور مسجدیں

سب ہماری ہڑتالوں کا مرکز بن گئے۔ دارالحکومت جو بیشتر وقت پر امن اور پُرسکون رہتا ہے یکایک پُرامن احتجاج کا منظر پیش کرنے لگا جس میں سٹیج پر مرکزی مقام مجھے حاصل تھا۔ پولیس کی دخل اندازی پر ناراض ہو کر بعض اوقات ہجوم ایسا ردعمل ظاہر کرتا جو بھڑک کر کوئی بھی صورت اختیار کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفےٰ کے دو بیٹوں، عبدالرحمن اور بلال، کو بھی بھوک ہڑتال کرنی چاہیے۔ وقت آگیا تھا کہ قائد کے اپنے گھر والے بھی قربانیاں دیں۔ میں اس بات پر ناخوش تھی کہ صرف غریب کارکن خود کو گرفتاریوں کے لیے پیش کر رہے تھے۔ قیادت نے ہدایات دینے اور مذمت کرنے کو کافی سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے میرے دلائل مان لیے اور دلیرانہ انداز میں اپنے والد کے حق میں آواز بلند کرنے میدان میں اتر آئے۔ انھیں سینیٹ کے باہر سے گرفتار کر لیا گیا۔

عین اس وقت جتوئی صاحب نے ایسا قدم اٹھایا کہ ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ این پی پی کو اسلامی جمہوری اتحاد کا حصہ بنا دیا گیا۔ یہ ایک انتخابی اتحاد تھا جس کا مقصد پی پی پی کا مقابلہ کرنا تھا۔ ہم ایک ایسے نظام کے خلاف لڑ رہے تھے جس میں اب خود ہماری سیاسی جماعت شامل ہو چکی تھی۔

اس مرحلے پر میں نے مصطفےٰ کے سامنے تجویز رکھی کہ میں تامرگ بھوک ہڑتال کرتی ہوں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میری ہڑتال میں قوم اور بین الاقوامی میڈیا کو اپنی دلچسپی کا سامان نظر آئے گا اور ہم اس کی توجہ سیاسی قیدیوں کے کاز پر مرکوز کر سکیں گے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ حکومت مجھے بھوکوں نہیں مرنے دی گی اور شاید دباؤ میں آکر قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

سچ کی بات یہ ہے کہ مصطفےٰ کو اور مجھے معلوم تھا کہ میرے والد مجھے اس طرح گھل گھل کر مر جانے سے بچانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ فوج میں ان کے متعدد دوست، مثلاً جنرل جیلانی، جنرل عارف اور جنرل فضل حق، اہم عہدوں پر فائز تھے۔ سینیٹ کا چیئرمین، غلام اسحاق خاں، بھی ان کا دوست تھا۔ میرے بھوک ہڑتال کرنے سے شاید اس بند گلی میں کوئی راستہ نکل آئے۔

پی پی پی بھی، جو سیاسی قیدیوں کے مسئلے پر اپنے سکوت پر شرمسار تھی، سرگرم عمل ہو گئی۔ اس نے ایک احتجاجی مارچ کا اعلان کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مارچ کی قیادت میں کروں گی۔ ہم ایک ہی پلیٹ فارم پر تھے۔ اس مسئلے پر ہمارے مابین اتحاد ضروری تھا۔

میری بھوک ہڑتال کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ ہم نے اس کا پکا بندوبست کیا کہ جب آخر کار مجھے جیل لایا جائے تو ڈاکٹروں کی ایک ٹیم میری دیکھ بھال کے لیے

موجود ہو۔ مصطفیٰ نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر سلطان کو جو اڈیالا جیل سے منسلک تھے، ٹیم میں رکھا جائے۔ ہڑتال شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر سلطان مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے میرے سامنے ایک بھیانک تصویر کھینچی۔ "چوبیس گھنٹے کے اندر اندر آپ کو تناؤ محسوس ہونے لگے گا۔ آپ مریں گی تو نہیں لیکن ممکن ہے آپ کے اعضائے رئیسہ کو گزند پہنچے۔ مثال کے طور پر آپ کے گردے کام کرنا چھوڑ سکتے ہیں۔ ہڑتال کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ کے دماغ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آپ پر گہری بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ ہم آپ کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔" میں بہت خوف زدہ ہوئی لیکن تہیہ کر چکی تھی کہ پیچھے نہیں ہٹوں گی۔

جب ہم اس بھوک ہڑتال کی آخری جزئیات کی نوک پلک سنوار رہے تھے تو تقدیر نے اڑنگا لگایا۔ جنرل ضیاء جو گیارہ سال سے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔ اس کا طیارہ فضا میں پھٹ گیا تھا۔ اس طیارے پر ایسے لوگ بھی سوار تھے جن کو میں جانتی تھی، جن سے مل چکی تھی۔ لیکن اس امید کے زیرِ اثر کہ اب سیاسی قیدیوں اور میرے شوہر کے رہا ہونے کا وقت آپہنچا ہے میں پیش آنے والے انسانی المیے کو بھول گئی۔

ڈاکٹر سلطان نے فون پر مجھے مصطفیٰ کا پیغام پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ مصطفیٰ کے خیال میں صورت حال بہت سیمابی ہے اور کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ "اس مرحلے پر ہمیں فوج کو طیش دلانے والی کوئی حرکت نہ کرنی چاہیے۔ ہمارے حق میں سب سے بہتر یہی ہے کہ دیکھتے رہیں، ہوتا کیا ہے۔" مارشل لا کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ مجھے ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے والی دو شخصیتوں، جنرل اختر عبدالرحمٰن اور بریگیڈیر خورشید کا خیال آیا۔ میں مصطفیٰ کو رہا کرانے کی مہم کے دوران ان دونوں سے مل چکی تھی۔

میں نسیم لہر سے بھی ملی تھی، جو جونیجو کی کابینہ میں وزیر داخلہ تھا، اور اس سے کہا تھا کہ مصطفیٰ کی رہائی کے کیس کا کچھ کریں۔ ممتاز تارڑ نے بہت مدد کی۔ وہ قومی اسمبلی کا رکن تھا اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے زور دے رہا تھا۔ وہ اس بارے میں اسمبلی میں ایک قرار داد منظور کرانے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔

میں جتنے زیادہ ارکان پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر بیٹھی اپوزیشن کی شخصیات سے ملی مجھے اتنا ہی زیادہ یقین آتا گیا کہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کی اتنی حیثیت ہی نہ تھی کہ کچھ مدد کر سکتے۔ اہم فیصلے کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا۔

صدر اور اس کے حلقۂ انتخاب یعنی فوج کے علاوہ کسی سے کوئی امید رکھنا بیکار تھا۔

وہی درحقیقت ملک کے حکمران تھے۔ پارلیمنٹ تو محض دکھاوا تھی۔ صرف فوج اور صدر کو علم تھا کہ ملک کے مستقبل کے لیے کیا بلیو پرنٹ تیار کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنا کھیل جاری رکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا سیاسی قیدیوں کی رہائی اس کا حصہ نہ تھی۔ ہر کام ان کے اشارے پر موقوف تھا۔ میری سمجھ میں آگیا کہ مجھے فوج میں نفوذ کر کے جنرلوں سے بات کرنی پڑے گی۔ مصطفیٰ کو میری بات سے اتفاق تھا ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کچھ لو کچھ دو کی پالیسی اپنا کر فوج کا دل جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں مصطفیٰ کے پرانے ساتھی، میر افضل خاں سے ملی تاکہ وہ فوج کے جنرلوں تک پہنچنے میں میری مدد کریں۔ میر افضل مصطفیٰ کے بارے میں جنرل ضیاء سے بات کر چکے تھے لیکن انھوں نے دیکھا کہ جنرل ضیاء کو اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میرا پہلا رابطہ جنرل اختر عبدالرحمٰن سے ہونا تھا جو اس وقت چیئرمین آف دی جوائنٹ چیفز آف سٹاف اور جنرل ضیاء کا دست راست تھا۔ میں نے فون کیا اور اس سے ملاقات کا وقت طے کر لیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میں اسلام آباد میں ہولیڈے ان کی لابی میں خورشید نامی کسی بریگیڈیر سے ملوں۔ اس کے بعد وہ مجھے جنرل صاحب سے ملانے کا بندوبست کرے گا۔

میں جنرل سے اس کی قیام گاہ پر ملی۔ ہماری ملاقات، جو ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی، بڑی ٹیڑھی ثابت ہوئی۔ جنرلوں اور ان کی حکومت سے تنفر میرے رگ و پے میں سما چکا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ گفت و شنید کرنے کا خیال ہی ناگوار تھا۔ مجھے اس بات پر بڑی خفت محسوس ہو رہی تھی کہ ہاتھ میں کشکول لیے میز پر ان کے سامنے بیٹھی ہوں اور ظاہر یہ کر رہی ہوں کہ بھیک مانگنے نہیں آئی۔ علاوہ ازیں مصطفیٰ کی رہائی کے بدلے میں دینے کے لیے پاس کچھ ایسا زیادہ تھا بھی نہیں۔ مجھے اندازہ لگانا تھا کہ انھیں مصطفیٰ سے کتنی دلچسپی ہے۔ بظاہر انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شاید یہ بے اعتنائی اداکاری ہو۔ میں اپنی بات پر قائم رہی۔ انھیں معلوم تھا کہ ضیاء حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں مصطفیٰ ملوث تھا۔ بیشتر تفصیلات ان کے پاس موجود تھیں۔

مصطفیٰ نے مجھے سکھا پڑھا کر بھیجا تھا۔ میں نے انھیں اس بات کا قائل کرنا چاہا کہ مصطفیٰ کو احساس ہے کہ سیاسی عمل میں فوج کی شمولیت ناگزیر ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ اقتدار میں فوج کو حصہ ملنا چاہیے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ترکی میں حکومت کا جو بندوبست کیا گیا ہے بہترین ہے اور اسے ہمارے ملک میں رواج دینا چاہیے۔

اختر عبدالرحمٰن نے میری بات کاٹ دی۔ کہنے لگا کہ بھٹو صاحب نے جنرل گل

حسن کے ساتھ اسی قسم کا معاہدہ کیا تھا۔ سویلین حکومت اس معاہدے سے مکر گئی تھی۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ اسی طرح کا واقعہ دوبارہ پیش نہیں آئے گا؟ میں نے جنرل کو بتایا کہ مصطفےٰ بھٹو نہیں۔ وہ بھٹو صاحب کے بہت سے خیالات کا مخالف ہے۔ اس نے اپنے قائد کی مخالفت کی تھی۔ وہ بھی کھلم کھلا۔ میں نے جنرل سے وعدہ کیا کہ مصطفےٰ جو بھی، جیسا بھی عہد کرے گا اس پر قائم رہے گا۔

اس کے بعد میں نے پیپلز پارٹی اور درپیش سیاسی منظر نامے کے بارے میں تقریر کی جس کی میں اچھی طرح تیاری کر کے آئی تھی۔ مصطفےٰ نے کہا تھا کہ فوج پیپلز پارٹی سے خائف ہے۔ اس حوالے سے انہیں ڈرا کر اپنا کام نکالنا چاہیے۔ میں نے جنرل کو بتایا کہ مستقبل کے کسی بھی الیکشن میں پیپلز پارٹی کی جیت یقینی ہے۔ پنجاب اس کے سامنے بے دست وپا ہے۔ میاں نواز شریف عوام کا آدمی نہیں۔ وہ پی پی پی کے ریلے کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ لوگ پھر بھٹو صاحب کے لیے ووٹ ڈالیں گے۔ بھٹو کی افسانوی شخصیت میں دوبارہ جان پڑ جائے گی۔ فوج کو انتقام کا نشانہ بنایا جائے گا۔ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ انہیں جنرل ضیاء کی حمایت کرنے والی طاقتوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع کب ملتا ہے۔ اس مرحلے پر فوج کو ایک درمیانی طاقت کی ضرورت ہے جو بیچ میں آ کر فوج اور عوام کو آپس میں ٹکرانے نہ دے۔ کوئی ایسا شخص درکار ہے جو ریلے کے سامنے ڈٹا رہے اور طوفان کا منہ پھیر دے۔ فوج کے لیے یہ کردار صرف ایک ہی آدمی ادا کرسکتا ہے۔ وہ آدمی جس کی جڑیں پنجاب کے عوام میں ہیں۔ ایسا سیاست دان جو اقتدار کی سیاست کے حقائق کو سمجھتا ہے۔ یہ آدمی مصطفےٰ کھر ہے۔ جنرل نے مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی اور یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ میں فوج والوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔

جنرل اختر عبدالرحمن ضیاء کے بڑے کٹر حامیوں میں تھا۔ جب میں نے اسے جنرل ضیاء کہا تو اس نے معاً میری تصحیح کی۔ "صدر ضیاء"

ہماری ملاقاتیں جاری رہیں۔ میں ہر ملاقات کے بعد مصطفےٰ کے پاس جاتی، ملاقات میں ہونے والی باتوں پر تبادلۂ خیال کرتی اور تازہ ہدایات اور تجاویز لے کر لوٹتی۔ میں اختر عبدالرحمن سے پانچ بار ملی۔ ہر بار ملاقات کا انتظام بریگیڈیر خورشید نے کیا مجھے محسوس ہوا کہ میں بات آگے بڑھانے میں کامیاب رہی ہوں۔ اب زیادہ باتیں جنرل خود کرتا۔ پہلے وہ میری باتیں سنتا رہا۔ اب وہ گفتگو کرنے پر زیادہ مائل نظر آنے لگا۔ ہمارے مابین دلچسپ ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ جنرل رحمن اب کسی درمیانی راستے کی تلاش میں تھا۔ ہمیں درپیش بے ڈھب مسئلے کا کوئی حل نکالنا چاہتا تھا۔ مجھے وہ دوسروں کا

خیال رکھنے والا حساس طبع انسان معلوم ہوا۔

جنرل سے چوتھی بار ملاقات اس وقت ہوئی جب جنرل ضیاء جونیجو حکومت کو برطرف کر کے اسمبلیاں توڑ چکا تھا۔ میں نے بتایا کہ مصطفےٰ نے صورتِ حال کا کیا اندازہ لگایا ہے۔ مصطفےٰ کے خیال میں صدر کی اس کارروائی سے مسئلہ حل نہ ہو سکا تھا۔ ایک خلا وجود میں آگیا تھا۔ ایسے ادارے تشکیل نہیں دیے گئے تھے جو اسمبلیوں کی جگہ لے سکیں۔ نگران حکومت غیر مؤثر ثابت ہوگی۔ پرانے چہرے اپنی ساکھ کھو چکے تھے اور اقتدار کا جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پر کرنے کے لیے پی پی پی آگے آجائے گی۔ اس نے تجویز کیا کہ اب اپنے اقدام کا وقت آگیا ہے۔ جن کے ذریعے اسے پی پی پی کا مقابلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ 1990ء میں آخر کار فوج اس پر رضامند ہو گئی۔

ہم جنرل اختر کی قیام گاہ پر ملے اور میں نے اس کے اور بیگم اختر کے ساتھ چائے پی۔ اس ملاقات میں جنرل بہت پُر امید نظر آیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ جنرل ضیاء سے مصطفےٰ کے بارے میں بات کرے گا۔ وہ اس بات کا کم و بیش قائل ہو چکا تھا کہ فوج کے خفیہ اتحادی کے طور پر مصطفےٰ مؤثر کردار ادا کر سکے گا۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوا۔ گفت و شنید کے دوران خاصے سخت مقام آئے تھے اور میں جنرل کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ایک ہفتے بعد بہاولپور کے پاس، ایک سی130 طیارہ پُر اسرار طور پر فضا میں پھٹ گیا۔ اختر عبدالرحمن اس طیارے پر سوار تھا۔ بریگیڈیر خورشید بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں جہاں سے چلی تھی ہر پھر کر وہیں واپس پہنچ گئی۔

میں شوکت گورایا سے ملی جس کے فوج کے اعلیٰ افسروں سے مراسم تھے۔ ڈاکٹر محمد حسین سے بھی کہا گیا کہ وہ مدد کرے۔ وہ آئی ایس آئی کے سربراہ، جنرل حمید گل کو جانتا تھا۔ اس کے ذریعے جنرل تک پیغام پہنچایا گیا۔

میں نے آئی ایس آئی سے رابطہ قائم کر کے بریگیڈیر امتیاز سے بات کی۔ میں نے کہا کہ میں جنرل حمید گل سے ملنا چاہتی ہوں۔ بریگیڈیر امتیاز نے کہا کہ جنرل کے بجائے وہ خود مجھ سے ملے گا۔ آئی ایس آئی کے دفتر میں میری اور اس کی ایک انتہائی طویل ملاقات ہوئی جو صبح گیارہ بجے سے سہ پہر چار بجے تک جاری رہی۔ بیچارہ ساجد جو میرے ساتھ تھا باہر بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ مجھ پر بڑے تسلسل سے اور جارحانہ انداز میں جرح کی گئی۔ بریگیڈیر امتیاز قائل نہ ہو سکا۔ اسے پتہ تھا کہ مصطفےٰ بھارتیوں کے ساتھ مل کر سازش کرتا رہا تھا۔ آئی ایس آئی کے پاس مصطفےٰ کے بارے میں خاصی ضخیم فائل موجود تھی۔ میں نے مصطفےٰ کو ایک مختلف قسم کا محب الوطن بنا کر پیش کرنا چاہا۔

بریگیڈیر امتیاز کی نظر میں وہ غدار تھا۔ میں نے مصطفےٰ کی افادیت کی وضاحت کرنی چاہی اور بتانے کی کوشش کی کہ وہ ان کے بڑے کام آئے گا لیکن بریگیڈیر کو مصطفےٰ کی نیک نیتی پر شک تھا۔ میں نے بریگیڈیر سے جنرل اختر عبدالرحمن سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ وہ یہ بات سن کر خاصا متحیر ہوا آئی ایس آئی کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اس نے مجھ سے ان ملاقاتوں کے بارے میں بہت سے سوال کیے۔ اسے زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ میں جنرل سے کہاں، کب اور کیسے ملی تھی۔ میں نے اسے بتایا۔ وہ قائل ہو گیا۔

بریگیڈیر سے میری متعدد بار ملاقات ہوئی۔ میں نے جنرل حمید گل تک پہنچنے کی کوشش کی۔ خاموشی چھائی رہی جو اچھا شگون نہ تھا۔ نسیم آہیر نے اپنے دفتر میں مجھے بتایا تھا کہ مصطفےٰ کو کبھی رہا نہیں کیا جائے گا۔ کم از کم جب تک ضیاء موجود ہے اس کے رہا ہونے کی امید نہیں۔ میں نے جونیجو سے ٹیلی فون پر بات کی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سپیکر ناصر حامد چٹھہ سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن وہ بھی کچھ نہ کر سکا۔ میں جنرل جیلانی اور جنرل فضل حق سے ملی جنہوں نے کہا کہ وہ مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔ حقیقت میں ان ملاقاتوں سے کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے نہ آیا۔ مصطفےٰ کے کیس میں کوئی امید نہ رہی تھی۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، کیا نہ کریں۔ میں نے پیر پگارا سے بات کی اور کہا کہ مصطفےٰ کی مدد کی جائے۔ پیر پگارا نے جواب دیا۔ "مصطفےٰ غدار ہے۔ میں ایسے آدمی کی مدد نہیں کر سکتا جس نے میرے ملک سے غداری کی ہو۔"

انتخابات کا اعلان ہوا۔ جتوئی صاحب آئی جے آئی میں شامل ہو چکے تھے۔ مصطفےٰ سے بھی کہا گیا کہ وہ چاہے تو آئی جے آئی میں شامل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ہامی بھر لیتا تو اسے فوراً رہا کر دیا جاتا۔ مصطفےٰ قید سے باہر آکر انتخابات لڑنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہ ہر قیمت پر، خواہ وہ کتنی ہی بھاری ہو رہائی حاصل کرنے کو تیار تھا۔ میں نے اختلاف کیا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ آئی جے آئی میں شامل ہو کر مصطفےٰ ان تمام باتوں کو جھٹلا دے گا جن کا وہ اب تک علم بردار چلا آرہا تھا۔ اس فیصلے سے مارشل لا کے خلاف اس کی کشمکش اور جمہوریت کے لیے اس کی جدوجہد، سب کی نفی ہو جائے گی۔ جو سال اس نے جلاوطنی میں گزارے تھے ان کے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ مارشل لا کی باقیات میں شامل ہو کر وہ جمہوریت کے کاز سے بے وفائی کرے گا۔ آئی جے آئی کا سربراہ میاں نواز شریف تھے جسے کھر بالشتیا سمجھتا تھا۔ یہ ایک ذلت آمیز فیصلہ ہو گا۔

میرے نزدیک قابل ترجیح یہ تھا کہ میرا شوہر اصولوں کی خاطر زندان میں رہے نہ کہ بکاؤ مال بن کر آزادی حاصل کرے اور اقتدار میں آجائے۔ مصطفےٰ نے اندازہ لگایا کہ

اس کے اختیار میں کیا کیا ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے میں جیل سے باہر آسکتا تھا یا بیوی کو زندگی بھر کے لیے اپنی بنا سکتا تھا۔ اس نے جو فیصلہ کیا اس کا مقصد مجھے مرعوب کرنا تھا۔ جتوئی صاحب کی پیشکش ٹھکرادی گئی۔ وہ اکیلا ہی میدان میں اترے گا۔ "تمہاری استقامت نے مجھے یہ فیصلہ کرنے کا موقع دیا۔ یہ فیصلہ کر کے میں خوش ہوں۔ چور راستوں سے اقتدار تک پہنچنا باعث ننگ ہے۔"

جب میں اس کے ساتھ نہ تھی تو مصطفےٰ نے اقتدار تک پہنچنے کے لیے انہیں چور راستوں سے کام لیا۔ ان حرکتوں کی وجہ سے پوری قوم کے سامنے رسوا ہوا۔

ملاقاتیوں کی پوری فوج مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ وہ سب مجھے قائل کرنا چاہتے تھے کہ میں کسی طرح مصطفےٰ کو آئی جے آئی میں شامل ہونے پر آمادہ کر لوں۔ ان آنے والوں میں اقبال لکا بھی تھا جو مصطفےٰ کی گورنری کے دنوں میں مصطفےٰ کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ اگر مصطفےٰ آئی جے آئی میں شامل نہ ہوا تو کبھی جیل خانے سے باہر نہ آسکے گا۔ "مصطفےٰ صاحب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیل میں سڑتے رہیں گے۔"

اس وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ بہت سے لوگوں کو یہ حقیقت تسلیم ہے کہ میں مصطفےٰ پر اثر انداز ہوتی ہوں۔ جتوئی صاحب تک کا یہی خیال تھا۔ پرانی افواہوں نے دوبارہ سر ابھارا۔ کہا جانے لگا کہ میں اپنے شوہر کی آزادی کی خواہاں ہی نہیں۔ اگر وہ آزاد ہو گیا تو میری پہلی سی اہمیت نہ رہے گی۔ سمجھا جارہا تھا کہ میں آپ قائد بننے کی متمنی ہوں۔ قیادت کا شرف مجھے مصطفےٰ کی موت کے بعد ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مصطفےٰ مر جائے۔ اسے میری خوش قسمتی گردانیے کہ بہت کم لوگوں نے ان افواہوں پر کان دھرا اور مصطفےٰ نے تو سب سے کم توجہ دی۔ وہ مجھے بخوبی جانتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مصطفےٰ کو لاہور میں میاں نواز شریف سے ٹکر لینی چاہیے۔ اسے قید میں رہتے ہوئے وزیراعلیٰ وقت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کی نیابت کرتے ہوئے انتخابی مہم بھی چلاؤں گی اور انتخاب بھی لڑوں گی۔ مصطفےٰ نے انتخاب لڑنے کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کی بہت پذیرائی ہوئی۔ وہ پنجاب کے بہادر شیر کے روپ میں سامنے آیا جو سلاخوں کے پیچھے سے دہاڑ رہا تھا۔

اہم کام یہ تھا کہ ہم لاہور میں اپنی طاقت کا اندازہ لگائیں۔ میں نے واپس آکر اپنی پارٹی کے رہنماؤں سے بہت سی ملاقاتیں کیں جو بہت خوش تھے کہ کھر صاحب آئی جے آئی میں شامل نہیں ہوئے۔ بہت سے کارکن محسوس کرتے تھے کہ ہمیں پی پی پی کے ساتھ اتحاد کر لینا چاہیے۔ بعض کی رائے تھی کہ اتحاد قائم کرنے کے لیے جونیجو سے رابطہ کیا جائے۔

چودھری حنیف نے ہمارے پہلے انتخابی اتحاد کا انتظام کیا۔ یہ اتحاد ایک سنی گروپ کے ساتھ تھا۔ اگلے دن مصطفےٰ نے اخبار دیکھے تو وہ دہل گیا۔ میرے ساتھ جنرل ٹائیگر نیازی بیٹھا تھا جس نے بطور فوجی ڈھاکے میں بھارتیوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر قومی سطح پر خواری کمائی تھی۔ میں پہلے کبھی اس سے نہ ملی تھی۔ میرے لیے وہ گروپ فوٹو میں بس ایک چہرہ تھا۔ یہ ایسی فاش غلطی تھی جسے ہمالیائی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مصطفےٰ بھنا کر رہ گیا۔

اس نقصان کی تلافی کے طور پر ہم نے طاقتور شیعہ پریشر گروپ "تحریکِ نفاذ فقہ جعفریہ" سے انتخابی اتحاد قائم کر لیا۔

ضرورت اس کی تھی کہ ہم کسی مضبوط سیاسی پارٹی سے متعلق ہوں۔ مصطفےٰ نے مجھ سے کہا کہ بے نظیر سے بات کی جائے۔ میں ایک بار پہلے بے نظیر سے بات کر چکی تھی اور اس نے کہا تھا۔ "لوگوں نے میرے اور انکل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا تھا۔" بے نظیر نے غلام غازی کھر کی وفات ہمیں تعزیت کا تار بھجوایا تھا اور میں نے تار کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے فون کیا تھا۔

میں نے پیار علی الانا سے بات کی اور اس کے ساتھ مذاکرات کا دور شروع کیا پیار علی نے بے نظیر سے مشورہ کیا۔ وہ یہ جواب لے کر میرے پاس آیا۔ "میرا خیال ہے ہمیں کھر صاحب کے رہا ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

صاف ظاہر تھا کہ مصطفےٰ کی رہائی فوج کی مرضی پر موقوف تھی۔ پی پی پی اسے اپنی صفوں میں شامل کرنے سے گھبراتی تھی۔ پیپلز پارٹی والوں کو یقین نہ تھا کہ اسے رہا کر دیا جائے گا۔ وہ کسی ایسے شخص کو ساتھ ملانا چاہتے تھے جس کی فوج مخالف ہو۔

مصطفےٰ کے مقدمے کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ مصطفےٰ کے وکیل، ایس ایم ظفر، جتوئی صاحب کے ساتھ آئی جے آئی میں شامل ہو چکے تھے۔ انتخابات میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ میں نے اعتزاز احسن کو فون کیا۔ اعتزاز مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آتا رہا تھا۔ ایک بار میں کسی قانونی معاملے پر اپنے کچھ ٹائپ شدہ کاغذات لے کر اس کی پاس گئی تھی۔ اعتزاز نے میری مدد کی تھی اور بعض چیزیں خود ٹائپ کر دی تھیں۔ میں نے اسے اسلام آباد بلا کر اس امکان پر تبادلۂ خیال کیا کہ کیا ایس ایم ظفر کے سیاسی رجحانات اور ہمارے مفادات آپس میں ٹکرا سکتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آئی جے آئی شاید ایس ایم ظفر پر اثر انداز ہوتا کہ مصطفےٰ کا مقدمہ طول کھینچے اور یوں انتخابی مہم کے دوران اس کی موجودگی خارج از امکان ہو جائے۔ اس مقصد کو بے اثر بنانے کے لیے اعتزاز نے چند بیش بہا مشورے دیے۔ جب میں رخصت ہونے لگی تو اس نے کہا۔"

تہمینہ، یہ میں تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔ تمہارے شوہر کے لیے میں یہ سب کچھ کرنے سے رہا۔"

مصطفےٰ کو میری صورت میں ایک ایسی سفیر مل گئی تھی جس نے اسے دشمنی کا نشانہ بننے سے بچائے رکھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ جو کچھ میں کر رہی تھی اسے تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ میرے ساتھ پریس کا رویہ، مدیروں سے رپورٹروں تک، انتہائی ہمدردانہ رہا۔ انھوں نے ایسے وقت میں، جو فیصلہ کن تھا، میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے خیال میں اپنے شوہر کی رہائی کے لیے جدوجہد کرنے والی بیوی کا جو کردار میں ادا کر رہی تھی وہ لوگوں کو بھلا لگتا تھا۔ بار بار قلابازیاں کھاتے رہنے سے میں خاصی نزاع انگیز شخصیت بن چکی تھی۔ پریس ہر وقت میرے کندھے پر سے جھانک جھانک کر میری اگلی چال کے پہلے سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ مصطفےٰ کی رہائی کے لیے چلائی جانے والی مہم کے دوران مجھے صحافیوں کی ایک نئی نسل سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، جوان اور اپنے پیشے سے پوری طرح وابستہ تھے۔ وہ ضمیر نیازی کے یادگار لفظوں میں "ٹائپ رائٹر چھاپہ مار" تھے۔ یہ الگ بات کہ اب ان میں سے بہت سے ورڈ پروسیسروں پر کام کرتے تھے۔

میں مجید نظامی صاحب سے ملتی رہی اور جونیجو حکومت کی برطرفی کے مصطفےٰ کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس پہنچی۔ یہ پیغام کیوں بھجوایا گیا تھا، اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ مصطفےٰ نے نظامی صاحب سے پوچھا تھا کہ کیا مسلم لیگ میں شامل ہونا میرے مستقبل کے لیے ٹھیک اور پاکستان کے مفاد میں ہوگا؟ یہ فیصلہ میں نظامی صاحب پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے مصطفےٰ سے دریافت کیا کہ نظامی صاحب اس کی سیاسی آئیڈیالوجی اور آئندہ کے لائحہ عمل کا تعین کیسے کر سکتے ہیں؟ مصطفےٰ نے صرف اتنا کہا۔ "یہ ضروری ہے۔" میں نے یہ پیغام "نوائے وقت" کے مدیر کو ان کے دفتر جا کر پہنچا دیا۔ میں ایسا کرتے ہوئے جھینپی بھی اور کچھ بے عقل بھی دکھائی دی۔ نظامی صاحب پیغام سن کر بظاہر الجھن میں پڑ گئے۔ انھوں نے کہا۔ "یہ فیصلہ کرنا مصطفےٰ صاحب کا کام ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

میں "دی نیشن" کے مدیر، عارف نظامی، اور "جنگ" کے نوجوان شکیل الرحمن سے زبردست ذہنی ربط ضبط قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ چاہے میں مصطفےٰ کی خاطر لڑائی میں مشغول ہوتی یا اس سے قطع تعلق پر تل جاتی، وہ مجھ سے ہر صورت بڑے اخلاص سے پیش آتے۔ وہ میرے مستقل نوعیت کے الٹ پلٹ مسائل میں ذاتی سطح پر دلچسپی

لیتے۔ مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ پریس نے مجھے لتاڑا ہے۔ میڈیا میں میرے حق میں ایک نرمی تھی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ وہ میرے حالِ زار سے واقف ہیں اور اس لیے ان کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ "فرنٹیر پوسٹ" کے مدیر اور مالک، رحمت شاہ آفریدی، کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مجھے جتنی بار بھی ان کے اخبار سے واسطہ پڑا انھوں نے میرے ساتھ انتہا کا تعاون کیا۔

آخرش مجھے جنرل حمید گل کی خدمت میں باریابی کا اذن مل گیا۔ میں اس سے ملنے اسلام آباد پہنچی۔ جب بریگیڈیر امتیاز مجھے کار میں بٹھا کر ملانے لے جارہا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ میری امریکی قونصل جنرل سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ امریکی پی پی پی کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ سن کر بریگیڈیر کے ہوش اڑ گئے۔ مجھ سے کہنے لگا کہ جنرل حمید گل کو یہ بات ضرور بتائی جائے۔ میں اس طاقتور اور پُر اسرار شخصیت سے ملنے پہنچی۔ اس وقت تک حالت یہ ہو چکی تھی کہ میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ مجھے پانچ انتخابی مہمیں چلانی تھیں۔ ان میں سب سے سخت مہم لاہور کی تھی۔ مصطفےٰ کے اپنے علاقے میں بھی انتخابات میں کامیابی کوئی آسان نہ تھی۔ اس کے اپنے بھائی مقابلے میں کھڑے تھے اور انھیں برسرِ اقتدار گروہوں کی تائید حاصل تھی۔ میں مصطفےٰ کی نامزدگی کے کاغذات جمع کرا چکی تھی اور مظفر گڑھ کے عوام نے پُر زور انداز میں میری حمایت کی تھی۔ لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ مصطفےٰ آزاد ہو۔ میرے کندھوں پر یہ بہت بڑی ذمے داری آ پڑی تھی اور دشمن بھی بہت تھے۔ جس آدمی سے میں ملنے گئی تھی وہ میری آخری امید تھا۔ میں بولتی رہی۔ وہ سنتا رہا۔ میں نے اس کے بارے میں اندازہ قائم کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ یہ ایک مشکل ملاقات تھی۔

میں نے جنرل حمید گل سے کہا کہ وہ مصطفےٰ سے مل کر تو دیکھے۔ ایک بار ہی مل لے۔ میں اس کی پوری طرح قائل تھی کہ مصطفےٰ میں دوسروں سے اپنی بات منوانے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ غضب کا چرب زبان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ محض چکنی چپڑی باتیں بنا کر جیل سے باہر آسکتا ہے لیکن لازم تھا کہ اسے خود گفتگو کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے جنرل سے التجا کی آخر کار اس نے آمادگی ظاہر کر دی۔

ضروری تھا کہ ملاقات کو خفیہ رکھا جائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ہم نے طے کیا کہ اس رات بارہ بجے الگ الگ اڈیالا جیل پہنچ جائیں گے۔ بریگیڈیر امتیاز نے مجھے پک کیا۔ اس رات ہم جیل کے ویٹنگ روم میں ملے۔ مصطفےٰ کو علم نہ تھا کہ ہم آنے والے ہیں۔ ملاقات انتہائی مایوس کن ثابت ہوئی۔ میں بیٹھی یہی سوچتی رہی کہ چلو بھئی، مصطفےٰ! اب لازم ہے کہ جو بات تم کرو وہ نشانے پہ جا لگے۔ ضروری ہے کہ ایسی

سخن سازی کرو کہ وہ تمھیں رہا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ ایسا موقع تمھیں پھر نہ ملے گا۔ اسے آخری موقع سمجھو۔

مصطفےٰ مجھے بہت ہی ہیچمدان معلوم ہوا۔ اس نے کوئی کام کی بات نہ کی۔ جانے کیوں وہ جعلی آدمی نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص اس کے دلی رازوں سے واقف ہے۔ وہ جھینپا جھینپا دکھائی دیا۔ پہلی بار اسے کسی کے رعب میں آتے دیکھا۔ جنرل سحر انگیز شخصیت کا مالک اور تر زبان تھا۔ وہ راست گو دو ٹوک بات کرنے والا، کھرا اور گہرا تھا۔ اس نے شاید ہی کوئی بات کی ہو۔ سنتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا قدرت نے اسے بنایا ہی قیادت کے لیے ہے۔ شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شخص ہمارے درمیان موجود ہے۔

مصطفےٰ کی باتیں سطحی تھیں۔ مجھے مایوسی ہوئی اور میں بے یقینی کا شکار ہو گئی۔ یہی دعا مانگتی رہی کہ مصطفےٰ کی سطحیت جنرل کے مشاہدے میں نہ آئے لیکن مجھے ڈر تھا کہ آئی ایس آئی کے چیف کو ایسی چیزوں کا نوٹس لینے کی تربیت تو ضرور ملی ہو گی۔ میں نے اپنے شوہر، اپنے قائد کو ڈھیر ہوتے دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک دیوزاد شخصیت کی ترکی تمام ہوتے ملاحظہ کی۔ میں نے کبھی مصطفےٰ کو اس طرح اردب میں آتے نہ دیکھا تھا۔ شاید یہ سب کچھ جنرل کی زبردست شخصیت کی وجہ سے ہوا۔

جب وہ رخصت ہونے لگے تو بریگیڈیر نے مڑ کر مصطفےٰ سے کہا۔ "آپ کو تہمینہ سے بہتر سفیر کوئی نہیں مل سکتا۔" مصطفےٰ کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے رو کر کہا۔ "تہمینہ کے بغیر میں کہیں کا نہ رہتا۔"

مصطفےٰ نے کہا۔ "اگر میں نے کبھی اپنی خود سوانح لکھی تو میں اقرار کروں گا کہ تم میری سب سے دانش مند سیاسی مشیر تھیں۔"

اگلے دن مارشل لا کے تمام قیدیوں کو رہا کر دینے کے فیصلے کو عدالت نے برقرار رکھا۔ آخر کار مصطفےٰ کے رہا ہونے کا وقت آپہنچا۔ اس پر اور بھی بہت سے مقدمات چل رہے تھے۔ ہمیں تیرہ دوسرے مقدمات میں اس کی ضمانت دینی پڑی۔ مجھے خبر ملی کہ میاں نواز شریف ہر ممکن کوشش کر رہا ہے کہ مصطفےٰ جیل سے باہر نہ آنے پائے۔ اس نے اپنے کارندے بھیجے تاکہ مصطفےٰ کے خلاف بھولے بسرے مقدمات کو ازسر نو شروع کروایا جا سکے۔ وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ مصطفےٰ کھر کو آخر کار رہا کر دیا گیا۔

عملی سیاست میں گھرے رہنے کے دوران میں نے دیکھا کہ میں اس روبوٹ سے، جسے مصطفےٰ نے پروگرام کیا تھا، ترقی کرتے کرتے ایک ایسی سوچنے سمجھنے والی ہستی بن گئی ہوں جو آزادانہ عمل کی اہلیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں میرا رویہ اسی جیسا تھا، میں

اسی کی طرح باتیں کرتی تھی اور کلی طور پر اس کی ہدایت پر تکیہ کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آیا کہ اس کی سیاست کے اسلوب میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ عورت کا ہاتھ لگنے کی دیر تھی کہ اسلوب میں وہ مطلوبہ ملائمت اور خلوص پیدا ہو گیا جس کی ان مشکل دنوں میں ضرورت تھی۔ مجھے اس کے کاز پر یقین تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میں مصطفیٰ کے سیاسی وژن کا ایک آدرش پسندانہ روپ لوگوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ اس طرح میں نے حقیقت کو شاید مسخ کر دیا لیکن یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہی کہ یہ آدرش قابل عمل ہے۔

باب - ۹

بے وفائی

(1988ء - 1990ء)

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

4 نومبر 1988ء کو مصطفیٰ کھر، آزاد فرد کی حیثیت میں، اڈیالا جیل سے باہر آیا۔ وہ اپریل 1987ء سے قید چلا آرہا تھا۔ اس نے سر بلند کر کے جیل سے باہر قدم رکھا۔ میرے لیے ایک طویل اور صبر آزما کشمکش اختتام کو پہنچی۔ اگر میں نے ہمت نہیں ہاری تو اس کی وجہ ایک تو کارکنوں کا سدا بلند رہنے والا جذبہ تھا اور دوسرے مجھے یقین تھا کہ قدرت انصاف کر کے رہے گی۔

ہم اپنے فاتحانہ سفر پر پہلے راولپنڈی اور پھر وہاں سے لاہور روانہ ہوئے۔ مصطفیٰ کے لیے یہ سفر گویا پرانی یادوں کی تجدید کا سامان تھا۔ اس نے گیارہ برس اسی لمحے کے خواب دیکھنے میں بسر کیے تھے۔ جو دیکھنے کو ملا وہ اس کے خواب و خیال کے عین مطابق تھا، بس زیادہ حقیقی نکلا۔

ہم ایک پجیرو میں کھڑے تھے۔ ہمارے سر چھت سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ہجوم اپنے لوٹ کر آنے والے قائد کی جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ مصطفیٰ کے اصرار پر میں اس کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ بچوں سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ ہجوم کی عقیدت مندی اور جوش و خروش کو دیکھ کر کھڑے کے کھڑے بلکہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ہم نے بہت آہستہ آہستہ ڈرائیو کیا۔ ہر طرف لوگ کاروں کے جلوس کے ساتھ ساتھ دوڑتے

رہے، ہاتھ بڑھا کر مصطفیٰ کو چھونے، اور اس سے معانقہ کرنے میں مشغول رہے یا انہوں نے اپنی امید کو اقتدار کی نئی علامت ہیرو میں سامنے سے خراماں خراماں گزرتے دیکھنے پر اکتفا کی۔ راستے بھر ہر چھت سے، ہر کھڑکی سے، جوش بھرے چہرے ہماری طرف تک رہے تھے۔ ہم پر گلاب کی اتنی پتیاں نچھاور کی گئیں کہ ہم ان کی خوشبو میں بھیگ گئے۔ مصطفیٰ اور میں لوگوں کو دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلاتے رہے۔ عوام اور ان کے قائد کے درمیان یہ وہ مقام تھا جہاں توازن مکمل ہو جاتا ہے۔ قائد عوام سے بندھا ہوا اور عوام قائد سے بندھے ہوئے۔ زمانے کا ایک گریزاں لمحہ جو بدقسمتی سے ووٹ پڑنے سے پہلے وجود میں آتا ہے اور ووٹ ڈالے جانے کے بعد اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

لوگ جشن منا رہے تھے۔ پنجاب کے مشہور لوک ناچ، بھنگڑا اور لڈی، ناچنے میں مصروف تھے۔ ڈھولکی فتح کا آہنگ سنا رہی تھی۔ ہم نیشنل پیپلز پارٹی کے دفتر پر رکے۔ مصطفیٰ نے لوگوں سے خطاب کیا۔ تقریر مارشل لا کے خلاف اور عوام کے حق میں تھی۔ اس میں ان کے اجتماعی خوابوں کا خاکہ کھینچا گیا تھا۔ مصطفیٰ جذباتی ہو رہا تھا۔ بار بار اس کی آواز رندھ جاتی تھی۔ سننے والوں میں کم ہی ایسے ہوں گے جو ضبط کا دامن چھوڑ کر رونہ دیے ہوں۔ یہ مصطفیٰ کا دن تھا۔

آخر کار ہم صدیق بٹ کے گھر پہنچے جو ہزاروں رنگین قمقموں سے منور تھا۔ اخبار والے انتظار کر رہے تھے۔ سینیٹر نبی بخش زہری، جو مصطفیٰ کی اسیری کی پوری مدت میں میرے پکے اتحادی اور دوست رہے تھے، اپنی بگڑتی ہوئی صحت کے باوجود مصطفیٰ کو خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ مصطفیٰ نے عوام سے خطاب کیا جو اس کی آواز سننے کو ترس گئے تھے، اس کے لفظوں کے بھوکے تھے۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اس نے پریس سے خطاب کیا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا بیان ہر اخبار کے صفحۂ اول پہ چھپے گا۔ مصطفیٰ کھر نے ثابت کر دیا کہ وہ چلا ہوا کارتوس نہیں۔

ہم جسمانی اور ذہنی طور پہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ نیند آئی تو اس وقت بھی ہم پر سرخوشی طاری تھی۔ اس کے بعد پھر روانگی۔ صبح سویرے۔ لاہور کی طرف۔

ہم گوجرانوالہ رکے۔ مصطفیٰ نے اس نعرے شہر کی سڑکوں کو اپنی سٹیج میں تبدیل کر دیا۔ لوگ دکانیں چھوڑ کر چلے آئے۔ کام بند ہو گیا۔ جو لوگ اس کی باتیں سننے کے لیے ہجوم در ہجوم ارد گرد جمع ہوئے تھے وہ محض تجسس کے مارے اٹھ کر نہیں آئے تھے۔ یہ وہ سامعین تھے جو مصطفیٰ کا لوہا مان چکے تھے۔ مصطفیٰ کھر نے مدتوں پہلے یہاں آکر انھیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ وہ اسے جانتے بھی تھے اور چاہتے بھی تھے لیکن اب وہ بعض مطالبے لے کر آئے تھے۔ وہ سیاسی طور پہ باشعور تھے۔ وہ اپنی

حمایت کا یقین دلا رہے تھے لیکن غیر مشروط طور پہ نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مصطفیٰ ان رنجشوں کو بھلا دے جو اسے پی پی پی سے تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مصطفیٰ دوبارہ اپنی اصل پارٹی میں لوٹ آئے۔ معنی خیز بات یہ تھی کہ یہ جذباتی مطالبہ نہ تھا۔ اقتدار کے لیے کے جو خدوخال ابھر کر سامنے آ رہے تھے یہ مطالبہ ان کا اندازہ لگانے کے بعد کیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف مصطفیٰ کھر ہی سیل کا رخ ان کے حق میں پھیر سکتا ہے۔ وہ اسمبلی میں دم دبائے دبے پاؤں جانے کے خواہاں نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فاتحانہ انداز میں لیے ڈگ بھرتے اسمبلی میں داخل ہوں۔ ہجوم نے پارٹی کے حق میں، بھٹو صاحب اور بے نظیر اور شیرِ پنجاب کی حق میں نعرے بلند کیے۔ وہ سوچ کر آئے تھے کہ مصطفیٰ کو تن تنہا اپنا سفر جاری نہ رکھنے دیں گے۔ ہمارے جھنڈوں کے مقابلے میں پی پی پی کے جھنڈوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ لوگ جیپ پہ چڑھ آئے اور انہوں نے مصطفیٰ سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کرے۔ پارٹی کو اس کی انتہائی شدید ضرورت ہے۔ یہ ایسا عنصر تھا جس سے ہمیں اپنے مہتم بالشان سفر کے دوران راستے بھر دوچار ہونا پڑا۔

ہمارا اگلا سٹاپ جہلم تھا۔ مصطفیٰ نے ایک اور جذباتی تقریر کی۔ میں میجر آفتاب کے گھر والوں سے ملنے چلی گئی۔ وہی نوجوان افسر جس نے ہماری ناکام فوجی بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ اس کی بربادی کے ذمے دار ہم تھے۔ میں میجر آفتاب کی بیوی اور والدہ سے ملی۔ میرا دل ان کے لیے تڑپ تڑپ اٹھا۔ جو کچھ ان پر بیتی تھی انہوں نے اس کی دل ہلا دینے والی تفصیل مجھے سنائی۔ ان کا ڈراؤنا خواب ابھی اس سہانے سپنے میں نہیں بدلا تھا جس کے لیے وہ دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ میجر آفتاب ابھی قید تھا۔

کاروں کا جلوس گوجرانوالے کی طرف رینگتا رہا۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک رات کا اندھیرا چھا گیا۔ لیکن گوجرانوالے میں مصطفیٰ کا ورود ان چیزوں میں تھا جو صرف خوابوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پورا شہر فخر و انبساط کی ایک ارتعاش موج پہ ڈول رہا تھا۔ چوہدری ارشاد ہمارے ساتھ تھا۔ وہ انتخابات میں گوجرانوالے سے این پی پی کے امیدوار کے طور پر حصہ لے رہا تھا لیکن لوگ ہجوم کر کے مصطفیٰ کو دیکھنے آئے تھے۔

اسے جوش سے پاگل حامیوں میں سے دھنس دھنسا کر گزرنا پڑا۔ وہ اسے چھونے، اس کی پیٹھ تھپکنے یا بغل گیر ہونے کے لیے دھکا پیل کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان کا "یار" تھا مصطفیٰ آخر کار خاص طور پہ تعمیر کیے ہوئے پلیٹ فارم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہجوم نے بلند بانگ اور انبساط انگیز نعرہ لگا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ وہ شام چھ بجے سے مصطفیٰ کا انتظار کر رہے تھے۔ اب ساڑھے نو بجے تھے۔ لیکن ساڑھے تین گھنٹوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ گیارہ سال انتظار کرتے رہے تھے۔

اُدھر مصطفےٰ تو تقریروں سے ہجوم کا دل بہلا رہا تھا، اِدھر میں آٹوگراف دے رہی تھی۔ میرے اردگرد پرستاروں کی فوج اکٹھی ہو چکی تھی جس میں لڑکیاں بھی شامل تھیں اور لڑکے بھی۔ سب نوجوان لڑکے میری طرف کاغذ کے پرزے، نوٹ بکیں اور روپے کے نوٹ بھجوا رہے تھے۔ میں راولپنڈی سے لاہور تک سارے راستے دستخط کرتی آئی تھی۔ یہ لڑکے بالے، سینکڑوں کی تعداد میں، آٹوگراف کتابیں اور کاغذ کے پرزے ہاتھ میں پکڑے، مجھ پر ٹوٹ پڑتے اور انہیں میری طرف بڑھاتے رہتے۔ ان من موجی لڑکوں کے کبھی ختم نہ ہونے والے تقاضوں کو پورا کرنا ناممکن تھا۔ انہیں مصطفےٰ کے آٹوگراف سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ سب نوجوان لڑکے اور طالب علم تھے۔ وہ سب اجتماعی طور پر میرے شیدائی بن بیٹھے تھے۔ میں ان سے کہتی رہتی کہ شور مچانا بند کریں اور مصطفےٰ کی تقریر سنیں۔ انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

لاہور، پاکستان کا دل۔ یہ گھر کی طرف ایک جذباتی واپسی تھی۔ یہی وہ شہر تھا جس پر اس نے راج کیا تھا۔ یہی شہر اس وقت اس کے گرد جمع ہو گیا تھا جب اس نے بھٹو صاحب سے ٹکر لی تھی۔ اس شہر نے اس رات خود کو مصطفےٰ کے حوالے کر دیا۔ مصطفےٰ کسی بچے کی طرح روتا رہا۔

ہم ایک ٹرک پر سوار ہوئے۔ لاؤڈ سپیکر دہاڑ رہے تھے۔ شیرِ پنجاب کا استقبال کرنے کے لیے نعرے باز ہجوم سے نعرے لگوا رہے تھے۔ میں نے اردگرد نظر ڈالی۔ ہر طرف بینرز لگے ہوئے تھے۔ بعض میں مجھے مخاطب کیا گیا تھا۔ میں نے دھندلی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی تو لکھا نظر آیا۔ "پنجاب کی شیرنی، مبارک باد۔ تم شیر کو چھڑانے میں کامیاب رہیں۔" کارکنوں کی سیاسی سوجھ بوجھ کی اتنی بڑی شہادت کے سامنے دفتر کے دفتر ہیچ تھے۔ انہوں نے میرے کردار کا اعتراف کیا تھا۔ میرا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ یکایک مجھے نظر آیا جیسے میں سچ مچ شیرنی بن کر ٹہلتی پھر رہی ہوں۔

داتا دربار حضرت علی ہجویری کا مزار مبارک۔ اس شہر کے لوگ جسے انہوں نے اپنے ورود مسعود سے افتخار بخشا تھا انہیں پیار سے داتا صاحب کہتے ہیں۔ مصطفےٰ نے مزار کا رخ کیا۔ اپنے تاریک لمحات میں وہ داتا صاحب کی خدمت میں التجا کرتا رہا تھا۔ اب وہ اپنی احسان مندی کا اظہار کرنے حاضر ہوا تھا۔

ایک بار پھر اسی جانے پہچانے مطالبے کی گونج سنائی دی: پیپلز پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔ اکٹھا ہونے والا ہجوم کبھی مصطفےٰ کھر سے جذباتی وفاداری پر مائل نظر آتا تھا، کبھی اپنی پارٹی سے کیا ہوا سیاسی عہد و پیمان نبھانا چاہتا تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ مصطفےٰ ان کے دل اور دماغ میں پھوٹ ڈالنے والے اس تناؤ کو کسی حد تک رفع دفع کر دے۔ پی پی پی

کے بعض حامی بے نظیر کی بہت بڑی تصویر لے کے آئے تھے۔ انہوں نے تصویر مصطفےٰ کے پہلو میں رکھ دی۔ فلیش بلب چٹا چٹ چلنے لگے۔ کارکنوں نے اصرار کیا کہ مصطفےٰ ان کی جواں سال رہنما کی تصویر اٹھا لے۔ مصطفےٰ نے ایسا ہی کیا۔ اسے زبردست داد ملی۔ یہ ایک علامتی حرکت تھی۔ میں نے مصطفےٰ کی بے اطمینانی کو محسوس کیا۔ لوگ اس کے رہنما بن گئے تھے۔ اسے مجبور کر رہے تھے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی کو جو اسے انکل کہتی تھی، اپنا قائد تسلیم کر لے۔

داتا دربار میں اس نے ہجوم سے خطاب کیا۔ "میں عوام کے لیے، کارکنوں کے لیے جنہوں نے مجھے سیاسی طور پر زندہ رکھا، جو بھی مجھ سے بن پڑا کروں گا۔ پیپلز پارٹی میری پارٹی ہے۔ اس پارٹی کے کارکن میرے دوست ہیں، میرے بھائی ہیں۔ مجھے پارٹی سے یا کارکنوں سے کوئی شکایت نہیں۔ میرے پارٹی کی قیادت کے ساتھ اختلافات ہیں۔ ان اختلافات کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔" مصطفےٰ کے مصالحت آمیز لہجے سے کچھ امید بندھی۔

ہمیں ایک زیارت اور کرنی باقی تھی۔ نانی اماں کے گھر کی زیارت جو جائے امن و سلامتی تھا۔ ان کی طبیعت کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھی لیکن ہم دونوں کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہیں مجھ سے پیار تھا اور میرا دکھ انہیں اپنا دکھ لگتا تھا۔ جس طرح انہوں نے مصطفےٰ کی رہائی کے لیے دعائیں مانگی تھیں کسی اور نے کب مانگی ہوں گی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت یہی دعائیں مانگتے گزارا تھا کہ مجھے خوشیاں نصیب ہوں اور میری زندگی جو ہلچل بپی رہتی ہے وہ ٹھنڈی پڑ جائے۔ ہماری واپسی کے بعد اور اس تمام عرصے میں، جو مصطفےٰ کی آزمائش کا دور تھا، ان کا بیشتر وقت جانماز پر گزرا تھا۔ وہ جانماز پر بیٹھی، سجدہ ریز ہو کر، آہ و زاری کر کے، اللہ کے حضور میں گڑگڑاتی رہتیں کہ ہماری مشکل آسان ہو جائے۔

ہم نے نانی اماں کے ساتھ کھانا کھایا۔ تھکن کے باوجود آخرکار امن چین سے بیٹھنا نصیب ہوا۔ گلاب کی مسلی ہوئی پنکھڑیوں سے ہمارے کپڑے لال ہو گئے تھے۔ ہم پر اتنی دھول پڑ چکی تھی کہ لگتا تھا جیسے بہت دن سے نہائے نہ ہوں۔ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ آنکھوں کے گرد کلونس جم کر ہمارے پسینے میں گھل مل چکی ہے۔ اس کے باوجود ہم گھر لوٹ آئے تھے۔ اب اور کس بات کی پروا ہو سکتی تھی۔

اگلے دن علی الصبح مصطفےٰ اور میں اس حلقے میں گئے جہاں سے اس نے میاں نواز شریف کے خلاف انتخابی جنگ لڑی تھی۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکی تھی۔ میں نے گردو پیش کا جائزہ لیا تھا اور یہ دیکھ کر میرا حوصلہ ڈگمگا گیا تھا کہ میرے سامنے کس قدر زبردست

کام ہے۔ درتادر ووٹ مانگنے کے خیال سے مجھے خفت اور گھبراہٹ ہونے لگی۔ مصطفیٰ نے کہا کہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ علاقے کے لوگ مجھ سے ناواقف تھے۔ انہیں میرے بارے میں گرم جوشی ظاہر کرنے میں کچھ وقت لگا۔ مصطفیٰ ان کے حقوق کا علم بردار تھا۔ اس کے ان کے درمیان موجود ہونے سے جو جوش و خروش پیدا ہو سکتا تھا اسے مصطفیٰ کی بیوی کی موجودگی کہاں سے پیدا کرتی۔ اصل امیدوار کی نقل بن کر میدان میں اترنا نہایت مشکل کام ثابت ہوتا۔ اس بار مصطفیٰ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہر چیز آسان لگ رہی تھی۔

مصطفیٰ کے آنے کی خبر آن کی آن میں پھیل گئی۔ لوگ اس سے ملنے کے لیے جمع ہو گئے۔ مصطفیٰ کے جوہر تو ایسے ہی ماحول میں کھلتے تھے۔ وہ لوگوں سے اس طرح گفتگو کرتا رہا جیسے ان کے تعلقات کے تسلسل میں کوئی وقفہ نہ آیا ہو۔ اس نے ہر کسی کے بارے میں نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور لگتا تھا کہ وہ ان سب کا بہت قریبی واقف ہے۔ اس میں نہ کوئی تکبر تھا نہ عوام سے الگ نظر آنے کی خواہش۔ وہ بس ہجوم میں گھل مل گیا جو اس کا احترام بھی کر رہا تھا اور گہری رفاقت کا احساس بھی دلا رہا تھا۔ اسے لوگوں سے یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ ووٹ اسی کو دیا جائے۔ ان سے مل لینا ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے جب میں یہاں آئی تھی تو مجھے دہری خفت اٹھانی پڑی تھی۔ ایک تو میں جس سے بھی ملتی پہلے اس سے اپنا تعارف کرانا پڑتا۔ اس کے بعد میں کہتی کہ میرے اسیر شوہر کو ووٹ دیا جائے۔ انہیں لوگوں نے، جواب اسے بغل گیر ہو رہے تھے۔ اور ماتھا چوم رہے تھے، مجھ سے اس وقت ایسا سلوک کیا تھا جیسے میں کوئی غیر ملکی ہوں۔

اگلے دن بھی ہم نے حلقۂ انتخاب کا دورہ کیا۔ مصطفیٰ نے اپنا مشہور بیان دیا کہ وہ یہاں بھٹو صاحب کے خادم کی حیثیت میں آیا ہے۔ وہ امید کر رہا تھا کہ حلقے سے پی پی پی کا امیدوار اس کے حق میں دست بردار ہو جائے گا تاکہ اس کے اور وزیر اعلیٰ کے درمیان براہ راست مقابلے کے لیے میدان خالی ہو جائے۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے بیشتر ووٹر پیپلز پارٹی کے پکے ساتھی ہیں۔ اس کے میدان میں آنے سے یہ ووٹ بٹ جائیں گے۔ نواز شریف آسانی سے جیت جائے گا۔ جب پی پی پی نے مصطفیٰ کھر کی امیدواری پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کر دیا تو مصطفیٰ نے کاغذات واپس لے لیے وہ نواز شریف سے اپنے ناگزیر ٹکراؤ کو کسی اور دن، کسی اور جگہ کے لیے ملتوی کر رہا تھا۔

مصطفیٰ کی نظر میں مظفر گڑھ زیادہ فیصلہ کن تھا۔ اس نے قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی دو نشستوں کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کیے تھے۔ ہم مظفر گڑھ جانے

کے لیے ملتان روانہ ہوئے۔ مصطفیٰ کے اپنے شہر میں ہماری تاریخی آمد کو ریکارڈ کرنے کے لیے پریس موقع پر موجود تھا۔ میں کار میں جا بیٹھی اور انتظار کرنے لگی کہ وہ پریس سے مل ملا کر فارغ ہو گا تو میرے پاس آ جائے گا۔ مصطفیٰ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں گفتگو کی۔ "قومی سیاست میں حصہ لینے کے لیے مجھے بہت دیر میں رہا کیا گیا۔ میں اس ملک میں سیاست کا رخ بدل دوں گا۔" پھر اس نے اپنی توپوں کا رخ پنجاب کے تخت و تاج کے دعوے دار، نواز شریف کی طرف پھیر دیا۔ "نواز شریف نے پنجاب جنرل جیلانی سے خریدا ہے، بعینہٖ کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے خریدا تھا۔ میں عوام کی حمایت سے پنجاب کو آزاد کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں صوبے کو غاصبوں سے چھین کر رہوں گا۔" یہ تقریر میاں صاحب کو ضرور چبھی ہو گی۔ نواز شریف کو چونکہ کشمیری نژاد ہونے پر بڑا ناز تھا اس لیے کشمیر کی طرف اشارہ اسے اکھرنا ہی چاہیے تھا۔

مظفر گڑھ پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہم ان کیچڑ بھرے کچے راستوں سے گزرے جنہیں سڑک کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن تاریکی کے باوجود ہمیں شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم بھنبھناہٹ سن سکتے تھے۔ یہ شادمان ہجوم تھا۔ لاکھوں آدمی، جن کے صرف سیاہ خاکے نظر آ رہے تھے، ناچنے، تالیاں بجانے اور نعرے لگانے میں مصروف تھے۔ لالٹینیں روشن تھیں، مشعلیں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ جیسے ازمنۂ وسطیٰ کے ماحول میں کوئی جدید ڈرامہ دکھایا جا رہا ہو۔ مشعلوں کی جھلملاتی قطاروں میں اب دھندلی، غیر واضح شکلیں نظر آنی شروع ہوئیں۔ یہ تیسری مرتبہ تھا کہ وہ اپنے کھنڈلوں سے، اپنی بھوک، اپنی محتاجی کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ جس منبع سے وہ جوش و خروش اور محبت حاصل کر رہے تھے وہ انتھاہ معلوم ہوتا تھا۔

پھٹے پرانے کپڑوں سے محض ان کے ننگے جسم ہی نمایاں نہ تھے۔ ہمیں ان کے دل بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہی وہ چہرے ہیں جو مایوسی بھرے کینوس سے میری طرف تکتے رہتے تھے۔ لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر۔ اور بھی دکھ ہیں۔ اور بھی دکھ۔ میں اپنی زندگی ان گلیوں کوچوں میں بھرے مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے وقف کر چکی تھی جنہوں نے خوف پر فتح پالی تھی، جنہوں نے اس رواج کو للکارا تھا جو کہتا تھا کہ ظلم کو چپ چاپ سہتے رہنا چاہیے۔ وہ اس وقت سر اٹھائے، سینہ تانے چل رہے تھے۔ ان کا محافظ ان کے درمیان تھا۔ مظفر گڑھ میں ان ہجوموں کو دیکھ کر مجھے پاکستان لوٹ آنے کا جواز ہاتھ آ گیا۔

مصطفیٰ گھر لوٹ آیا تھا۔ عوام نے اس کے قدموں کے نقوش کو محفوظ رکھا تھا۔ وہ

اپنے عوام سے مل رہا تھا۔ وہ ان کے ناموں سے واقف تھا۔ جب اسے کوئی مانوس چہرہ نظر آتا تو وہ ہجوم میں غائب ہو جاتا۔ وہ کسی بوڑھے آدمی کو گلے لگا لیتا اور آپس میں پندو نصائح کا تبادلہ ہوتا۔ یہ دیکھ کر میرے دل پر بہت اثر ہوا کہ مصطفیٰ کو خوش آمدید کہنے کے لیے عورتیں سخت پردے سے باہر آ گئی تھیں۔ اس سے پردہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ان کا باپ تھا، بھائی تھا، بیٹا تھا۔ مردوں نے اپنی عورتوں کی موجودگی کا برا نہ مانا۔ اس طرح مرد گویا یہ بیان جاری کر رہے تھے: مصطفیٰ ایک عزت دار آدمی ہے جو ان کی عورتوں کی آبرو اور عصمت کی حفاظت کرے گا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مصطفیٰ حقیقی اسلامی حکم کی پابندی کرتے ہوئے عورتوں کی موجودگی میں اپنی نظر نیچی رکھے گا۔ نجات کا وقت قریب تھا۔ نجات دہندہ آ پہنچا تھا۔ ان کی قسمت معجزاتی طور پر بدلنے والی تھی۔ ہمارا جلوس اپنے پیچھے بہت سی گرد اور امید چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ہم آخر کار غلام غازی کھر کے گھر پہنچے۔ غلام غازی فوت ہو چکا تھا اور مصطفیٰ اس کے گھر ٹھہرنا چاہتا تھا۔ یہ گھر آنے والے دنوں میں مصطفیٰ کا انتخابی ہیڈ کوارٹر بن گیا۔

مصطفیٰ نے کوئی انتخابی مہم نہیں چلائی۔ عوام تو پہلے ہی ووٹ دے چکے تھے۔ مصطفیٰ کو فتح کا یقین تھا۔ وہ ان نشستوں سے جب بھی چاہے جیت سکتا تھا۔ اس نے دورے ضرور کیے لیکن ووٹ لینے کے لیے نہیں، لوگوں سے ملنے کے لیے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہجوم نہ جانے کہاں سے نمودار ہو جاتے۔ کوٹ ادو، سناواں، چھوٹے چھوٹے قریے، جنھیں اس نے ایک امتیازی شناخت عطا کی تھی۔ یہ اس کا جاگیرستان تھا۔ بغیر کسی تردد کے خود بخود منعقد ہونے والے جلسے۔ جیسے ہی مصطفیٰ ان سیدھے سادے، راست باز سامعین سے خطاب کرنے کھڑا ہوتا ہر طرف سے لوگ دوڑ دوڑ کر اس کے گرد اکٹھے ہونے لگتے۔ مصطفیٰ نے خاص خیال رکھا کہ اپنے حلقے کا کوئی بعید ترین گوشہ بھی ایسا نہ رہے جہاں اس کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ وہ ان علاقوں میں آباد کار پٹھانوں سے مخاطب ہوا اور اپنے مجبور سامعین کو مسحور کرتا رہا۔

مصطفیٰ کے تین بھائی میدان میں اتر چکے تھے۔ صوبائی اسمبلی کا سابق رکن، غلام ربانی کھر، صوبائی نشست پر کھڑا ہوا تھا اور غلام مرتضیٰ کھر قومی اسمبلی میں نشست حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ مصطفیٰ نے اپنے بھائیوں کے خلاف مہم چلانے مجھے بھیج دیا۔ میں نے دیکھا کہ ہجوموں نے میرے لیے بھی اسی جوش اور جذبے کا مظاہرہ کیا جو وہ مصطفیٰ کے لیے کرتے آئے تھے۔ میں مصطفیٰ کی بیگم ہونے کے ناطے احترام کی مستحق ٹھہری۔ میری وجہ سے ان کی بڑی عزت افزائی ہوئی۔ ایسے ماحول میں جہاں عورتیں زنان خانے میں پیدا ہوتی ہیں، وہیں زندگی گزار دیتی ہیں، وہیں فوت ہو جاتی ہیں، میں

انھیں ضرور بہت انوکھی معلوم ہوئی ہوں گی۔

میری تقریروں کا مرکزی موضوع بے وفائی تھا۔ مصطفیٰ کے بھائیوں کا خون سفید ہو گیا ہے۔ وہ دشمن کے ڈیرے میں جا بیٹھے ہیں۔ انھوں نے ان لوگوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے جو ان کے بھائی کو قید میں ڈالے رکھنے کے ذمے دار تھے۔ میں نے اپنے پُرشوق اور جذبات سے بھرے سامعین کو بتایا کہ انھوں نے جیل میں پڑے اپنے بھائی سے باقاعدگی سے ملاقات کرتے رہنے کی زحمت تک نہ کی تھی اس لیے مجھے، ایک عورت کو جو مصطفیٰ کی ناموس ہے، مجبوراً گھر سے نکل کر مصطفیٰ کی خاطر جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ میں نے مسلم لیگ کو ضیاء کی تخلیق قرار دے کر برا بھلا کہا اور حاضرین کو بتایا کہ مصطفیٰ کے بھائی اس کے دشمنوں سے جا ملے ہیں۔ "کیا وہ اسے معاف کر سکتے ہیں؟" پھر بھی 1985ء کے انتخابات میں انھیں محض اس لیے ووٹ ملے تھے کہ ان کے نام اور مصطفیٰ کے نام میں کھر جزو مشترک تھا۔ میں نے کہا کہ مسلم لیگ کو ووٹ دینا ایک ایسی حکومت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہو گا جس نے مصطفیٰ سے اس کی زندگی کے گیارہ سال چھین لیے تھے جس نے اس کی ساری املاک ضبط کر لی تھی، جس نے اسے اپنے عوام سے جدا کر دیا تھا۔

غلام ربانی اچھا پارلیمنٹیرین ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنے حلقے میں کام کر کے دکھایا اور اس کی مقبولیت میں فرق نہ آیا تھا۔ عوام اس خواب غفلت سے بیدار ہو چکے تھے جس میں وہ نیند میں چلنے والوں کی طرح ووٹ ڈالنے جایا کرتے تھے۔ اب وہ سوچ سمجھ کر ووٹ ڈالتے تھے۔ وہ مرتضیٰ کھر کو ووٹ دینے کو تو تیار نہ تھے کیونکہ مصطفیٰ بذات خود مرتضیٰ کے مقابلے میں کھڑا تھا لیکن ربانی کو اس کے سابقہ ریکارڈ کی بنا پر ووٹ دے کر دوبارہ جتوانا چاہتے تھے۔ ربانی کے مقابلے میں کھڑا ہونے والا این پی پی کا امیدوار حلقے کے ووٹروں کو قبول نہ تھا۔ مصطفیٰ نے اپنے بھائی عربی سے مقابلہ کیا جو این پی پی جتوئی گروپ کی طرف سے امیدوار تھا۔ عربی ہار گیا۔

مصطفیٰ کا بیٹا عبدالرحمٰن بھی صوبائی اسمبلی کی نشست کا انتخاب لڑ رہا تھا۔ اس کا مقابلہ دستی سے تھا۔ مصطفیٰ نے اپنے بیٹے کی انتخابی مہم میں حصہ نہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلام عربی کی سرگرم حمایت کی وجہ سے دستی جیت گیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ مصطفیٰ نے قومی اسمبلی کی نشست کے لیے عربی کے خلاف انتخاب لڑا۔ غلام عربی اس نشست سے کامیاب ہونے کا مستحق تھا۔

انتخابات کا دن اکتا دینے والا ثابت ہوا۔ اتنے کم تناؤ کی صورت میں اور کیا ہوتا۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ وہ جیت جائے گا۔ ہوا بھی یہی۔ وہ اپنی تمام نشستوں پر کسی وقت

کے بغیر کامیاب ہوگیا۔ قومی اسمبلی کی نشست تو اس نے ساٹھ ہزار ووٹوں کے فرق سے جیتی۔ غلام مرتضیٰ کے اپنے ملازموں نے اس کے خلاف ووٹ ڈالے۔ شور اتنا تھا پر تماشا نہ ہوا۔ اس رات میں ٹی وی دیکھنا چاہتی تھی تاکہ پتہ چلے کون کون سی پارٹی کامیاب ہوئی ہے۔ مصطفیٰ سونا چاہتا تھا۔ نتائج معلوم کرنے کی جلدی ہی کیا تھی۔

ہم نے کوٹ ادو میں دو دن اور قیام کیا جن کے دوران مصطفیٰ گھوم پھر کر لوگوں کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ اتنی زیادہ دوڑ دھوپ سے اس کے اعصاب پر جو بوجھ پڑا تھا اس کے اثرات اب ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ اس کی قوت ارادی، جو اس طوفانی انتخابی مہم کے پورے عرصے میں اسے آگے ہی آگے بڑھنے پر اکساتی رہی تھی، اب کمزور پڑنے لگی۔ وہ وائرس سے پیدا ہونے والے فلو میں مبتلا ہوگیا اور اسے نشتر ہسپتال میں داخل ہونا پڑا لیکن اب اس نے آزاد فرد اور عوام کے منتخب نمائندے کے طور پر وہاں قدم رکھا۔ دو دن بعد اسے فارغ کر دیا گیا۔ ہم لاہور واپس آگئے۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، اتنی رفعتوں کو چھونے کے بعد ہمیں پستی سے دوچار ہونا پڑا۔

مصطفیٰ کے ساتھ پاکستان آنے کے بعد میرا اپنے خاندان سے کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ میرے بے یارو مددگار بچوں کے ساتھ لندن میں میرے گھر والوں نے جو سلوک کیا تھا اس کی وجہ سے میرا دل اب تک جل رہا تھا۔ اب خوشی اور غم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہمارے سامنے ظاہر ہوئے۔ جس روز مصطفیٰ کو جیل سے رہائی ملی اسی دن زرمینہ اور روبینہ نے مجھے فون کیا جسے سن کر میں بہت شرمندہ ہوئی۔ والد صاحب نے کسی اور عورت سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور امی ذہنی طور پر تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ والد صاحب ذرا سی چھوٹ دینے کو بھی تیار نہ تھے۔ میری بہنیں چاہتی تھیں کہ ہم مل بیٹھیں اور ان کی ازدواجی زندگی اور اپنے خاندان کو بچانے کی کوشش کریں۔ عین اس وقت جب مصطفیٰ جیل کے دروازوں سے باہر قدم رکھ رہا تھا میرا ذہن ڈانواں ڈول تھا۔ خوشی اور حزن کے اس عجیب اتصال پر میں حواس باختہ ہو کر رہ گئی تھی۔ میری زندگی کیا تھی ایسی سیر بین تھی جو کسی نچلے نہ بیٹھنے والے لڑکے کے ہاتھ آگئی ہو۔

جو ناگزیر تھا وہ ہو کر رہا۔ سالہا سال جبر سہنے کے بعد والد صاحب نے کہا بس بہت ہو گیا اور امی سے منہ موڑ کر چل دیے۔

بہت برس بعد امی نے آخر کار ہی کرم کر کے ایسا راز ظاہر کیا جسے انتہائی احتیاط سے چھپایا گیا تھا۔ امی کو معلوم تھا کہ ہمیں یہ بات ناگوار ہے کہ وہ والد صاحب کے سر پر سوار رہتی ہیں اور ان کے سرکاری کام کاج میں دخل دیتی ہیں۔ امی نے بتایا کہ اگر وہ والد صاحب کو کھلی چھٹی دے دیتیں تو وہ اپنا بیڑا غرق کر لیتے۔ ان کا جسمانی نظام الکحل کو

بالکل برداشت نہ کر پاتا تھا۔ جب بھی کسی بحران کا سامنا ہوتا والد صاحب، دنیا و مافیہا کو بھلانے کے لیے، شراب کا سہارا لینے کی طرف مائل ہو جاتے۔ ایسا کرنا ان کے حق میں سخت نقصان دہ تھا۔ الکحل انہیں مفلوج کر سکتا تھا۔ بحران کے وقت امی کو ان کی تمام حرکتوں کو کنٹرول کرنا پڑتا تھا، ان پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ یہ بات امی ہر کسی سے چھپائے رہیں۔ امی ان پر کسی شکرے کی طرح نظر جمائے رکھتیں۔ جب لندن میں چارٹر کلینک کے نفسیاتی معالج نے آخر کار امی اور زرمینہ سے بات کی تو کہنے لگا۔ "مسز درانی، آپ نے نہ صرف اپنی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر رکھی بلکہ خود جھوٹ بن گئیں۔ آپ نے ایک لنگڑے آدمی کو لنگڑانے کا موقع نہیں دیا۔" ہم سب امی کو بہتر طور پر سمجھنے لگے۔ انہوں نے خاندان کی نیک نامی کی خاطر عظیم ترین قربانی دی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی جبلی نرمی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں۔ شوہر کی بیساکھی بننے کے لیے انہوں نے اپنی پوری شخصیت بدل ڈالی تھی۔

جب وہ شوہر کو کھو بیٹھیں اور وہ انہیں چھوڑ کر کسی اور عورت کے پاس چلا گیا تو اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا وقت ہی گزر چکا تھا۔ جو کچھ ہمارے ساتھ بیتی تھی اس کے لیے سب نے امی کو مورد الزام ٹھہرایا۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ میں انہیں کی بیٹی تھی۔ جس شخص سے مجھے محبت تھی اسے بچائے رکھنے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کرتی تھی۔ میں بھی یہ سمجھ کر اس کی کوتاہیوں اور نقائص پر پردہ ڈالتی رہی کہ ایسا کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ میں نے دکھ سہے لیکن اپنے ظاہر سے، اپنے رویے سے، کسی کو ہرگز جو پتہ چلنے دیا ہو کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

امی کو یہ سب کچھ ہمیں بتانے میں اڑتیس برس لگے۔ بتایا تو اتنی دیر ہو چکی تھی کہ کوئی مداوا ممکن نہ تھا۔ مجھے سب کچھ بتا دینے میں کم عرصہ لگا ہے۔ ہم دونوں جب اپنی ریاکاری اور جھوٹے امیج کے خول سے باہر آئیں تو ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور دنیا نے ہمارے بارے میں غلط رائے قائم کر لی۔ جس بات کا ہم دوسروں کو یقین دلاتے رہے تھے ہم نے خود بھی اس پر یقین کرنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہمارے شوہر جو ہیں وہ عظیم انسان ہیں۔

قومی اسمبلی کے سیشن سے پہلے ہم نے فیصلہ کیا کہ والدین سے ملنے کراچی چلتے ہیں۔ میں ان تمام تکلیفوں کو بھلا دینے کے لیے تیار تھی جو امی نے مجھے پہنچائی تھیں۔ میں نے انہیں معاف کر دیا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ان آدمیوں میں سے ہیں جو ظاہری آن بان کے سہارے جیتے ہیں اور اس سے بڑی رسوائی ان کے حصے میں کیا آ سکتی تھی کہ والد صاحب انہیں ٹھکرا کر چلے گئے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ جب میرا آپریشن ہو رہا تھا تو

انھوں نے کتنی سنگدلی کا ثبوت دیا تھا اور جب میرے بچے لندن گئے تھے تو وہ ان کے ساتھ کس طرح پیش آئی تھیں۔ اس کے باوجود جانے کیوں میرا دل چاہا کہ ساتھ دوں گی تو انھیں کا دوں گی۔

ہوائی اڈے پر روبینہ اور عدیلہ ہمیں لینے آئیں۔ میری عدیلہ سے مدتوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ لینہ اور محمد۔ اس کا شوہر، مطلوب، بھی موجود تھا۔

ہم امی سے ملنے گئے۔ وہ غم کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ ان کی استقامت اور بارعب وضع قطع سب ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ ان کی خود پسندی خاک میں مل گئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ والد صاحب نے صبیحہ حسن سے شادی کر لی ہے۔ جب وہ سٹیٹ بینک کے گورنر تھے تو صبیحہ ان کے ساتھ کام کرتی رہی تھی۔ وہ پچاس برس کی تھی۔ والد صاحب ساٹھ کے تھے۔

اس بات سے مجھے زبردست صدمہ پہنچا۔ ان مسائل کے باوجود، جو ہمارے خاندان کو کسی موذی مرض کی طرح چمٹے رہتے تھے، ہمارے والدین کی شادی بظاہر نہایت مضبوط اساس پر قائم تھی۔ دنیا کے سامنے انھوں نے اپنا یہی ایمج پیش کیا تھا۔ ہمیں کبھی پتہ نہ چلنے دیا گیا تھا کہ کتنے بدنما داغوں پر لیپا پوتی کی گئی ہے اور زخموں کے کتنے نشانوں کو چھپایا گیا ہے۔ والد صاحب کی اس حرکت سے امی کو بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ وہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھیں۔ میں نے جبلی طور پر امی کا ساتھ دیا۔ میں ایسی عورت کے ساتھ ہمدردی کر سکتی تھی جسے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہو۔

میں نے والد صاحب سے بات کی۔ انھوں نے الزام لگایا کہ امی ان پر حکم چلاتی رہتی تھیں اور ان پر اتنی بندشیں عائد کر دی گئی تھیں کہ ان کے لیے اپنی مرضی کی زندگی گزار نا محال ہو چکا تھا۔ انھوں نے والد صاحب کو زبردستی وہ کچھ بنا دیا جو وہ نہیں تھے۔ "آدمی کو کبھی اپنے سے اونچے خاندان کی عورت سے شادی نہ کرنی چاہیے" انھوں نے وضاحت کی۔

امی نے انھیں اپنے پٹھان ماضی سے رشتہ منقطع کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انھیں اپنے رشتے داروں سے ملنے، اپنے آبائی گھر جانے سے باز رکھا جاتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ والد صاحب بھول جائیں کہ وہ ایک ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد صاحب کو فوج سے الگ ہونا گراں گزرا تھا۔ فوجی زندگی کی یاد انھیں ستاتی رہتی تھی۔ انھیں اپنی زندگی سے نفرت تھی۔ زندگی کیا تھی ایک مسلسل بہروپ تھی۔ ریاکار بنے رہنے سے اپنا اور دوسروں کا احتساب کرتے رہنا بہتر تھا۔ صبیحہ حسن نے انھیں جوں کا توں قبول کر لیا

تھا۔ دونوں کے تعلق میں کوئی دباؤ کوئی تناؤ نہ تھا۔ "میرے لیے اتنا عظیم آدمی بن کر رہنا ضروری نہیں جو تمھاری امی نے مجھے بنا دیا۔ میں بڑا آدمی نہیں تھا۔"

ان کی یہ سیدھی سادی سوچ میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ زندگی کے آخر میں برپا ہونے والے بحران سے گزر رہے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے اچانک اپنی بیگم کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا، خصوصاً ایسی صورت میں کہ ان کی تمام اولاد شادی شدہ تھی اور وہ پندرہ بچوں کے نانا دادا بن چکے تھے۔ میں ان کی یہ دلیل قبول نہ کر سکی کہ انھوں نے ساٹھ برس میں صرف ایک دفعہ ردعمل ظاہر کیا ہے۔ کہنے لگے کہ اگر انھیں صرف پانچ برس اور جینا ہے تو وہ یہ مدت ہنسی خوشی گزارنے کو ترجیح دیں گے۔ "تم لوگ چاہتے ہو کہ میں اپنا ایمج بنائے رکھنے کی خاطر ایک جھوٹ کو جیے جاؤں۔ میرے لیے اپنی زندگی زیادہ اہم ہے۔ یہ اہم نہیں کہ تم میرے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہو۔"

بظاہر والد صاحب نے اس دباؤ میں آ کر امی کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ اگر وہ الگ ہو گئے تو بیٹیوں کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ زرمینہ اور عدیلہ دونوں کی شادیاں والدین کی پسند سے ہوئی تھیں۔ دونوں مشہور جاگیردار خاندانوں میں بیاہی گئی تھیں۔

ہم نے سوچا کہ والد صاحب نے بہت خود غرضی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو ایسی مشکل میں ڈال دیا جہاں ان کا اس لگاوٹ بازی کے ذکر سے شرمندہ ہونا لازمی تھا۔ امی انھیں معاف نہ کر سکیں۔

اس بہت ہی اجیرن سفر کا واحد مثبت پہلو عدیلہ تھی۔ ہمارے تعلقات میں تبدیلی آ گئی۔ مجھے اس کی صورت میں وہ چھوٹی بہن مل گئی جس کی میں ہمیشہ آس لگائے رہتی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی۔ اس نے بتایا کہ وہ مجھ سے اتنی ہی قریب ہونا چاہتی ہے جتنی زرمینہ اور مینو ہیں۔ وہ میرے ساتھ لاڈ کرتی۔ چاہتی کہ میں زیادہ دلکش نظر آؤں۔ اسے میرا نیا ایمج ناپسند تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے اپنے "خوبصورت" لباس کیوں تہ کر کے رکھ دیے ہیں اور سفید سوتی کپڑوں اور چاندی کے زیورات پر اکتفا کیوں کرتی ہوں۔ اس نے سفید رنگ کے بارے میں میری سوچ کو بدلنا چاہا۔ مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ضد کرتی رہی کہ میں چہرے پر سرخی اور پاؤڈر لگایا کروں اور ناخنوں کو پینٹ کرتی رہوں۔ عدیلہ مجھے منانے کی کوشش کر رہی تھی۔ منانے کا اور کوئی طریقہ اسے آتا نہ تھا۔

مصطفےٰ کے ساتھ اس کا رویہ بہنوں کی سی محبت والا تھا۔ یہ رویہ واضح تھا۔ وہ

مصطفیٰ سے دُور دُور رہتی اور یہ فاصلہ بڑے لطیف انداز سے قائم رکھا جاتا۔

میں بڑے چین سے رہ رہی تھی۔ میرا خاندان مجھے واپس مل گیا تھا۔ میرے خاندان نے مجھے میری شرائط پر واپس قبول کیا تھا۔ میں ایک مختلف حیثیت میں لوٹی تھی۔ اب میں کوئی کیڑا مکوڑا نہ تھی جو رینگتا پھر رہا ہو اور کچلا جانے والا ہو۔ انہوں نے مجھے تہمینہ کھر کے روپ میں دیکھا۔ ایسی عورت کے روپ میں جو کامیاب تھی۔ جس نے اپنے شوہر کے لیے ایک ایسی مسلسل جنگ لڑی تھی جس میں ذراسی بھی رو رعایت نہ برتی گئی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ میں اس کی سیاسی زندگی میں حصہ لے رہی ہوں۔ میرا اعتماد امتحان میں پورا اترا تھا۔ یہ اعتماد میرے اندر سے پھوٹا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کون ہوں، مجھے معلوم تھا میں کتنی مضبوط ہوں۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ میں اپنی شناخت رکھتی ہوں۔ اسے معلوم تھا کہ میں اپنا پتہ چلانے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ میں جو کچھ ہوں اسے تحسین کی نظر سے دیکھتی ہوں، اپنا احترام آپ کرتی ہوں۔ مصطفیٰ بھی مجھے تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا، میرا احترام کرتا تھا۔ اس نے مجھے ڈھیر سارا پیار دیا، عزت دی۔ یہ بات میرے خاندان والوں کے مشاہدے میں آئی۔

گھریلو بحران سے نمٹنے کے بعد ہم سیاسی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے۔ خاندان اور سیاست نے بعد میں یکجا ہو کر آفت ڈھائی تھی۔

جتوئی صاحب انتخابات میں نہ صرف ہار گئے تھے بلکہ سیاسی رہنما کے طور پر ان کی شہرت بھی خاک میں مل چکی تھی۔ نواب شاہ کو روایتی طور پر ان کی محفوظ نشست سمجھا جاتا تھا لیکن اندرونِ سندھ پی پی پی کے حق میں جس لہر نے زور باندھا تھا اس کے سامنے جتوئی صاحب کے قدم اکھڑ گئے۔ مصطفیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پرانے دوست اور ساتھی کو سہارا دے گا۔

ہم لاہور واپس پہنچے اور مصطفیٰ نے میاں نواز شریف کے ساتھ گفت و شنید کا آغاز کیا۔ پہلی ملاقات کے بعد مصطفیٰ نے وزیر اعلیٰ کے بارے میں اپنے تاثرات میرے سامنے بیان کیے۔ "میاں صاحب بہت نروس تھے۔ میری موجودگی سے ان پر گھبراہٹ طاری تھی۔ انہوں نے مجھے بہت کچھ دینے دلانے کی پیشکش کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں آئی جے آئی کی حمایت کروں۔ انہیں خدشہ ہے کہ میں پی پی پی میں شامل ہو جاؤں گا۔ لیکن وہ مجھے دے ہی کیا سکتے ہیں؟ میں صرف ایک ہی عہدے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور وہ وزیر اعلیٰ کا عہدہ ہے۔ یہ میاں صاحب کو بھی پتہ ہے۔"

پاکستان کے صدر کے لیے انتخابات ہو رہے تھے۔ غلام اسحاق خاں اور نوابزادہ نصر اللہ خاں دونوں امیدوار تھے۔ میں سمجھتی تھی کہ مصطفیٰ اپنا ووٹ ثانی الذکر کو دے گا۔

نوابزادہ ہمارے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے رہے تھے اور کھرے جمہوریت پسند تھے۔ مصطفیٰ نے کوئی واضح جواب نہ دیا۔ ووٹ دینے چلا گیا۔ واپس آیا تو میں نے پوچھا کہ کسے ووٹ دے کر آئے ہو۔ کہنے لگا کہ نوابزادہ کی حمایت کی ہے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ غلام اسحاق خاں کا فون آیا۔ مصطفیٰ نے اسے ووٹ دیا تھا اور وہ شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ مصطفیٰ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن زیادہ بری بات یہ کہ اس نے سمجھوتہ کرنے کی خاطر اپنے اصولوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس کی سیاسی بصیرت پر مجھے جو اعتماد تھا اس میں یہ پہلا ڈیکا پڑا۔

مصطفیٰ کو قومی اسمبلی کی ان دو نشستوں میں سے، جو اس نے جیتی تھیں، ایک خالی کرنی تھی۔ ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔ ہم مصطفیٰ کے گاؤں واپس چلے گئے۔ مصطفیٰ نے فیصلہ کیا کہ کوٹ ادو سے جتوئی صاحب امیدوار ہوں گے۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب کو فون کر کے اپنے فیصلے سے مطلع کیا اور حیرت زدہ جتوئی صاحب کو بتایا کہ وہ پنجاب سے ایک سندھی کو پارلیمنٹ میں بھجوا کر ہی دم لے گا۔ اس نے کہا کہ پی پی پی کو لگام دینے کے جو منصوبے انہوں نے بنائے ہیں ان کی تکمیل کے لیے پارلیمنٹ میں جتوئی صاحب کی موجودگی اشد ضروری ہے۔ مصطفیٰ نے پی پی پی میں شامل ہونے کے خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ اسے اس "ذراسی چھوکری" پر کوئی اعتماد نہ تھا جو صرف خاندانی نام کے بل بوتے پر ملک کی وزیر اعظم بن گئی تھی۔ مصطفیٰ ٹیلی وژن پر بے نظیر کی پہلی تقریر سنتا اور ہنستا رہا تھا۔ "یہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ پھسپھسے انداز میں سامنے آئی ہے اور متوالی وزیر اعظم کے لیے کسی قسم کا جذبہ ابھارنے میں ناکام رہی ہے۔"

اس نے آئی جے آئی کی طرف جھکنا شروع کر دیا تھا۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ اس دفعہ زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ جتوئی صاحب قطعی طور پر باہر کے آدمی تھے۔ اسے اپنے عوام کو پوری طرح صف بند کر کے میدان میں لانا پڑے گا تاکہ وہ اس کے دوست کو ووٹ دیں۔ یہ اس کی عزت کا سوال تھا۔

اس مرحلے پر میں مصطفیٰ کی سیاست کے بارے میں غیر یقینی پن کا شکار تھی۔ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ کیا میں اور کیا میرے سیاسی نقطۂ ہائے نظر، دونوں اسے زہر لگنے لگے تھے۔ جب بھی کوئی اخبار والا اس سے میرے متعلق یا سیاست میں میرے مستقبل کے کردار کے بارے میں سوال کرتا تو وہ کسمسانے لگتا اور بات ٹال دیتا۔ "ڈان" سے وابستہ انیس مرزا نے اس کے پاس آ کر میرے اس کردار کو سراہا جو میں نے اسے رہا کرانے کے ضمن میں ادا کیا تھا۔ صاف نظر آیا کہ مصطفیٰ یہ سن کر چڑ گیا ہے۔ اسے بالکل پسند نہ تھا کہ اس کا اپنی بیوی سے موازنہ کیا جائے۔ اگرچہ میری طرف

اسے کوئی خطرہ نہ ہو سکتا تھا پھر بھی یہ مسابقت اس کی برداشت سے باہر تھی۔ میں پس منظر کے سایوں تک محدود رہ کر خاصی مطمئن تھی۔

مصطفےٰ کی کسی پریس کانفرنس کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ "آپ کی بیگم کو بات کرنے کا فن آتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کی ایک پریس کانفرنس میں موجود تھا۔ مسٹر کھر، وہ آپ سے بدرجہا بہتر کانفرنس کرتی ہے۔" اگر صرف نگاہوں نگاہوں میں کسی کو ملک بدر کیا جا سکتا تو یہ غیر ملکی صحافی پہلے دستیاب طیارے پر اس ملک سے دفع ہو چکا ہوتا۔

اس نے اپنا یہ وعدہ کبھی پورا نہ کیا کہ وہ پریس کو فخریہ انداز میں بتائے گا کہ اسے جلاوطنی سے واپس میں لائی تھی۔ جو میں نے کیا تھا وہ اس کے نزدیک کسی شمار قطار میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں رفتہ رفتہ ملک کے حافظے سے محو ہو جاؤں۔ میرے ذکر یا میرے کارنامے کے ذکر پر وہ جھلا اٹھتا۔ کارکن بھی محسوس کر رہے تھے کہ مصطفےٰ رخ بدل رہا ہے، کسی اور سمت چل نکلا ہے۔

میاں ساجد، چوہدری حنیف اور چوہدری مختار جیسے لوگوں کو فراموش کر دیا گیا۔ مصطفےٰ کے کیمپ میں نئے چہرے، نرے موقع پرست، چلے آ رہے تھے۔ ہم سب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ہمارے حصے میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں آیا۔

جتوئی صاحب کے انتخاب نے میرے ذہن میں کئی سوالوں کو جنم دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دباؤ ڈالنے کی ایک چال ہے۔ مقصد یہ ہے کہ پی پی پی کو سکھ کا سانس نہ لینے دیا جائے۔ یہ پی پی پی کے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کے مترادف بھی تھا کیونکہ پی پی پی نے اس کے ساتھ گھٹیا سلوک کیا تھا۔ وہ سگنل بھیج رہا تھا۔ میں، مصطفےٰ کھر، یہ اہلیت رکھتا ہوں کہ کسی سندھی کو پنجاب سے الیکشن جتوا دوں۔ محترمہ بھٹو، میں جتوئی صاحب کو تمہارے کارگر متبادل کے طور پر پارلیمنٹ میں بھیج رہا ہوں۔ کھر جتوئی کی یکجائی تمہارے حق میں مہلک ثابت ہو گی۔

سیاسی سطح پر یہ سب کچھ خاصا بامعنی تھا۔ لیکن آئی جے آئی کے ساتھ پینگ بڑھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مصطفےٰ کو میاں نواز شریف کی قیادت پر یقین نہ تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ دباؤ ڈالنے کے لیے کوئی ایسی چال چلنا غلط ہے جس کا حساب آئیڈیالوجی سے اپنی پکی وابستگی ختم کر کے چکانا پڑے۔ ایسی پارٹی میں شامل ہونا جس پر آپ کو یقین ہی نہ ہو موقع پرستی ہے۔

میرے خیال میں مصطفےٰ بالغ نظر اور سنجیدہ سیاست دان تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بالآخر وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟ کیا وہ کسی طاقتور اپوزیشن پر پہنچنے

کے بعد پی پی پی میں شامل ہونا چاہتا ہے؟ کیا وہ جتوئی صاحب پر احسان کر رہا ہے؟ یا آئی جے آئی کو مضبوط بنانا مقصود ہے تاکہ پارٹی کے پاس اسمبلی میں ایک طاقتور اپوزیشن رہنما ہو؟ بعد میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ مصطفےٰ اپنے تینوں مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ لیکن محض اتفاقاً۔

اس وقت مصطفےٰ کے ذہن پر ابتری چھائی ہوئی تھی۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا اس کے تمام پہلوؤں پر ابھی اس نے غور نہ کیا تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ وہ کسی نرم دل کے تحت جتوئی صاحب کا گاڈ فادر نہیں بنا ہوا۔ وہ اپنے حریفوں کو الجھن میں ڈالنے اور گڑبڑانے کے لیے ایسا کھیل کھیلنے میں مشغول تھا جس کا کوئی قاعدہ قانون نہ ہو۔ اس عمل کے دوران وہ خود بھی زیادہ سے زیادہ بدحواس ہوتا گیا۔ میں سمجھ گئی کہ مصطفےٰ کی سیاست سے الگ ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔

جیل سے رہا ہونے کے فوراً بعد مصطفےٰ اصرار کرتا رہتا تھا کہ سیاسی طور پر جو شہرت وہ کمائے گا اس میں میرا بھی حصہ ہو گا۔ جب وہ پریس سے باتیں یا لوگوں سے خطاب کرتا تو مجھے بلا کر اپنے ساتھ بٹھاتا۔ لیکن میں اس کی بے آرامی محسوس کر سکتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میری موجودگی میں اسے کھل کر بات کرنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ میں نے طے کیا کہ اس کے معاملات میں دخل نہ دوں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ مصطفےٰ بھوٹے بازی پر اتر آیا ہے۔ مجھے اس کی کمزوریاں نظر آنے لگی تھیں۔ جہاں تک میں دیکھ سکتی تھی اس کی شخصیت کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہو چکا تھا اور اس بات کا اسے خود بھی علم تھا۔ جب میں اس کے ساتھ ہوتی تو وہ پُراعتماد نظر نہ آتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پر سے میرا یقین اٹھ چکا ہے۔

اسے موقع پرستی کی جو لت پڑ گئی تھی وہ میں چھڑانے کی کوشش کر چکی تھی۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ خود کو دونوں جماعتوں سے دور کر لے۔ میں نے اسے آزادانہ موقف اختیار کرنے کو کہا۔ میں نے کہا کہ وہ ان مسائل پر توجہ مرکوز کرے جو اس کے عہد سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ صحیح صحیح بتائے کہ سیاسی ڈھانچے میں کیا کیا نقائص ہیں اور دونوں جماعتوں کو ان کی بیوقوفیوں سے آگاہ کر کے لتاڑے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ اقتدار کے پیچھے دوڑتے رہنے سے باز آ گیا تو سچا سیاسی مدبر بن کر ابھر سکتا ہے۔ اس کی طاقت اس امر میں مضمر ہو گی کہ لوگ اس کی آراء کو قابلِ اعتبار سمجھیں گے۔ یہ تو اس وقت بھی ظاہر تھا کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتیں ایسی راہ پر چل پڑیں گی جہاں ان کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا۔ مصطفےٰ ثالث کا کردار ادا کر سکتا تھا۔ وہ سچ بول سکتا تھا۔ ایک اخلاقی خلا پیدا ہو چکا تھا جسے وہ خاصی آسانی سے پُر کر سکتا تھا۔ لیکن مصطفےٰ کو سے

پرکاش نرائن یا قوم کا ضمیر بننے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ کردار اس نے غلام اسحاق خان کو ہتھیا لینے دیا۔ مصطفےٰ کھر اقتدار کا بھوکا تھا۔

جتوئی صاحب کی انتخابی مہم کا آغاز ہوا۔ مطلوب کے بھائی رئیس وزیر کی جتوئی خاندان سے رشتے داری تھی اس کا بیٹا جتوئی صاحب کی بھانجی سے بیاہا ہوا تھا۔ عدیلہ ملتان میں تھی اور اسے بڑا شوق تھا کہ کوٹ ادو آئے اور انتخابی مہم بچشم خود دیکھے۔ اسے کبھی انتخاب کی گہما گہمی کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ مطلوب آکر مصطفےٰ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا جو بادشاہ گر کے طور پہ ابھر رہا تھا اور جتوئی صاحب میں طاقتور اپوزیشن رہنما بننے کا زبردست امکان موجود تھا۔ میں نے زرمینہ سے بات کی اور کہا کہ اس دن وہ بھی اپنے شوہر ریاض کے ساتھ آجائے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ عدیلہ اور مطلوب تو آجائیں مگر کوئی اور نہ ہو۔ زرمینہ کہنے لگی کہ اس کے میاں کو اپنی بیوی کو ایسی جگہ بھیجنے کا کوئی اشتیاق نہیں جہاں اتنے بہت سے مرد ہوں۔ میں نے زرمینہ سے کہا کہ ریاض نے جو وجوہ پیش کی ہیں اس کی مدد سے وہ عدیلہ کو بھی آنے سے باز رکھے۔ زرمینہ نے کوشش کی۔ میں چاہتی تھی کہ عدیلہ کو یہ نہ پتہ چلے کہ اس کا آنا مجھے منظور نہیں۔ عدیلہ بضد رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ زرمینہ بھی ساتھ چلے۔ کہنے لگی کہ مرد تو انتخابی مہم پہ نکل جائیں گے اور تینوں بہنوں کو مل بیٹھنے کا وقت مل جائے گا۔ اس نے بڑے لاگن انداز میں گفتگو کی۔ بار بار کہتی رہی کہ مجھ سے صلح صفائی کرنا چاہتی تھی۔ وہ مجھے مطلوب سے اپنی شادی اور مطلوب کے خاندان کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کا آنا سرے سے منظور ہی نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ مصطفےٰ کے خاندان میں بہت زیادہ لوگوں کو ماضی کے بارے میں پتہ ہے، گو اس سلسلے میں کبھی کسی سے بات چیت نہ ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں طرف عشق کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ میں محسوس کرتی تھی کہ عدیلہ مطلوب کے ساتھ خوش ہے جو اس کی ناز برداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اس کے باوجود------

مجھے ہار ماننی ہی پڑی۔ دوپہر کو عدیلہ آپہنچی۔ اس نے شفون پہن رکھی تھی۔ بالوں کو خاص انداز میں سنوارا گیا تھا۔ اس نے تازہ ترین فیشنی وبا کی تقلید میں رنگین کنٹیکٹ لینز لگا رکھے تھے۔ اس کا حلیہ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں نے کوشش کی کہ میری حیرت ظاہر نہ ہونے پائے۔

مطلوب انتخابی مہم میں مصروف ہوگیا۔ شام ہونے پہ مرد سیاست میں غرق لوٹتے اور ہم سب مل کر کھانا کھاتے۔

عدیلہ روز صبح سویرے آموجود ہوتی۔ وہ ہمارے بیڈروم میں آکر بستر پہ بیٹھ جاتی

اور مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ مصطفےٰ بھی کمرے میں موجود اپنی یوگا کی ورزش کر رہا ہوتا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ میں نے بھول جانے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن حال جو تھا وہ دھیرے دھیرے ماضی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

ہم نے اپنے اس حلقۂ بے تکلف کو وسعت دی۔ مصطفےٰ کے خاندان کی دوسری عورتیں بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتیں اور ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنے اپنے تجربات بیان کرتے۔ بالعموم شادیوں اور بچوں اور گھریلو بحرانوں کا ذکر کرتے کرتے خوب مزے سے وقت گزر جاتا۔

میں نے دوبارہ مصوری میں پناہ لینی شروع کر دی۔ فن میری ذہنی حالت کا آئینہ دار تھا۔ میں تصویر بناتی رہی۔ کینوس پہ ایک عورت کی شبیہ نے ابھرنا شروع کیا۔ وہ جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مرکز سے دور ہٹ گئی تھی اور خود کو سایوں میں گم کر چکی تھی۔ میں مکمل تصویر کو تکتی رہی۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اپنی ہی تصویر بنائی ہے۔ عنوان تھا: "اندھیروں میں"۔

مردوں کے آنے سے ذرا پہلے عدیلہ غائب ہو جاتی۔ جب دوبارہ سامنے آتی تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوتا۔ بال بنے ہوئے، رنگین کنٹیکٹ لینز زیب چشم، چہرہ سرخی پاؤڈر سے آراستہ۔ بن سنور کر شام باہر گزارنے کے لیے تیار۔ میں غسل خانے میں جاتی، منہ ہاتھ دھوتی اور اپنی سی شکل صورت لے کر باہر آجاتی۔ میں عدیلہ سے کہتی کہ اتنے اہتمام سے کپڑے پہننا اور میک اپ کرنا ضروری ہے کیونکہ رات کے کھانے پہ خاندان کے گنے چنے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ اسے کپڑے بدلنے اور بننے سنورنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ "ڈنر پہ بڑھیا لباس پہننا اچھا رہتا ہے۔ تم بھی ایسا ہی کیا کرو۔"

رفتہ رفتہ میں بہتر نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ عدیلہ سب سے نمایاں نظر آئے۔ یہ بہت تھکا دینے والا عمل تھا۔

صبح کو ہم اپنی اپنی زندگی کے بارے میں باتیں کرتے۔ ایک دفعہ ہمارے درمیان جو بات چیت ہوئی میں نے اس کے بارے میں عدیلہ سے خاص طور پہ کہا کہ وہ اسے کسی کے آگے، خصوصاً مصطفےٰ کے سامنے، بالکل نہ دہرائے۔ جب مرد واپس آئے تو میں غسل خانے میں مختلف نظر آنے کے لیے جان مار رہی تھی۔ مصطفےٰ نے روا روی میں عدیلہ سے پوچھا کہ دن بھر کیا باتیں ہوتی رہی ہیں۔ عدیلہ نے بڑے اطمینان سے وہ سب کچھ بک دیا جو میں نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا تھا۔

مصطفےٰ نے بہت سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور بعد میں مجھ سے کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ عدیلہ ہم دونوں میں فساد ڈلوانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم آپس

میں لڑ پڑیں۔ دیکھو ہمیں لڑنا نہ چاہیے۔"

میں نے دیکھا کہ عدیلہ میں تبدیلی آنے لگی ہے۔ مجھے یہ بھی نظر آیا کہ مصطفےٰ کا رویہ بھی بدلنے لگا ہے۔ مجھے گھبراہٹ اور بے چینی محسوس ہونے لگی۔ پھر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ مجھے پتہ تھا۔ میں ٹھیک ٹھیک انگلی نہیں رکھ سکتی تھی کہ بات کیا ہے۔ یہ بہت ہی گریزاں سا کوئی احساس تھا مگر تھا ضرور۔ اسے میری سہیلی شاہدہ بھی، جو ساجد کی بھاوج تھی، محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

عدیلہ پھر اپنی چال بازیوں پر اتر آئی۔ جب ہم مطلوب کو کہلواتے کہ آ کر ہمارے ساتھ لنچ کھائے تو عدیلہ باہر جا کر ہمارے پیام کو راستے میں روک لیتی۔ وہ ملازمہ سے کہتی تھی کہ پیغام نہ پہنچائے بلکہ تھوڑی دیر بعد آ کر کہہ دے کہ وہ مطلوب صاحب کو تلاش نہیں کر سکی۔ میری ملازمہ کو یہ ساری باتیں بہت عجیب معلوم ہوئیں۔ اتنی عجیب کہ اس نے مجھے بتا دیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے مصطفےٰ اور عدیلہ میں گٹھ جوڑ ہو گیا! وہ ایک ٹیم، ایک پارٹی بن چکے تھے۔ مصطفےٰ نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور میرا سفید لباس، جسے وہ پہلے اس قدر تحسین کی نظر سے دیکھتا رہا تھا، یکایک اس کے لطیفوں کا نشانہ بننے لگا۔

انتخاب کے دن عدیلہ کا دل چاہا کہ پولنگ سٹیشنوں کی سیر کی جائے۔ مجھے کوئی شوق نہ تھا۔ مطلوب بھی آمادہ نہ تھا۔ عدیلہ اور مصطفےٰ اصرار کرنے لگے کہ ضرور جانا چاہیے۔ جانے کیوں پولنگ بوتھوں کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی۔ عدیلہ کسی لاڈ پیار سے بگڑی بچی کی سی حرکتیں کرنے لگی۔ "میری خاطر چلے چلیں۔ پلیز اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ میں گھما گھمی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

مطلوب نے اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہار مان لی۔

مصطفےٰ کار چلا رہا تھا۔ مطلوب اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں بیویاں پچھلی سیٹ پر تھیں۔ تمام پولنگ سٹیشنوں پر مجھے ایک مختلف مصطفےٰ دیکھنے کو ملا۔ وہ ظاہر یہ کرنا چاہتا تھا جیسے وہ کوئی بڑی شے ہے۔ وہ ایک رول نبھا رہا تھا اور اداکاری کرتے ہوئے بہت زور لگا رہا تھا۔ وہ عدیلہ کی نظر میں جچنے کے لیے اپنی کرشمہ سازی، اپنی مقبولیت، اپنی طاقت، سب کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ یہ تمام حرکتیں کسی نیا بتی اداکار کی سی تھیں جو ڈرامے میں ایک بار موقع ملتے ہی، ایڑی چوٹی کا زور لگا، اپنے تمام کمالات ایک ہی بار دکھا دینے کے لیے مضطرب ہو۔ وہ ضرورت سے زیادہ طاقت صرف کر رہا تھا۔ وہی باتیں، جو فطری انداز میں کر سکتا تھا، پُر تصنع اور گھسی پٹی معلوم ہو رہی تھیں۔ عدیلہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ اقتدار کے سحر کے زیر اثر تھی۔ اسے یہ گلیمر، یہ جوش و خروش چاہیے

تھا۔ یہ سب کچھ مصطفےٰ اسے بہم پہنچا سکتا تھا۔ اگر صرف ------ وہ میری طرف اپنی نقلی آنکھوں، اپنے رنگین کنٹیکٹ لینزوں سے دیکھ رہی تھی۔

واپس ہوئے تو لگا کہ راستہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا۔ میں اپنے خول میں واپس چلی گئی تھی۔ میں کسی سے بات نہ کرنا چاہتی تھی۔

مصطفےٰ نے دیکھ لیا کہ میرا موڈ بدل گیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں منہ تھتھا کر اس رومان میں کھنڈت ڈال دوں جس کی ہوا کچھ کچھ بندھنے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے اس بات کا پتہ ہی نہ چلے۔ اس نے جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم ہمیشہ گندے موڈ میں نظر آتی ہو۔ ہر وقت جھینکتی اور شکایت کرتی رہتی ہو۔ کبھی خوش تو ہوتیں ہی نہیں۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "بات یہ نہیں ہے۔ جس طرح کی تم حرکتیں کر رہے تھے وہ مجھے اچھی نہیں لگیں۔ میں احمق نہیں ہوں۔ میں بتا سکتی ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے میری طرف دیکھا اور کمرے سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنا حلیہ درست کرنے اندر گئی۔ عدیلہ نے ساٹن کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اگر اس کی آنکھوں میں کوئی احساسِ جرم تھا تو اسے رنگین کنٹیکٹ لینزوں نے چھپا لیا تھا۔ وہ اندر آئی۔ مصطفےٰ نے مجھ سے کہا کہ باہر آ جاؤ۔ کمرے میں بہت زیادہ لوگ جمع تھے۔ میں باہر نہ آنا چاہتی تھی۔ میں رو رہی تھی۔ میں نے مصطفےٰ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ کسی اور کمرے میں جا کر انتظار کریں۔ وہ مصر تھا کہ نہیں، وہ کمرے ہی میں رہیں گے۔ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے حربے آزمائے جا رہے تھے۔ اسے پتہ تھا کہ میں رو رہی ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں رونا دھونا بند کر دوں۔ اسے پتہ تھا کہ اگر میں لوگوں کے درمیان آؤں گی تو میرا رونا دھونا خود ہی بند ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ مجھے کسی سے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ ہمارے کمرے میں نہ آئے۔ عدیلہ بول اٹھی۔ "کیوں نہیں؟ یہ اس کا اپنا بیڈروم ہے۔ (دیدہ و دانستہ وقفہ)۔ نہیں ہے کیا؟"

جس انداز سے یہ بات کہی گئی اس نے سب کچھ واضح کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی تماشا دکھا رہی ہو۔ جیسے نخرے کر رہی ہو۔ میں نے ان دونوں کی آنکھوں میں چمک دیکھی۔ میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔

مجھے ان تمام خواتین کے پاس بیٹھ کر شائستہ گفتگو میں حصہ لینا پڑا، جب کہ حالت یہ تھی کہ میرے دل و دماغ میں ایک طوفان پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ گھنٹوں منحوس گھٹائیں۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ گھٹائیں مجھے ایذا پہنچائیں گی۔ مجھے پتہ تھا کہ میں بھیگے بغیر گھر نہ پہنچ سکوں گی۔ ہر بار جب میں دروازے تک پہنچنے والی ہوتی کوئی میرے گھر کو ذرا

اور آگے کھسکا دیتا۔

یہ سب کچھ پل بھر میں ہو گیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے دور نہ رکھا جا سکتا تھا۔ ان کی روحوں نے پھر ہم بستری شروع کر دی تھی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے عدیلہ کو آنے کی اجازت ہی نہ دینی چاہیے تھی۔ لیکن ----- پھر تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مجھے اسے معاف ہی نہ کرنا چاہیے تھا۔

خواتین، میرے ذہنی خلفشار سے بے خبر، میرے اردگرد بیٹھی تھیں۔ مصطفیٰ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ "بچ بچ، تہمینہ، تم تو سفید لباس میں کوئی راہبہ لگ رہی ہو۔" وہ مجھے طعنے دے رہا تھا۔ "راہبہ" کے لفظ کا استعمال جنسی تلازمہ بھی رکھتا تھا۔ وہ عدیلہ کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ جہاں تک تہمینہ کا تعلق ہے میں مردِ مجرد ہوں۔ عدیلہ نے تمسخر آمیز انداز میں میرا دفاع کیا۔ "نہیں، راہبہ تو نہیں لگ رہی۔" اصل کھیل لہجے کا تھا۔ یہ مصطفیٰ کے لب و لہجے سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھا۔

خواتین رخصت ہوئیں۔ مصطفیٰ کے اور میرے درمیان بڑی خوفناک تو تو میں میں ہوئی۔ جس کے آخر میں میں رو پڑی۔ عین اسی وقت ہم نے سنا کہ جتوئی صاحب نے انتخاب جیت لیا ہے۔ بینڈ نے دھن چھیڑی۔ ڈھولکی بجنے لگی۔ نعرے بلند ہوئے۔ جشن کا سا سماں نظر آنے لگا۔ جیت کے وہی تمام لوازم۔ میں رو رہی تھی۔ یہ عجیب بات تھی۔ جانے کیوں [illegible]توئی صاحب کے لیے کامیاب یا خوش ہونے کا موقع ہمیشہ عین اس وقت آتا تھا جب میں کسی روح خراش سانحے سے دوچار ہو چکی ہوتی تھی۔ مجھے شیریں کا بچہ اور اپنے آنسو یاد آ گئے۔ اب یہ واقعہ ہو گیا۔ 6 اگست 1990ء کو جب جتوئی صاحب نگران وزیر اعظم کا حلف اٹھا رہے تھے تو میں ان کی خاطر بہت خوش تھی۔ پھر ٹی وی کیمرے نے آہستہ آہستہ حرکت میں آ کر ان کی نئی کابینہ کے چہرے دکھانے شروع کیے۔ کیمرا منحوس انداز میں ایک چہرے پر ذرا دیر کو رکا۔ یہ مصطفیٰ کا چہرا تھا۔ میں دم بخود رہ گئی۔ کہتے ہیں کہ یہی حال جتوئی صاحب کا ہوا تھا۔ مصطفیٰ پھر میری مسرت کا رنگ پھیکا کرنے اور خوشی کو مسخ کرنے کے لیے آ دھمکا تھا۔

ہمارا لڑائی جھگڑا اکیلے میں نہیں ہوا۔ عدیلہ ہمارے پاس ٹھہر کر سب کچھ سنتی اور دیکھتی رہی۔ مصطفیٰ نے اسے سنانے کے لیے کہا۔ "تہمینہ، میں تمہارے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتا۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی۔ تمہارے ساتھ رہنا میرے لیے دوبھر ہو چکا ہے۔" یہ مصطفیٰ کا اصل رنگ نہ تھا۔ یہ باتیں وہ مجھ سے نہیں کر رہا تھا۔ مقصد عدیلہ کو کچھ سنانا تھا۔ اس تک یہ پیغام پہنچایا جا رہا تھا کہ مصطفیٰ مفاہمت کے لیے تیار ہے۔ اس کی شادی ختم ہونے والی ہے۔ عدیلہ نے پیغام وصول کر لیا۔ مصطفیٰ چلا گیا۔

جب وہ لوٹا تو اور ہی مصطفیٰ تھا۔ وہ پھر منت سماجت کرنے، رونے اور گڑگڑانے لگا۔ پنڈولم جھول کر اب دوسری طرف چلا گیا تھا۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اب کبھی غلط رویہ اختیار نہ کروں گا۔ یہ لمحہ تمہارا تھا۔ تم نہ ہوتیں تو جو کچھ ہوا یہ بھی نہ ہونے پاتا۔ جتوئی صاحب کامیاب نہ ہو سکتے۔ یہ تمہاری فتح ہے۔ میں ہر بات کے لیے تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں گڑبڑا گیا تھا۔ شاید عدیلہ کی موجودگی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ شاید ماضی کی نحوست دوبارہ ہمارے ذہنوں میں حلول کر گئی ہو۔ اس سے ہم دونوں کے دل میں پرانی ہولناکی کی یاد تازہ ہو گئی۔ آؤ اس عورت سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ یہ فتنہ پرداز عورت ہے۔ آؤ ہم اپنی زندگیوں کو ازسرِ نو شروع کریں۔" میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنی شادی کو بچانا چاہیے۔

میں نے عدیلہ اور مطلوب کو اس رات رخصت ہونے سے روک لیا۔ میں چاہتی تھی کہ عدیلہ دیکھ لے کہ مصطفیٰ اور مجھ میں صلح ہو گئی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ وہ ٹھہر گئے۔ ہم فتح کا جشن منانے غلام ربانی کے گھر گئے۔ جتوئی صاحب ساٹھ ہزار ووٹوں سے جیتے تھے۔ یہ مصطفیٰ کی طاقت اور عوام پر اس کی گرفت کا کھلا ثبوت تھا۔ اس نے عوام سے کہہ دیا تھا کہ اسے مایوس نہ کریں۔ جتوئی صاحب اس کے مہمان ہیں۔ انہیں اپنی نشست بالکل اتنے ہی ووٹ لے کر جیتنی چاہیے جتنے مصطفیٰ کو ملے تھے۔ عوام نے اس امر کو یقینی بنا کر چھوڑا۔ پنجاب کی مہمان نوازی پر حرف کیسے آنے دیا جا سکتا تھا۔

اگلے روز ہم سب کوٹ ادو سے ملتان روانہ ہوئے۔ مصطفیٰ ڈرائیو کر رہا تھا۔ جتوئی صاحب اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مطلوب، عدیلہ اور میں پیچھے تھے۔ مصطفیٰ کی کوٹ ادو میں بعض نہایت اہم مصروفیات تھیں۔ اسے عوام کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ اوپر سے وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ہمارے ساتھ رہے۔ اس ذہنی کشاکش سے اس کی توجہ دونیم ہو گئی۔ ملتان کی طرف یہ ڈرائیو عجیب و غریب ثابت ہوئی۔ عدیلہ کو چھوڑ کر ہم سب، مع جتوئی صاحب، مصطفیٰ پر جھنجلاتے رہے۔ مصطفیٰ زیرِ لب بڑبڑاتا رہا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ وہ ڈرائیو کرتا رہتا اور پھر کار روک لیتا۔ "مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں یا پیچھے رک جاؤں؟ میرا ٹھہرنا اہم ہے۔ مجھے کچھ کام ہیں۔ لیکن ----- نہیں، آئیے، چلتے ہی ہیں۔ میرا خیال ہے میں آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔"

صاف ظاہر تھا کہ مصطفیٰ عدیلہ کے ساتھ ہونے کا یہ موقع کھونا نہ چاہتا تھا۔ اس کا دل اسے ورغلا رہا تھا۔ سیاست کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی۔ اس کی ترجیحات الٹ پلٹ

ہو چکی تھیں۔

اس نے اپنے بھائی غلام میلادی کھر سے کہا تھا کہ وہ کار میں ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ خیال یہ تھا کہ مصطفیٰ ہمیں ایک خاص مقام تک پہنچا دے گا اور پھر میلادی کے ساتھ کوٹ ادو لوٹ جائے گا۔ ہماری کار میں اس کی جگہ شوفر سنبھال لے گا۔ جب ہم طے شدہ مقام پر پہنچے تو مصطفیٰ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس پر پس و پیش کا ایک اور دورہ پڑا۔ کیا میں واپس چلا جاؤں ؟ کیا میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں؟ جتوئی صاحب کو طیش آگیا۔ "مصطفیٰ، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ سوچ لو تمہیں کیا کرنا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں کوٹ ادو واپس جانا چاہیئے۔ یہ ہمارے لیے اہم ہے۔ کار سے اترو اور واپس چلے جاؤ۔" مصطفیٰ ہچکچایا۔ پھر اتر گیا۔ بادلِ ناخواستہ۔

ملتان روانہ ہونے سے ذرا پہلے مصطفیٰ کے سکرٹری نے مجھے کئی ہوائی ٹکٹ تھما دیے۔ جو ٹکٹ میرے اور مصطفیٰ اور جتوئی صاحب کے لیے تھے ان کی تو تُک سمجھ میں آتی تھی۔ عدیلہ اور مطلوب کے لیے ملتان۔لاہور۔ملتان ٹکٹوں کی کوئی تُک نہ تھی۔ میں نے مطلوب سے پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہو گی۔ میں نے سکرٹری سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے بتایا کہ کھر صاحب نے یہ ٹکٹ لانے کو کہا تھا۔ مجھے شرمندگی ہوئی کہ میرے شوہر نے میری بہن اور اس کے شوہر کے لیے ہوائی سفر کا بندوبست محض اس واسطے کیا ہے کہ اگر وہ اچانک ہمارے ساتھ لاہور چلنے کا فیصلہ کر لیں تو کوئی دقت نہ ہو۔ مصطفیٰ نے اس سارے معاملے کو بیچارے سکرٹری کی ضرورت سے زیادہ مستعدی کا نتیجہ قرار دیا۔

ہم ملتان پہنچے۔ عدیلہ کے بچے کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ وہ اپنے گھر اور میں شاہدہ کے گھر چلی گئی۔ اسی شام عدیلہ نے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ وہ اور مطلوب آ رہے ہیں۔ میں اس سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ میں نے بچے کا پوچھا۔ کہنے لگی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ آ رہے تھے۔

مصطفیٰ اپنا کام ختم کر چکا تھا اور وہ بھی ملتان آ رہا تھا۔

میں نے زرمینہ کو فون کیا اور کہا کہ وہ کسی طرح عدیلہ کو سمجھائے کہ بچے کی بیماری کی وجہ سے اسے ہماری طرف نہ آنا چاہیے۔ میں بے طرح خوف زدہ تھی کہ کہیں عدیلہ کو یہ پتہ نہ چل جائے کہ میں اس کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ اسے روکنا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ آ گئی۔ مطلوب ساتھ تھا۔ عدیلہ نے زمردی ساٹن کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس کے گلے میں بھی زمردوں کا ہار تھا اور کان کی بالیاں بھی زمرد کی تھیں۔ رنگین کنٹیکٹ لینز بھی حسب معمول اپنی جگہ پر تھے۔ صاف عیاں تھا کہ

خوش لباسی کا کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ جب مصطفیٰ کی نظر اس پر پڑے گی تو وہ خوش ہو گا، اگرچہ اس موقع پر بظاہر اسے پتہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ مصطفیٰ کی آمد متوقع ہے۔ اس کی پوشاک اور زینت نے راز فاش کر دیا۔

مصطفیٰ واپس آیا۔ اس پر عجیب موڈ طاری تھا۔ اس نے مجھ سے جھگڑا شروع کر دیا۔ وہ ایک بار پھر دیکھنے والوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اوچھی حرکتیں کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک عورت کے سوا کوئی تماشائی نہ تھا۔ وہ عدیلہ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے ناخوش ہے۔ اس کی منت کر رہا تھا کہ اپنا سلگتا ہوا معاشقہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ مصطفیٰ کا یہ انداز شاہدہ اور اس کے بیٹے تک سے چھپا نہ رہ سکا۔

مصطفیٰ عدیلہ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی تعریف کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ عدیلہ کمرے میں آئی۔ کہنے لگی کہ باہر کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ ملاقاتی کو اندر بھیج دو۔ عدیلہ بولی کہ اس نے یہی کہا تھا کہ اندر چلی جاؤ لیکن وہ بضد ہے کہ مجھ سے باہر ہی ملے گی۔ عدیلہ چاہتی تھی میں کمرے سے چلی جاؤں۔ میں ان دونوں کو تنہا نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کے باوجود میں یہ بھی نہ چاہتی تھی کہ اپنے خدشات کو صاف ظاہر کر دوں۔ میں اسی دبدھے میں گرفتار باہر پہنچی میں نے شاہدہ کو کمرے میں بھیج دیا۔ وہ دو منٹ میں ان کے پاس پہنچ گئی تاکہ درمیان میں حائل ہو سکے۔ لیکن دو منٹ ہی میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان دو منٹوں میں کوئی بات ہو گئی۔ کچھ کہہ دیا گیا۔ شاہدہ کو پتہ چل گیا۔ اس کے کمرے میں قدم رکھتے ہی یک لخت خاموشی چھا گئی۔

میرے اور مصطفیٰ کے درمیان سرد جنگ چھڑ چکی تھی۔ لاہور واپس جاتے ہوئے ہوائی سفر کے دوران، ان دو منٹوں سے حوصلہ پا کر جو اس نے عدیلہ کے ساتھ اکیلے میں گزارے تھے، مصطفیٰ ناشاد و نامراد شوہر میں تبدیل ہو گیا۔ "تم پھر مجھ پر شک کر رہی ہو۔ میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ امن چین سے رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے الٹ کے جواب دیا۔ "جب تمہاری وجہ سے ضمیر فروشی روح فرسا واقعات پیش آتے رہتے ہیں تو تمہیں امن چین کی زندگی گزارنی کیسے نصیب ہو گی۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں ناخوش ہوں۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ تم مجھے اعتبار کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتے۔ تمہاری ساری حرکتیں مشکوک ہیں۔" اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔ پتہ ہے کل رات کمرے سے تمہارے جانے کے بعد عدیلہ نے کیا کہا تھا؟" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ اس نے کیا کہا تھا۔ "عدیلہ کہہ رہی تھی کہ اگر تہمینہ تمہیں کوئی چیز کھانے کے لیے

دے تو مت کھانا۔ تم مجھے زہر دے دو گی۔"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ جو بات ہم سب نے مذاق میں کہی تھی اسے عدیلہ نے مسخ کر کے پیش کر دیا۔ کوٹ ادو میں ہم سب اپنے شوہروں کے بارے میں بات کر رہے تھے اور تقریباً یہ طے کیا تھا کہ ان سب کو ویلیم کی ایک ایک گولی کھلا دیں گے تاکہ پھر ان کی طرف سے بے فکر ہو کر رات بھر اپنی گپ شپ جاری رکھ سکیں۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ عدیلہ کو علم تھا کہ ہم مذاق کر رہے ہیں۔ وہ خود مذاق میں شامل تھی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ عدیلہ بدلی نہیں تھی۔ وہ میرے میاں کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میری تمام قربانیوں کے باوجود مصطفیٰ کی مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ عدیلہ پھر اپنی پر فریب دلربائیوں کو بروئے کار لا رہی تھی۔ اس بات پر میں بے حد پریشان تھی کہ ہمارے ساتھ کچھ نہیں ہوا اور اس کے باوجود مصطفیٰ پہلے کی طرح آسانی سے چھوٹ کھا جاتا تھا، پہلے کی طرح آسانی سے دام میں آ جاتا تھا۔ مجھے گھن آنے لگی۔ اس نے عدیلہ کو اتنی ڈھیل دے رکھی تھی کہ وہ آسانی سے جو چال چاہے چل سکتی تھی۔ میں اپنی پینٹنگ کے اندھیروں میں اور بھی پیچھے ہٹتی چلی گئی۔

امی کی خستہ دلی میں فرق نہ آیا تھا۔ ہم بیٹیوں نے فیصلہ کیا کہ اس دوسری عورت سے جا کر ملتے ہیں جو والد صاحب کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ زرمینہ اور میں کراچی پہنچے۔ کوٹ ادو میں جو کچھ ہوا تھا اس پر ہم نے روبینہ کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ اس نے تسلیم کیا کہ میرے اندیشے درست ہیں۔ ہم عدیلہ کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے دیر کر دی تھی۔ (ہم نے اس کے نمبر پر فون کیا۔ نمبر مصروف تھا۔ ہم نے مصطفیٰ کو فون کیا۔ اس کا نمبر بھی مصروف تھا۔) دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔ ایک جمع ایک کا مطلب ہے ایک ذلیل جوڑا۔ بالآخر جب میں مصطفیٰ سے بات کرنے میں کامیاب ہوئی تو میں نے بتا دیا کہ مجھے معلوم ہے وہ کس سے بات کر رہا تھا۔ اس کا جرم چھپائے نہ چھپتا تھا۔ اس کی وضاحتوں سے ماضی میں پیش کی جانے والی وضاحتوں کی بساہند آ رہی تھی۔

ہم صبیحہ حسن سے ملنے گئے۔ ہم نے اسے بتانا چاہا کہ وہ ہمارے گھر کو جسے امی نے اتنے جتن سے اور اتنی مدت تک بنائے رکھنے کی سعی کی تھی، بگاڑنے میں لگی ہوئی ہے۔ یہ مشکل ملاقات تھی۔ ہمیں ڈپلومیٹک انداز میں بات کرنی تھی۔ عدیلہ بدتمیزی پر اتر آئی۔ اس نے صبیحہ حسن کو غصہ دلا دیا اور وہ برانگیختہ ہو کر سخت رویہ اپنانے پر مجبور ہو گئی۔

واپس آتے ہوئے ہم نے عدیلہ کی خوب خبر لی۔ ہمیں معلوم تھا کہ عدیلہ کے

ذہن میں ایک پیچ در پیچ منصوبہ ہے۔ اگر والد صاحب امی کو چھوڑ کر چلے گئے تو عدیلہ کو مصطفیٰ سے اپنا معاشقہ دوبارہ شروع کرنے اور میرا گھر اجاڑنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ اپنی وضاحت میں کہے گی کہ وہ تو انتقام لے رہی ہے۔ کہے گی کہ وہ اس خاندان کو جسے والد صاحب چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے تھے، افراتفری کا نشانہ بنا کر والد صاحب کو تباہ کرنے میں مصروف ہے۔ اس نے یہ جواز خوب سوچ سمجھ کر گھڑا تھا۔ یہ اثر انداز ہونے کی ایک چال تھی۔ نشانہ والد صاحب کو بننا تھا۔ میں تو بس اتفاق سے دونوں طرف سے ہونے والی فائرنگ کی زد میں آ گئی تھی۔

میں لاہور واپس آئی۔ ہم عمرہ کرنے چلے گئے۔ جتوئی صاحب اور ان کے بھائی ہمارے ساتھ تھے۔ مصطفیٰ کے بھائی اور ان کے اہل خانہ بھی ہمراہ تھے۔ مجھے یاد ہے میں سارے وقت روتی دھوتی رہی۔ میں نے اللہ سے مدد کی التجا کی تاکہ میں اس چھد بالو سے نکل سکوں۔ کعبہ کا امیج میرے ذہن پر بڑی مضبوطی سے نقش ہے۔ اس کے بعد ہم لندن چلے گئے اور وہاں ہفتے بھر قیام کیا۔ اپنے شوہر سے میرے تعلقات میں سرد مہری آ گئی تھی۔ ہم کھچے کھچے رہے۔

واپسی پر ہمیں خبر ملی کہ نانی اماں بہت بیمار ہیں۔ ان کے بچنے کی امید نہ رہی تھی۔ پھیپھڑے سرطان سے گل گئے تھے۔ اگلے دو مہینے میں نے نانی اماں کے پاس گزارے۔ پورا خاندان ان کے بیٹے سردار اسد حیات کے گھر جمع ہو گیا۔ نانی اماں کی زندگی کے گنتی کے دن رہ گئے تھے۔ خاندان کی جدۂ اعلیٰ مرض میں گھلی جا رہی تھی۔ ہم سب اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے آئے تاکہ ان کی خدمت میں حاضر رہ سکیں۔ میرے والدین بھی وہاں تھے اور روبینہ اور زرمینہ بھی۔ مصطفیٰ بھی موجود تھا اور جلد ہی عدیلہ بھی، مطلوب کے بغیر، آ پہنچی۔

عدیلہ کو موقع محل کی کوئی تمیز نہ تھی یا اگر تھی تو بظاہر کوئی پرواہ نہ تھی۔ ادھر تو نانی اماں کی زندگی دھیرے دھیرے اختتام کو پہنچ رہی تھی، اُدھر اسے نت نئی پوشاکیں پہننے سے فرصت نہ تھی۔ وہ بالوں کو گھونگھریالے بنواتی۔ رنگین کنٹیکٹ لینز لگانا کبھی نہ بھولتی۔ اس نے پورا اہتمام کر رکھا تھا کہ اس کے خوبصورت لباسوں سے میچ کرنے والے باقی تمام لوازم موجود ہوں۔ یہ بھونڈا پن تھا، بے حسی تھی۔ اسی کا نام عدیلہ تھا۔

ایک روز مصطفیٰ نے مجھ سے کہا کہ وہ شام پانچ بجے اسد ماموں کے گھر مجھے لینے آئے گا۔ بعد میں اس نے وقت کی تبدیلی سے مطلع کرنے کے لیے فون کیا۔ اسے دیر ہو جائے گی۔ اہم کام تھا۔ سیاست۔ عدیلہ کسی کو بتائے بغیر نانی اماں کی کار لے کر شام، پانچ بجے گھر سے نکل گئی۔ کار واپس آئی تو عدیلہ اس میں نہ تھی۔ زرمینہ اور میں

نے ڈرائیور کو طلب کیا۔ اس نے بتایا کہ عدیلہ لبرٹی مارکیٹ میں کتابوں کی ایک دکان کے نزدیک اتر گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود ہی واپس آ جائے گی۔ یہ ہمیں بہت عجیب معلوم ہوا۔ ہم بھی جو لاہور میں رہتے ہیں اس طرح بے دھڑک بازار میں نکل جانے کا کبھی سوچتے تک نہیں۔ زرمینہ کے اور میرے پاس اپنے وجدان پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بات کے پیچھے مصطفےٰ کے سوا کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

ہم نے عدیلہ کی نند تسنیم کو فون کیا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ عدیلہ ابھی واپس نہ آئی تھی۔ آخرکار وہ گھر پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد مصطفےٰ بھی آ گیا۔ اس کا سامنا کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں ادھر ادھر کھسک گئی اور جا کر دو لیکسوٹینل کھا لیں۔ والد صاحب کہنے لگے کہ تم ایسی نظر آ رہی ہو جیسے تمھیں کسی نے نشہ آور دوا کھلا دی ہو۔ میں سچ مچ نشے میں تھی۔

نانی اماں نے محسوس کر لیا کہ میرے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے۔ پوچھنے لگیں کہ کیا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ دنیا میں ان کے سوا کوئی نہ تھا جو میرے چہرے پر لکھی عبارت پڑھ سکتا۔ میں اپنے جذبات کو لاکھ احتیاط سے چھپاتی لیکن وہ میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی معمے کی تہ تک پہنچ جاتیں۔ میں انھیں پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ان سے صرف اس قدر کہا کہ "میرے لیے دعا کیجیے۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

وہ بالکل چپ رہیں۔ یکایک ان کے چہرے پر سیاہی مائل زردی کھنڈ گئی۔ وہ زیادہ نحیف اور خوف زدہ نظر آنے لگیں۔ وہ سمجھ گئیں کہ کیا ہوا ہے۔ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوا چاہتی ہے۔ عدیلہ ایک بار پھر اپنا چکر چلا رہی تھی۔ میں نانی اماں کی بیچارگی محسوس کر سکتی تھی۔ انھیں پتہ تھا کہ وہ مرنے والی ہیں۔ انھیں پتہ تھا کہ ان کے رخصت ہونے کے بعد میں بے یارومددگار رہ جاؤں گی۔ اکیلی رہ جاؤں گی۔ وہ دونوں بہیمانہ انداز میں میرے ذہن پر یلغار کریں گے اور میں اپنا بچاؤ نہ کر سکوں گی۔

مجھے پتہ تھا کہ امی عدیلہ کو تحفظ دیں گی۔ راہ راست سے بھٹک جانے والے والد صاحب کے خلاف محاذ آرائی میں انھیں بطور اتحادی اپنی صرف ایک ہی بیٹی پر اعتبار تھا اور وہ عدیلہ تھی۔ مصطفےٰ نانی اماں کی وفات کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ حملے کا آغاز کرے گا اور میں نے سالہا سال کی کوشش کے بعد اپنا جو تشخص پیدا کیا تھا اسے منہدم کرنے پر تل جائے گا۔ وہ مجھے ایسی اعصاب زدہ، سہمی سہمی عورت بنا کر چھوڑے گا جسے ایک بار پھر خود اپنے ہی ذہن سے خوف آنے لگے گا۔ ماضی کے واقعات کا اعادہ کافی ہو

گا۔ ساتھ میں میری بہن اور اہل خاندان میری بنیادوں کو جھٹکے پر جھٹکا دینے میں مصروف ہو جائیں گے اور میں اور بھی جلد دھڑام سے نیچے آ رہوں گی۔ مصطفےٰ طے کر چکا تھا کہ وہ کسی بالغ عورت کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا۔ میں اس سے زیادہ بالغ ہو چکی تھی۔ اس کی نظر میں عدیلہ مکمل ترین آلہ کار تھی۔ وہ نوجوان اور دلکش تھی اور وہی ایسی ہستی تھی جو مجھے ریزہ ریزہ بکھیر سکتی تھی۔ بکھر جانے کے بعد میں ویسی ہی عورت بن جاؤں گی جیسی مصطفےٰ کو پسند تھی۔

نانی اماں سسک سسک کر موت کے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اسی آہستہ روی سے میری شادی بھی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ان کے انتقال سے ایک دن پہلے میں نے ہسپتال سے گھر فون کیا۔ مجھے اپنی لائن کے ساتھ کوئی لائن بھی مل گئی۔ مصطفےٰ کسی سے بات کر رہا تھا۔ جس سے بات ہو رہی تھی اس کی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ مصطفےٰ نے کہا۔ "کسی کا فون آیا ہے۔ میں تمھیں بعد میں فون کروں گا۔" مجھ پر عیاں تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے۔ میں نے زرمینہ اور ریاض کو گھر بھیجا۔ زرمینہ سے کہا کہ اوپر کی منزل میں جا کر ایکس ٹینشن اٹھا کر سنے اور میرے شبہات کی تصدیق کرے۔ میں ہسپتال میں بیٹھی دعا مانگتی رہی کہ کاش میرے شبہات غلط ثابت ہوں۔

میں نانی اماں کے پاس بیٹھی انتظار کرتی رہی جو تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز تھیں۔ آخری مرتبہ۔ زرمینہ واپس آئی۔ کہنے لگی کہ عدیلہ نہیں تھی۔ اس نے جلدی نظر چرائی۔ میں نے اس کا رنگ بدلتے دیکھا۔ وہ بہت پیلی پڑ گئی تھی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے نانی اماں کی پیٹھ پیچھے سرگوشیاں کرتے ہوئے تقاضا کیا کہ سچ سچ بات بتائی جائے۔ براہ کرم مجھے بتا دو۔ زرمینہ میری طرف تکتی رہی۔ اس پر ابھی تک صدمے کا اثر تھا۔ جب اس نے بتایا تو اس کا جی متلانے لگا۔ "یہ سچ ہے۔ وہی تھی۔ دونوں آج شام ملنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔"

وہ دوڑتی ہوئی غسل خانے میں گئی اور الٹی کر دی۔ نانی اماں نے جنبش کی۔ انھیں پتہ چل گیا تھا کہ بہت سخت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ جن دو نواسیوں سے انھیں محبت تھی، جنھیں انھوں نے پالا پوسا تھا، وہ دونوں برباد ہو چکی تھیں۔ انھیں پتہ تھا کہ غم صرف یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو رہی ہیں۔ غم یہ ہے کہ بعد میں ہم پر کیا گزرے گی۔ وہ دونوں ہسپتال--- نانی اماں اور مصطفےٰ --- جن کے گرد میری زندگی گردش کرتی رہی تھی میرا ساتھ چھوڑنے والی تھیں۔ اس بار غم آیا تو غم کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

نانی اماں کو محسوس ہوا کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے۔ انھوں نے سارے خاندان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اپنی وصیت لکھوا رہی تھیں۔ زبانی۔ وہ ہمارے دلوں پر نقش ہو کر رہ گئی۔ انھوں نے سب سے کہا۔ "جو کوئی تہمینہ کو دکھ پہنچائے گا میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ اسے سزا دے۔ اس کا دل پک کر پھوڑا ہو جائے۔ ایسی اذیت اس کے حصے میں آئے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تہمینہ کو خدا کے حوالے کیے جا رہی ہوں۔" انھوں نے چھت کی طرف اور چھت سے کہیں بہت آگے دیکھا۔ وہ مجھے اللہ کے سپرد کر گئیں۔ "میں تہمینہ کو تیرے حوالے کرنے لگی ہوں۔ یا اللہ یہ تیرے پاس میری امانت ہے۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔ کسی کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ میری امانت کی دھونس جما جما کر ذلیل کرتا رہے۔ وہ کبھی تنہا محسوس نہ کرے۔ اس کی حفاظت کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اب تو میرا بلاوا بھی آ گیا ہے اور میں تیرے حضور میں برضاو رغبت پیش ہو رہی ہوں لیکن میری روح یہ ضمانت چاہتی ہے کہ تہمینہ سدا تیری امان میں رہے۔"

انھوں نے مصطفیٰ سے کہا کہ ان کے قریب آ جائے۔ انھوں نے مصطفیٰ کا ہاتھ تھام لیا۔ "مصطفیٰ، میں نے تمہارے لیے دعائیں مانگیں۔ تمہاری رہائی کے لیے۔ میں نے جتوئی صاحب کے انتخاب جیتنے کی دعا بھی کی۔ میں بیمار تھی پھر بھی درگاہ بابا شاہ جمال کی سیڑھیاں چڑھ کر دعا مانگنے گئی کیونکہ تمہاری عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ جب سے تمہاری شادی ہوئی تہمینہ تمہارے پاس بہت ناخوش رہی ہے۔ لیکن جب تم پر برا وقت آیا تو اس نے تمہارا ساتھ دیا اور تمہارے لیے جدوجہد بھی کی۔ آج، اپنی تمام دعاؤں کے بدلے، میں تم سے اتنی سی عنایت کی طلبگار ہوں۔ مہربانی کر کے اس کے ساتھ بھلائی کرنا۔ اچھا شوہر بن کر دکھاؤ۔ اسے ہرگز ہرگز دوبارہ ناخوش نہ ہونا پڑے۔ یہ تم سے میری آخری درخواست ہے۔ اس دنیا میں کسی سے بھی یہ میری آخری درخواست ہے۔"

نقاہت بڑی تیزی سے ان پر غالب آتی جا رہی تھی۔ آخری چند سانسوں میں انھوں نے یہ الفاظ کہے۔ "اگر تم نے تہمینہ کے بغیر اکیلے کوئی قدم اٹھایا تو ہر وہ قدم جو تم یہ سوچ کر اٹھاؤ گے کہ اس سے تمہاری عزت بڑھے گی تمہارے لیے رسوائی کا باعث ہو گا۔ تم شہرت اور اقتدار اور احترام کے طلبگار ہو گے لیکن تمہارے حصے میں خجالت کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ اگر تہمینہ تمہارے ساتھ ہو گی تو اللہ کے حکم سے ہر طرف تمہارا بول بالا ہو جائے گا۔ تمہارے لیے میری یہ دعا ہے۔" مصطفیٰ نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں تہمینہ کا خیال رکھوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

نانی اماں پر غشی طاری ہو گئی۔ ہم باری باری ان کے سرہانے بیٹھتے رہے۔ ہم

میں سے ہر کوئی اپنی جگہ تنہا۔ اس حالت میں بھی ان کے گوش گزار کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہم سب کی رازداں چلی آ رہی تھیں۔ ہمارے حق میں چٹان۔ میں ان کے پاس گئی۔ میں نے ان کے سرہانے بیٹھ کر ہر بات بتا دی۔ میں روتی رہی۔ میں نے ان سے کہا۔ "آئندہ آپ یہاں نہ ہوں گی۔ اب کبھی مجھے آپ کی دعاؤں کا سہارا نہ ملے گا۔ اب کبھی میں آپ کے پاس گھر نہ آ سکوں گی۔ میں کہاں جاؤں گی؟ کہاں؟" میں نے پکار کر ان سے کہا۔ "آپ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ عین اس وقت جب ساری بدمزگی دوبارہ شروع ہونے کو ہے۔ میں اتنی اکیلی ہوں۔ آپ آخر کیوں جا رہی ہیں؟ کیوں؟"

میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ تاثر سے خالی تھا۔ اور پھر ان کی آنکھوں سے سیال چٹانیں لڑھکنے لگیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ میں اپنی تکلیف بھول گئی۔ میں نے انھیں دکھ پہنچایا تھا۔ وہ میری باتیں سن سکتی تھیں۔ میرے لفظ ان کے غش آلودہ ذہن میں سرائیت کر گئے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ وہ بوجھ واپس لے لوں جو میں نے اس موقع پر ان کے کندھوں پر رکھ دیا تھا جب وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہونے والی تھیں۔ میں نے انھیں ڈھارس دینے کی کوشش کی۔ "پریشان نہ ہوں۔ خدا کے لیے روئیں مت۔ آپ نہ روئیں۔ میں کسی طرح نمٹ لوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔ میں مضبوط ہوں۔ آپ کو پتہ تو ہے میں مضبوط ہوں۔" آنسو آہستہ آہستہ تھم گئے۔

عدیلہ اندر گئی۔ عین اس وقت کمرے میں کچھ پیش آیا۔ عدیلہ دوڑتی ہوئی باہر آئی۔ "ان کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ سر ادھر ادھر ہلا رہی ہیں۔ وہ ہاتھ بستر پر پٹک رہی ہیں۔ غشی کے عالم میں۔ بڑا بھیانک لگ رہا ہے۔ آئی دیکھو۔" نانی اماں عدیلہ کی موجودگی کی تاب نہ لا سکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ مجھے اور زرمینہ کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم اپنے والدین کے جیتے جی یتیم ہو گئیں۔ وہ مجھے چھوڑ گئیں تاکہ میں اپنے طور پر سب سے روح خراش اور سب سے اذیت ناک صورت حال کا مقابلہ کروں۔ زندگی میں اس جیسی صورت حال سے میرا کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے والدین کی طرف سے نہ کوئی تحفظ ملے گا نہ کوئی جذباتی تقویت۔ ان کے نزدیک معاشرے میں اپنا امیج برقرار رکھنا اور کذب اور ریاکاری کا علم بلند کیے رہنا زیادہ اہم تھا۔

ہم نانی اماں کو نانا کے آبائی گھر لے چلے جو واہ میں تھا۔ امی چاہتی تھیں کہ عدیلہ ہماری کار میں مصطفیٰ، زرمینہ اور ریاض کے اور میرے ساتھ بیٹھے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس متانت آمیز سفر کے دوران اسے اپنے پہلو میں جگہ دینا میری برداشت سے باہر تھا۔ عدیلہ نے دیکھ لیا کہ میں اس کی دشمن بن چکی ہوں۔ وہ میری خالہ کے ساتھ چلی

گئی۔ امی بہت پریشان ہوئیں۔ ان کے خیال میں میں نے انکار کر کے بے حسی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ ان پر "لوگ کیا کہیں گے" والا مرض اپنی تمام علامتوں کے ساتھ حملہ آور ہو چکا تھا۔ "تم عدیلہ سے اپنے عناد کا کھلم کھلا اظہار کر رہی ہو۔ ہمارے گھر میں جو ہوتا رہے وہ اور بات ہے۔ لوگوں کے سامنے تمہیں اس کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آنا ہوگا۔ سکینڈل ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔ ہمیں دنیا کے سامنے یہی تاثر دینا ہے کہ ہم بالکل راضی خوشی ہیں۔"

میں ان کی طرف بس دیکھتی رہ گئی۔ میں یہی دیکھتی رہ گئی کہ انھوں نے خود کو کیا بنا لیا ہے۔ ان پر دنیا کے سامنے اپنا امیج بنائے رکھنے کا ایسا خبط سوار تھا کہ انھوں نے اپنی گھریلو زندگی کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانے کی بھی پرواہ نہ کی تھی۔

زرمینہ اور میں نے پیاری نانی اماں کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ انھیں دفنا دیا گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ دفنانے کے بعد ہم سب واہ میں سردار برکت حیات کے گھر لوٹ آئے۔ اس رات زرمینہ اور میں نے فیصلہ کیا کہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم نے خواب آور گولیاں کھائی ہیں۔ ہم مصطفیٰ اور عدیلہ پر نظر رکھنا چاہتے تھے۔

توقع کے عین مطابق رات کے پچھلے پہر ایک سایہ لپک کر ہمارے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ مصطفیٰ جاگ اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ اپنی غیر حاضری کی وضاحت کے لیے اس کے پاس اچھا بہانہ موجود تھا سحری۔

مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اٹھوں اور اچانک انھیں جالوں اور وہ بکے بکے رہ جائیں۔ میں کوئی فضیحت آمیز ہنگامہ برپا نہ کرنا چاہتی تھی۔ میری طبیعت متلانے لگی۔ یہ کسی اور کا گھر تھا۔ میں بس لیٹ کر نانی اماں کو یاد کرتی اور روتی رہی۔

ہم لاہور واپس آ گئے۔ عدیلہ اپنی نند کے گھر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے پھر جانماز سنبھال لی۔ قرآن شریف اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔ میری زندگی میں اب سیاست کی گنجائش نہ رہی تھی۔ میں اب آرکلے لین کی پرانی تہمینہ بن چکی تھی۔ میں ٹیلی فون کے ایکس ٹینشن اٹھا کر سنتی، عدیلہ کی خوشبوؤں کے لیے مصطفیٰ کی قمیضیں سونگھتی، دیکھتی کہ کہیں ان پر لپ سٹک کے دھبے تو نہیں۔ میرے دل میں مصطفیٰ کے لیے سرد مہری آ گئی تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی مگر چاہتی تھی کہ وہ میرے پاس رہے۔

میں نے عدیلہ کی نند سے بات کی۔ یہ بڑا نازک معاملہ تھا۔ میں نے اسے اپنے خدشات اور شبہات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مجھے اپنے شوہر پر شک ہے۔ وہ کہنے لگی کہ اسے معلوم ہے۔ "وہ عدیلہ کو لینے بھی آتا ہے اور چھوڑنے بھی جاتا ہے۔"

اگلے دن عدیلہ اور مصطفیٰ نے ملنے کا پروگرام طے کیا۔ ملاقات کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ عدیلہ کا اضطراب بڑھتا گیا۔ ہم گھر والوں کے ساتھ تھے۔ وہ ادھر ادھر ٹہلتی رہی اور گھر سے باہر جانے کا بہانہ آزما کر دیکھتی رہی۔ آخر کار وہ نکل بھاگی۔ کہنے لگی کہ اسے اپنی سہیلی سے ملنے جانا ہے جو کراچی سے آئی ہوئی ہے۔ میں نے تسنیم کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ جس "سہیلی" کا نام لیا گیا ہے وہ لاہور میں نہیں ہے۔ مصطفیٰ بھی رفو چکر ہو چکا تھا۔ میں نے نعمی کو فون کیا اور کہا کہ وہ ہمارے اس گھر تک چلی جائے جو کنال پر ہے۔ شاید وہ دونوں وہیں ہوں۔ نعمی کو اس کی کار نظر نہ آ سکی۔ نعمی نے فون کر کے بتایا دیا۔ آخر وہ گئے تو کہاں گئے؟

رات ساڑھے دس بجے میں نے تسنیم کو فون کیا۔ کہنے لگی کہ عدیلہ ابھی ابھی پہنچی ہے۔ "اس کی گت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں نہائی ہوئی ہے۔ کپڑے بدلنے دوڑی ہوئی اوپر گئی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد مصطفیٰ بھی آ پہنچا۔ اس کی بھی وہی حالت تھی جو عدیلہ کی بتائی گئی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ پر تھے جہاں بہت گرمی ہوگی۔ شاید وہ کار میں بیٹھے رہے ہوں۔ کالج کے لڑکے لڑکیوں کی طرح۔ اس کی قمیض پر ہلکی گلابی لپ سٹک کے دھبے شرمناک حد تک نمایاں تھے جن کی اسے خبر تک نہ تھی۔ کہنے لگا کہ وہ ایک عام جلسے میں گیا ہوا تھا۔ "گرمی اتنی تھی کہ میرے جوتے تک تر بتر ہیں۔" وہ پڑ کر سو گیا۔ میں لیٹی حیران ہو کر یہی سوچتی رہی کہ کیا رد عمل ظاہر کروں۔ رات کے تین بجے وہ اٹھا۔ غسل خانے میں گیا۔ نہایا اور پھر جا نماز بچھا کر نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ ذرا جو اسے شرم آئی ہو۔ میں دیکھتی رہی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ "میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے بیوقوف بنانے میں لگے ہوئے ہو۔ لیکن بات یہ نہیں۔ تم اللہ تعالیٰ کو جھانسا دینا چاہتے ہو۔ پہلے تو تم اس کے احکام پر عمل کرنے کے بجائے عین ان احکام کے الٹ کرتے رہے اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ آج تم نے جو حرکت کی ہے اس کی اللہ بڑی سختی سے ممانعت کر چکا ہے۔ تم نے ایک بار پھر اپنے مذہب سے بے وفائی کی ہے۔ تم اللہ سے کیا کہہ رہے ہو مصطفیٰ؟ یہ کہ تمہیں اپنے کیے پر افسوس ہے؟ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے؟ کیا تم یہ سمجھے بیٹھے ہو؟ ہیں؟ اگر تم سمجھتے ہو کہ اللہ کو بیوقوف بنا سکتے ہو تو پھر میں تو کوئی شے نہیں۔ مجھے تم سے مزید لڑنا جھگڑنا بھی منظور نہیں۔ یہ لڑائی تو اب میں نے اللہ پر چھوڑی۔ میری توہین ہوئی سو ہوئی۔ زیادہ گستاخی تم نے اللہ کی شان میں کی ہے۔"

وہ نماز پڑھتا رہا۔ نماز ختم کر کے مجھ پر گرجنے لگا۔ "یہ بکواس بند کرو۔ تم پاگل ہو

چلی ہو۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہارے ذہن کے پیچ ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ تمہیں نہ جانے کیا کیا دکھائی دیتا رہتا ہے۔"

اسلام میں رسول کریمؐ اور ان کے صحابہ کی تصویریں یا مجسمے بنانے کی ممانعت ہے۔ یہ پابندی اس لیے لگائی گئی ہے کہ کہیں کسی شخصیت سے پُر غلو ارادت مندی بگڑ کر بت پرستی کا روپ اختیار نہ کر لے۔ اسلام کے عظیم فنکاروں اور ہنر مندوں کے تخلیقی محرکات کا رخ خطاطی اور فن تعمیر کی طرف موڑ دیا گیا۔ شیعوں میں، خصوصاً ایران میں، رواج ہے کہ حضرت علی کی تصویر ضرور پاس رکھتے ہیں۔ حضرت علی کا اسلام کے تمام فرقے احترام کرتے ہیں۔ وہ قوت کی علامت ہیں اور جب قسمت کی خرابی سے کشتی طوفانی پانیوں میں گھر جاتی ہے تو اہل ایمان کے لبوں پر اکثر انھیں کا نام آتا ہے۔ وہ مشکل کشا ہیں۔ وہ عظیم رستگار ہیں اور مسلمان انتہائی جوش اور جذبے سے انھیں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ میرے لیے حضرت علی تحفظ کی علامت ہیں۔ جب مجھ پر سب سے مشکل وقت آیا تھا تب میں نے ان سے مدد چاہی تھی اور ان کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

مصطفےٰ نے جیل کی کوٹھری میں حضرت علی کی تصویر لگا رکھی تھی۔ اپنی بیچارگی کے تمام عرصے میں وہ حضرت علی کی طرف رجوع کرتا، روتا اور سسکیاں لیتا اور ان کے آگے ہاتھ جوڑتا کہ شفاعت فرمائیں اور جیل سے رہائی دلادیں۔ وہ مجھے بتاتا رہتا کہ کس طرح حضرت علی کے طفیل اسے وہ طاقت اور قوت برداشت نصیب ہوئی جس نے اسے قید و بند کی ہولناکیاں سہنے کے قابل بنا دیا۔ "اگر حضرت علی کا سہارا نہ ملتا تو میں ہار مان جاتا۔ ان کا سایہ میرے سر پر رہا۔ ان کا اسم گرامی بذاتِ خود قوت کا سرچشمہ ہے۔ انھیں کے نام نے مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کیا۔

جیل سے چھوٹنے کی دیر تھی کہ مصطفےٰ بھول بھال گیا کہ وہ حضرت علی کا احسان مند ہے۔

اس نے دیکھا تھا کہ میں حضرت علی کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہوں۔ اس نے دیکھا تھا کہ حضرت علی نے مجھے شر کا مقابلہ کرنے کے لیے کتنی طاقت عطا کی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا ایمان وقتی ترنگ نہیں نہ اس میں موقع پرستی کی کوئی لاگ ہے۔ اس نے بے حرمتی کی کارروائی کر کے مجھے ایمان سے محروم کرنا چاہا۔

مصطفےٰ میرے کمرے میں آیا۔ میں حضرت علی کی تصویر تھامے آنسو بہا رہی تھی۔ عدیلہ اور مصطفےٰ کے بارے میں میرے شکوک کی تصدیق ہو چکی تھی۔ میں اپنے ایمان کے سوا کس کا سہارا ڈھونڈتی۔ وہ کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ پھر دھمکانے والے انداز

میں میری طرف بڑھا اور تصویر میرے ہاتھ سے چھین لی۔ اس نے حقارت بھرے انداز میں تصویر کو گھورا۔ "یہ۔ کیا یہ تمھیں بچا لے گی؟ یہ تصویر؟"

اس نے تصویر پھاڑ کر پرزے پرزے کر دی۔ میں نے ان مقدس پرزوں کو اکٹھا کیا۔ میں روئی اور اللہ کے حضور میں گڑگڑا کر کہا کہ مجھے بخش دیا جائے۔ میں بے جانے بوجھے اس بے حرمتی میں شریک ہوئی تھی۔ اب میں سمجھی کہ مصطفےٰ کے نزدیک مذہب اس کی عذاب میں مبتلا روح کے لیے تریاق تھا۔ برے وقتوں میں کام آنے والا رفیق۔ وہ بھکاری بن کر، ملتجی بن کر اللہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جب اسے نعمتوں سے نوازا گیا تو فرعون بن بیٹھا۔

کوئی اور ہوتا تو زیادہ احتیاط سے کام لینا شروع کر دیتا۔ لیکن مصطفےٰ سے یہ توقع کہاں۔ اگلی شام وہ سات بجے گھر سے روانہ ہوا۔ کہنے لگا کہ نو بجے تک واپس آجائے گا۔ میں نے تسنیم کو فون کیا۔ عدیلہ نے اپنی روانگی اور واپسی کا یہی وقت بتایا تھا۔ میں دوستوں کو ساتھ لے کر گئی اور ہم نے گاڑی تسنیم کے گھر کے نکڑ پر کھڑی کر دی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ عدیلہ کو گھر چھوڑنے کون آتا ہے۔ شاید ساجد ہو یا شاید عربی۔ پونے نو بجے ایک کار تسنیم کے گھر کے پھاٹک کے ٹھیک سامنے آکر رکی۔ عدیلہ اتری اور دوڑ کر اندر چلی گئی۔ کار کو روانہ ہونے سے پہلے ریورس کیا گیا۔ یہ ہماری مشتری پجیرو تھی۔ عدیلہ میری سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مصطفےٰ گاڑی چلا رہا تھا۔ تسنیم اپنی کھڑکی میں پردوں کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ ہم بہت تیز ڈرائیو کرتے ہوئے واپس ہوئے اور میں مصطفےٰ کے آنے سے پہلے گھر پہنچ گئی۔ میں مصطفےٰ سے دو بدو نہ ہوئی۔

اگلے روز ہم سب نانی اماں کے چہلم پر واہ چلے گئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سارا معاملہ الف تا یے، امی کو بتا دیتی ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں اپنی آنکھوں سے کیا دیکھ چکی ہوں۔ اس رات امی نے عدیلہ سے بات کی۔ انھوں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ انھیں خبر کس نے دی ہے۔ عدیلہ نے تسلیم کر لیا کہ وہ مصطفےٰ کے ساتھ گئی تھی۔ لیکن ان کے درمیان ہوا کچھ بھی نہیں تھا۔ جب نانی اماں کا ختم دلایا جارہا تھا تو امی سے میری بات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ عدیلہ نے کیا کہا ہے۔ وہ عدیلہ کی بات ماننے پر مائل تھیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں غصے سے پھٹ پڑی۔ کچھ بھی نہیں ہوا سے عدیلہ کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے یہ بات کیسے مان لی؟ آپ وہاں بیٹھ کر اس کی باتیں کیسے سنتی رہیں جن میں وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ گھومنے پھرنے کا جواز پیش کر رہی تھی؟ آپ اس قدر نارمل اور مردہ دل کب سے ہو گئیں؟ آپ کو معلوم ہے وہ اپنے بہنوئی سے عشق لڑاتی رہی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔

اور اس کے باوجود آپ اس کے کہے پر یقین لے آئی ہیں، حالانکہ میں نے آپ کو ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا۔ میں تو حیران ہو گئی ہوں - اس نے چوری چھپے پھر وہی حرکتیں کی ہیں اور ڈھیٹ اتنی ہے کہ کہتی ہے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔" میں جس طرح روئی دنیا میں کم ہی لوگ اس طرح روتے ہوں گے۔ میرے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ سب نے مجھے روتے دیکھا۔ رونے سے باز رہنا میرے بس میں نہ تھا۔

میرا اور عدیلہ کا آمنا سامنا ہوا۔ امی کی موجودگی میں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ یہاں سے جوہ ذرا سٹپٹائی ہو۔ اس نے اپنا سر اس طرح جھٹکا جیسے "اونہہ" کہہ رہی ہو۔ "تمہیں پتہ بھی ہے میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے؟ اگر پتہ ہو تو تم مجھے بہن نہ کہو فرشتہ کہنا شروع کر دو۔ تمہاری شادی کو بچائے رکھنے کی ذمے دار میں ہوں۔"

یہ واضح تھا کہ وہ اشارتاً کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ مصطفےٰ اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ اس کی بات ماننے کو تیار نہ ہوئی تھی۔ صرف میری خاطر۔ مصطفےٰ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرا بسا بسایا گھر اجاڑنا نہ چاہتی تھی۔

کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟ میں نے آئینے میں اپنے پر نظر ڈالی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بدلنا پڑے گا۔ مجھے ضرور عدیلہ جیسی نظر آنا چاہیے۔ مجھے ضرور اس جیسے ملبوسات پہننے چاہئیں۔ مجھے ضرور اپنی پوری شخصیت کو بدلنا چاہیے۔ ایک یہی راستہ رہ گیا تھا۔ ایسا کروں تو شاید میری شادی کامیاب ہو جائے۔ مصطفےٰ عدیلہ کو چاہتا ہے، تمہیں نہیں۔ تم اپنی طرف دیکھو تو سہی۔ یہ تمہارے سفید کپڑے، یہ تمہارے بلند آدرش۔ تم اس کے مطلب کی عورت نہیں۔ عدیلہ ہے۔ اور اس کے باوجود--- اسے تم سے پیار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیار ہے۔ سارے وقت یہی کہتا رہتا ہے - آئینے نے جواباً میری طرف دیکھا۔ میں سامنے سے ہٹ گئی۔ اس میں میری شبیہ کے علاوہ بھی کچھ نظر آیا تھا۔ اس میں میرے ذہن کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے مصطفےٰ کی آواز سنی۔ نامبارک آواز۔ "کوئی اور عورت تم جیسی نہیں ہو سکتی لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم سولہ سال کی لڑکی بن کر رہو۔ میں پھر سے رومان کا تمنائی ہوں۔"

مجھے دھکا لگا۔ یہ تو میں نہیں کر سکتی۔ میں سولہ برس کی نہیں۔ پانچ بچوں کی ماں ہوں۔ سینتیس سال کی ہو چکی ہوں۔ اس شخص کے بارے میں رومانی تصورات کیسے رکھ سکتی ہوں جو میری بہن سے عشق لڑا رہا ہو؟ کیسے؟

میں اس از خود رفتگی کی کیفیت سے باہر آئی۔ اپنے ہوش و حواس ہرگز نہیں کھونے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں نے اللہ کے آگے، محبوبِ خدا اور حضرت علی اور بی بی

فاطمہ کے آگے ہاتھ پھیلائے اور دعا کی۔ میں مزاروں پر جانے لگی۔ ان لوگوں سے بات کی جو خدا رسیدہ تھے۔ میں چاہتی تھی کہ اللہ میری فریاد سن لے۔ کسی طرح۔ کسی بھی صورت۔ مہربانی کرو، میرے گھر کو اجڑنے نہ دو۔ مہربانی کرو، میرے بچوں کی زندگی تباہ نہ ہونے دو۔ میں گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر، سر جھکا کر، منت کرتی رہی، کرتی رہی، کرتی رہی۔ رو رو کر، سسکیاں بھر بھر کر، سارے وقت منت کرتی رہی۔ منت کرتی رہی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ سکوت ہی سکوت۔ وہی میری منت سماجت، وہی خاموشی۔

ہم اسلام آباد میں صدیق بٹ کے گھر میں تھے۔ مصطفےٰ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ آخر کار اس نے مجھے بتادیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ عدیلہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ یہاں آگئی ہے اپنے شوہر سے لڑ کر آئی ہے۔ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے مجھے کوئی بات بتانا چاہتی ہے--- تمہارے بارے میں"۔ میں نے امی کو فون کیا۔ امی نے عدیلہ کو فون کر کے حکم دیا کہ یا تو فوراً کراچی واپس آجائے یا وہ خود اسے لے جانے کے لیے اسلام آباد پہنچ جائیں گی۔ عدیلہ چلی گئی۔ مصطفےٰ کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ طوفانی گھٹائیں بس ذرا سی بوندیں برسا کر پاس سے گزر گئیں۔

میرا ذہن یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے کہیں دُور نکل جاؤ۔ چیزوں کو دُور ہٹ کر دیکھنا تمہارے لیے ضروری ہے۔ اس گھر سے چلی جاؤ۔ اس سے بہت زیادہ یادیں وابستہ ہیں۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں سے میں نے مصطفےٰ کی رہائی کی مہم چلائی تھی۔ جہاں میں نے اس کی رہائی کی دعائیں مانگی تھیں۔ جہاں میں نے انتظار کرتے کرتے کتنی بہت سی راتیں آنکھوں میں کاٹ دی تھیں۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں راتوں کو سوتے سے اٹھ بیٹھی تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا کیونکہ مصطفےٰ اسیر تھا اور اسے کچھ کرنے جوگا نہ چھوڑا گیا تھا۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں میں قید خانے میں اس سے مل کر آنے کے بعد عبادت کرتی تھی کیونکہ اس کی بیچارگی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں میں نے ہر اس شخص سے ٹکر لی تھی جو مصطفےٰ کے خلاف تھا، خواہ وہ جتوئی صاحب ہوں، جن کی میں بڑی عزت کرتی ہوں، خواہ مصطفےٰ کے بھائی ہوں، جو میرا خاصا احترام کرتے تھے، خواہ جنرل ضیاء ہو۔ مصطفےٰ کے آنسو میری آنکھوں سے بہے تھے۔ میں مصطفےٰ کھر کی طرح کارگزاری دکھاتی رہی تھی۔ میں نے مصطفےٰ کھر کی طرح محسوس کیا تھا۔ آج وہ جسمانی طور پر موجود ہوتے ہوئے بھی مجھے اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ اب میں زیادہ تنہا تھی۔

ہمارے ارد گرد ہر کسی نے، صدیق بٹ اور اس کے گھر والوں نے، تمام کارکنوں

نے، میرے تمام پرانے سیاسی رفقاء نے مجھے آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے دیکھا۔

میں نے نصیبہ اور نشا کو مری میں اپنے پرانے سکول میں داخل کرا دیا۔

میں علی اور حمزہ کو لے کر مری چلی گئی۔ میں نے تصویریں بنانے کی کوشش کی میں چہروں کی تصویریں بنانی نہ چاہتی تھی۔ ان میں افسردگی اور بوجھل پن کے سوا کیا دکھائی دے گا۔ میں نے ارد گرد فطرت کی فراوانی پر نظر دوڑائی۔ چہروں کے بجائے بطخوں کی تصویر بنائی۔ جو تصویر بن کر سامنے آئی وہ اذیت ناک انداز میں اس مثلث کی یاد دلانے لگی جس میں میری زندگی تبدیل ہو چکی تھی۔ میں نے تصویر میں ایک بطخا اور دو بطخیں دکھائی تھیں۔ ایک بطخ نے اپنا سر پروں میں چھپا رکھا تھا۔ مری میں قیام کرنا میرے لیے ممکن نہ رہا۔ میں پھسل کر دیوانگی میں غوطہ کھانے ہی والی تھی۔ میں نے مصطفےٰ کو فون کیا کہ وہ آ کر مجھے فوراً لے جائے۔ میں مصطفےٰ کھر سے الگ ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس بار علیحدہ ہونے کی وجوہ بھی معقول تھیں اور جو وقت چنا گیا تھا وہ بھی موزوں تھا۔ جلد ہی ہمارا دوبارہ مری آنا ہوا۔ میں بہت زیادہ اپنے آپ میں گم تھی۔ ہم بھور بن میں وزیر اعلیٰ کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔

اس رات مصطفےٰ نے مجھ سے ہم بستر ہونا چاہا۔ مجھے اس کے رویے سے پتہ چل گیا تھا کہ وہ انکار سننے کے لیے تیار نہیں۔ جو ہونا تھا میں نے ہونے دیا۔ میں نے اپنی نفرت کو قابو میں رکھا۔ میں نے خود کو مکمل طور پر لاتعلق رکھنا چاہا۔ مصطفےٰ کے کندھے پر سر رکھ کر میں اللہ سے دعا مانگتی اور منت کرتی رہی کہ مصطفےٰ پر عذاب نازل کیا جائے۔ وہ ایسی عورت سے زنا کا مرتکب ہوا تھا جو اس کی بہن کا درجہ رکھتی تھی۔ الٰہی، کیا یہ سب تجھ پر عیاں نہیں؟ تو اس کی ممانعت کر چکا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ کوئی مرد بیک وقت دو سگی بہنوں سے جنسی تعلقات نہیں رکھ سکتا۔ یہ تیرے قرآن میں ہے۔ اگر یہ قانون تو نے بنایا ہے، اگر یہ ضابطہ تیری طرف سے نافذ ہوا ہے تو پھر تو کبھی یہ اجازت نہیں دے گا کہ میرے ساتھ ایسی بات ہو۔ اس آدمی کو کبھی مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ اس آدمی کو کبھی تیری نافرمانی کرنے کی جسارت کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ تو ہی اس بات کو رکوا سکتا ہے۔ اور جب میں یہ دعا مانگ رہی تھی تو میں نے تصور کیا کہ کعبہ شریف میرے سامنے موجود ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کعبے کو ہاتھ لگا سکتی ہوں۔ یہ ایسا وقت نہیں ہوتا جب آدمی کو اللہ کا خیال آئے۔ آدمی خود کو اتنا صاف ستھرا محسوس نہیں کرتا کہ اللہ کے روبرو ہو سکے۔ اللہ کو اس مرد کی آلودگی مجھ سے دور کرنی تھی جس نے مجھے استعمال کیا تھا مجھ سے ناجائز

کام لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے وہ لعنت، وہ گندگی، وہ غلاظت مجھ سے دُور کرنی ہو گی جو ملک غلام مصطفےٰ کھر نے میرے جسم و جان میں انڈیل دی تھی۔

ایک معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ میری دعا قبول ہو گئی۔

ہم نے مری میں آٹھ دن قیام کیا۔ اس کے بعد بھی میں دو مہینے مصطفےٰ کے ساتھ رہی۔ لیکن اس نے مجھے ایک بار بھی ہاتھ نہ لگایا۔ اس نے یہ موضوع کبھی چھیڑا تک نہیں۔ یہ اس کے مزاج کے منافی تھا۔ وہ مجھ سے پرے پرے رہا۔ وہ بستر پر آتے ہی تکیے پر سر رکھتا اور سو جاتا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ وہ اس بارے میں کوئی بات تک نہ کرتا۔ اس بارے میں مجھ سے الجھا بھی نہیں۔ اس بات کا کبھی ذکر تک نہ آیا۔ بس کسی طرح یہ صورت حال پیدا ہو گئی۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ سب اللہ کی مہربانی تھی۔

ہمارے خاندان میں شادی کی ایک تقریب آ گئی۔ میری بہن روبینہ کی بیٹی خالہ ثمر کے بیٹے سے بیاہی جانے والی تھی۔ روبینہ اور اس کے شوہر کمال، خالہ ثمر اور ان کے میاں خالو اختر نے ہم سب کا بڑا خیال رکھا تھا۔ وہ چٹان بن کر ہمیں سہارا دیتے رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفےٰ سے علیحدگی کو فی الحال ملتوی کیے دیتی ہوں۔ شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔ میں ان کی خوشی میں کھنڈت ڈالنا نہ چاہتی تھی۔ ہم 15 جولائی 1989ء کو کراچی گئے اور اپنے والدین کے پاس ٹھہرے۔ امی مصطفےٰ سے بات کرنے کی روا دار نہ تھیں۔ میری عدیلہ کی ایک بار اور مڈبھیڑ ہوئی۔ کہنے لگی کہ اسے اپنے کیے پر افسوس ہے۔ مجھے بتانے لگی کہ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ مصطفےٰ ہر وقت اسے فون کر کے کہتا رہتا تھا کہ میرے ساتھ اس کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ وہ بتاتا کہ اسے میری جیسی بیوی نہیں چاہیے تھی۔ اسے عدیلہ کی ضرورت تھی۔ عدیلہ کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

میں چاہتی تھی کہ مجھے ہر بات بتائی جائے۔ "جب تک تم مجھے ہر بات نہیں بتاؤ گی میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا تعلق قائم نہ کر سکوں گی۔ میں اس قابل تو ہو جاؤں کہ اپنے شوہر کو بتا سکوں کہ میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی راز نہیں رہا۔ میں چاہتی ہوں کہ مصطفےٰ کو پتہ چل جائے کہ تمہاری زبانی مجھے مصطفےٰ کے اور تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ صرف اس کے بعد میں تمہیں معاف کروں گی۔"

عدیلہ مجھے سب کچھ نہ بتا سکی۔ میں اسے معاف نہ کر سکی۔

مصطفےٰ اور میں نے شادی میں کراچی میں شرکت کی۔ ولیمہ لاہور میں تھا۔ اگلے دن میں نے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھے۔ غلام ربانی کی بیوی کو بلا کر اپنے بچے

اس کے حوالے کیے۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا کہ میرے بچوں کو ایک اور اغوا کی صورت سے گزرا پڑے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مفروروں کی طرح زندگی بسر کریں۔ میں چاہتی تھی کہ وہ آزاد رہیں، سکول جائیں اور جس طرح کے حالات تھے ان میں، جس حد تک ممکن ہو نارمل رہنے کی کوشش کریں۔ ان کی زندگی میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ "ڈرامے" پیش آ چکے تھے۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ صورت حال ان پر واضح ہو جائے۔

زرمینہ مجھے پک کرنے آئی اور میں مصطفےٰ کھر کے گھر سے چوتھی اور آخری بار رخصت ہوئی۔ مصطفےٰ اس شام گھر پر نہ تھا۔ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ یہ 24 جولائی 1989ء کی بات ہے۔ اس کی اڈیالا سے رہائی اور میری بعد ازاں "اسیری" کو ابھی سال بھر بھی نہ ہوا تھا۔

میرے مسائل ابھی ختم کہاں ہوئے تھے۔ ہر کوئی میرے خلاف ہو گیا۔ انتہا یہ کہ ای تک ان باتوں سے مکر گئیں جو پہلے ہو چکی تھیں۔ صاف انکار کر دیا کہ میرے اور ان کے درمیان کبھی عدیلہ کے حوالے سے کوئی گفتگو ہوئی تھی۔ وہ سب زور دے کر کہہ رہے تھے کہ میں اپنی طرف سے باتیں گھڑتی رہتی ہوں۔ میں صرف مصطفےٰ سے الگ ہونے کے لیے بہانے تلاش کر رہی ہوں اور شامت خواہ مخواہ عدیلہ کی آئی رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی شادی ختم کرنے پر بالکل راضی نہ تھی۔ میری ایک عمر کی جذباتی کمائی اس شادی میں لگی ہوئی تھی۔ اگر مصطفےٰ کسی اور عورت سے شادی کر کے اسے گھر لے آتا تو مجھے وہ بھی قبول تھا۔ لیکن اپنی بہن کو قبول کرنے کے لیے میں تیار نہ تھی۔ اُدھر یہ عالم کہ عدیلہ کے سوا کوئی منظور ہی نہیں۔ یہ ان سب کو معلوم تھا لیکن جان بوجھ کر انجان بنے ہوئے تھے جیسے بات کچھ اور ہو۔

جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ مصطفےٰ نفسیاتی طور پر رجعت کر رہا ہے۔ وہ اپنی جوانی سے چمٹے رہنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ اسے یہ قبول نہ تھا کہ وہ ادھیڑ ہو چکا ہے۔ اسے رومان کی طلب تھی۔ اس نے پھر اپنی ٹی شرٹیں، جینز، مگرمچھ کی کھال کے جوتے اور سفاری سوٹ پہننے شروع کر دیے۔ وہ اپنی ہونڈا اکارڈ اور پیجرو گاڑیاں لیے لیے پھرنے لگا۔ وہ اپنے دو کروڑ کی مالیت کے گھر کی طرف لوٹ گیا۔ وہی گھر جسے میں نے جلاوطنی کے دنوں میں اپنے خوابوں میں آراستہ کیا تھا، نئی شکل دی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس گھر کو کسی کی بد دعا لگ گئی ہے۔ اس میں کبھی قہقہوں کی گونج سنائی نہ دے گی۔ اس میں مایوسی کی چیخیں بسی ہوئی ہیں۔ کسی بیوی کو وہاں قدم جما کر رہنا نصیب نہ ہوا تھا۔ کسی عورت کا بھوت اس گھر میں منڈلاتا رہتا تھا۔

اس نے عروسی جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں لال تھیں اور ان سے غصے کے مارے شعلے نکلتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

اس کے بھائی ٹھیک ہی کہتے تھے۔ مصطفےٰ کبھی بدل نہیں سکتا۔

میں خالہ ثمر کے گھر چلی گئی۔ انھوں نے مجھے پیار دیا، میرا خیال رکھا۔

میرے ماموں اسد حیات نیشنل پیپلز پارٹی کی تشکیل کے وقت سے ہمارا ساتھ نباہتے چلے آ رہے تھے اور مصطفےٰ کے سیاسی حلیف بن چکے تھے۔ میں مصطفےٰ کو رہا کرانے کی جدوجہد کے دوران ان کے گھر سیاسی جلسے کرتی رہی۔ جتوئی صاحب بارہا وہاں میرے پاس آئے۔ اسد ماموں اکثر میرے ساتھ جیل میں مصطفےٰ سے ملنے جایا کرتے۔ اس موقع پر ای ان کے ہمارے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے سخت خلاف تھیں۔ اسد ماموں نے ان پر واضح کر دیا کہ اس مرحلے پر وہ ہمارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ کہنے لگے کہ "مصطفےٰ میرا دوست ہے اور تہمینہ کا یہ فیصلہ کہ ہر طرح کی مشکلات کے باوجود مصطفےٰ کا ساتھ دے گی میری نظر میں قابل احترام ہے۔"

یکایک میں ان پر بوجھ بن گئی۔ جیسا کہ مجھے پتہ چل چکا تھا سیاست کے تقاضوں کے سامنے خونی رشتے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اپنے سیاسی کیریر کو آگے بڑھانے کے لیے اسد ماموں کو مصطفےٰ کی ضرورت تھی۔ میں ان کی راہ کا کانٹا تھی۔ میرے بغیر کام چل سکتا تھا۔ ماموں کو پتا تھا کہ ہماری علیحدگی کی اصل وجہ کیا ہے لیکن اس پر یقین لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ مصطفےٰ کے ساتھی بنے رہے حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ خاندان کی عزت ڈبو چکا ہے۔ ان کی دو بھانجیوں کو بے آبرو کر چکا ہے۔ اس کے باوجود اسد ماموں مصطفےٰ کے حلیف بنے رہے۔ اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ انگریزی راج میں حیات خاندان کے افراد کو عروج کیوں حاصل ہوا تھا۔

اسد ماموں مصطفےٰ کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ وہ ان کے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ انھوں نے خالہ ثمر کو فون کیا اور ان سے کہا کہ مجھے گھر سے نکال دیں۔ میں نے ان سے بات کی۔ اختر خالو نے ان پر بالکل واضح کر دیا کہ وہ کبھی مجھے اپنے گھر سے چلے جانے کے لیے نہیں کہیں گے۔ سردار اسد حیات اپنی بات پر اڑے رہے۔ بدتمیزی ملاحظہ ہو کہ مجھ سے کہنے لگے۔ "تم کسی ہوٹل میں اٹھ جاؤ۔ تمھارا بل میں ادا کر دوں گا۔" "مجھے اپنا بل ادا کرنے کے لیے آپ کی ضرورت نہیں۔ لیکن یاد رکھیں، جو کچھ آپ آج میرے ساتھ کر رہے ہیں، اسے میں کبھی بھلاؤں گی نہیں۔"

میں کسی اور جائے امان کی تلاش میں اپنی پہلی پناہ گاہ سے نکل پڑی۔ ایک اور خالو، عزیز خاں، نے مجھے اپنے گھر میں جگہ دی۔ وہ بہت شفقت سے پیش آئے۔ انھوں

نے کوشش کی کہ وہ مجھے نانی اماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیں۔ ان کے گھر میں مجھے ایک کمرا دیا گیا۔ اس کی دیواریں مجھ پر تنگ ہونے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بُری بن چکی ہوں۔ مجھ سے اس عورت جیسا سلوک کیا جارہا تھا جو اپنے بہنوئی سے معاشقہ لڑاتی رہی ہو! یہ اس طرح کا سلوک تھا جو شائستگی کے تقاضوں کو پامال کر دینے والی عورت کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ یہ کیوں؟ مجھے معلوم تھا کہ میں اب مصطفیٰ کھر کی بیوی نہیں۔ مجھ سے بد سلوکی کی جاسکتی ہے۔ مصطفیٰ اغماض سے کام لیتا رہے گا۔

مصطفیٰ گشت پر نکلا۔ میرے تمام رشتے داروں سے جاکر ملا۔ وہ اسی تک سے ملنے چلا گیا۔ اس نے مالی طور پر میرا ناطقہ بند کر دیا (جب میں اس سے الگ ہوئی تھی تو میرے بینک میں سو روپے تھے!) مجھ میں اتنی عقل نہ تھی کہ ہمارے مشترکہ اکاؤنٹ سے اپنے حصے کی کچھ رقم نکلوا لیتی۔ یہ رقم مصطفیٰ نے نکلوالی۔ وہ میری چالوں کا پہلے سے اندازہ لگا کر میری تمام راہیں مسدود کرتا جارہا تھا۔ اس نے میری رقم بھی ہتھیا لی۔ وہ مجھے بے دست و پا کر دینا چاہتا تھا۔ مجھ پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مصطفیٰ کھر سے الگ ہونے کے بعد زندگی میں کچھ باقی نہیں رہتا۔

لیکن وہ اللہ پر میرا ایمان مجھ سے نہ چھین سکا۔ یہ وہ جائے امان تھی جس کے گرد مصطفیٰ حصار قائم کرنے سے قاصر تھا۔ میں رات دن جانماز پر بیٹھی رہتی اور اللہ کے حضور میں دعا کرتی کہ مجھے سمجھوتہ کرنے سے محفوظ رکھے۔ میں نے اللہ سے التجا کی کہ اس جہنم میں دوبارہ جانے پر مجبور نہ کرے جسے میں چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ مجھ جیسی عورت کو غربت سے کب سابقہ پڑا تھا۔

مصطفیٰ بچوں کو ساتھ لے کر میرے والدین سے ملنے کراچی پہنچا۔ میرے سننے میں آیا کہ وہ ان کے پاس بیٹھ کر ہماری شادی کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ عدیلہ بھی اسی گھر میں موجود تھی۔ مجھے اس بات پر صدمہ پہنچا کہ جب مصطفیٰ ان سے ملنے گیا تو میرے والدین نے عدیلہ کو گھر سے کہیں اور چلے جانے کو نہ کہا۔ ان کی توقیر میری نظر میں اور کم ہوگئی۔ بچے نانا نانی کے گھر میں حیران پریشان اور کھوئے کھوئے ادھر ادھر پھرتے رہے۔ انھیں وہاں اپنی خالہ نظر آئی۔ وہ اس کے پاس چلے گئے۔ وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ ان کے ساتھ کھیلتی رہی۔ میرے بچے معصوم تھے۔ وہ معصوم نہ تھی۔ اس سارے معاملے کی ناانصافی پر میں کانپ کانپ جاتی ہوں۔ میں نے پندرہ دن سے اپنے بچوں کو نہیں دیکھا تھا۔

مصطفیٰ ان سے مل چکا تو والد صاحب مجھ سے ملنے لاہور آئے۔ مصطفیٰ نے

انھیں راضی کرنے کی کوشش کی تھی کہ کسی طرح مجھے واپس آجانے پر آمادہ کریں۔ والد صاحب میرے مزاج سے بخوبی آشنا تھے۔ انھوں نے مصطفیٰ سے کہا کہ وہ مجھے طلاق دینے پر سنجیدگی سے غور کرے۔ مصطفیٰ ایسا کرنے سے انکار کر چکا تھا۔

میری بیٹی، نصیبہ، کی سال گرہ آگئی۔ وہ فون پر روتی رہی۔ وہ فون پر روتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب اپنا کیک کاٹے تو میں وہاں موجود ہوں۔ مصطفیٰ کہیں گیا ہوا تھا۔ میں نے سال گرہ کی دعوت میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے چھوٹے سے گھر واپس آگئی۔ نصیبہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس نے کیک تراشا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ میرے دل نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہے۔

اتنے میں مصطفیٰ آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ "تم ذرا اوپر آؤ گی؟ تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ گھر میں بہت زیادہ مہمان جمع تھے۔ میں کوئی ایسی حرکت نہ کرنا چاہتی تھی کہ سب لوگوں کی نظر میں تماشا بن جاؤں۔ مصطفیٰ کو کیا پروا تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچی۔ ہم نے کمرے میں قدم رکھا۔ مصطفیٰ تیزی سے مڑا اور اس نے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ میں نے چٹخنی لگنے کا کھٹکا سنا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ میں جال میں پھنس چکی ہوں۔ مصطفیٰ نے دھمکی بھرے لہجے میں بات کی۔ صاف نظر آتا تھا کہ میری خیر نہیں۔ "تم اب یہاں سے نہیں جاسکتیں۔ اب تمھیں دو مہینے میرے پاس رہنا پڑے گا اور میں اس عرصے میں اس بات کا پکا بندوبست کر لوں گا کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہو۔ کل میں تمھیں گاؤں واپس لے جاؤں گا۔"

سراسیمگی۔ مجھے اغوا کیا جارہا ہے۔ قبل ازیں وہ میرے بچوں کو اغوا کر چکا تھا۔ یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا؟ خدایا! یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ میں نے اپنے اندیشوں کو چھپانے کی کوشش کی۔ ہمت سے کام لو۔ گھبراؤ نہیں۔ "مصطفیٰ، دروازہ کھول دو۔ ابھی، ورنہ میں شور مچا کر گھر سر پر اٹھالوں گی۔" چیخو چیخو۔ مجھے پروا نہیں۔" مجھے یہ خیال نہ آیا کہ میں ایسے شخص کو دھمکا رہی ہوں جو رائے عامہ کو کبھی خاطر میں نہ لایا تھا۔ اگر نچلی منزل میں مہمان جمع ہیں تو پھر کیا ہوا۔ میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس نے میری کلائیاں دبوچ کر مجھے غسل خانے میں دھکیل دیا۔ میں نے دروازہ بند ہونے کا کھٹکا سنا۔ میں مدد کے لیے شور مچاتی رہی۔ میں چاہتی تھی کہ میری چیخ پکار کسی کے ضمیر میں تو سرایت کر جائے۔ ضمیر کسی کا بھی سہی۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ مصطفیٰ مجھے اغوا کرلے گا۔ وہ گیدڑ بھبکی نہیں دے رہا تھا۔

مصطفےٰ کے بھائی اور ان کی بیویاں نچلی منزل میں تھیں۔ وہ دوڑے ہوئے اوپر آئے۔ مصطفےٰ کی بہو، مریخہ، بھی نیچے چلی آئی۔ وہ صدمے سے دم بخود کھڑی رہ گئی۔ اس نے اپنے خسر کو گھور کر دیکھا اور ہمت کر کے چلائی۔ "ڈیڈی، آپ یہ نہیں کر سکتے!" مصطفےٰ اس پر برس پڑا۔ "نکل جاؤ کمرے سے"۔ وہ دوڑ کر باہر چلی تو گئی لیکن جو کہنا چاہتی تھی بہر حال کہہ گئی۔

میں نے مصطفےٰ سے بات کی۔ "مصطفےٰ، تم میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے۔" "میں کر سکتا ہوں اور کروں گا۔ تمہارے والدین میری پشت پر ہیں۔" میں نے کہا کہ مجھے ان سے بات کرنے دو۔ مصطفےٰ اس پر تیار نہ ہوا۔

اس اثنا میں میری خالہ میرے بارے میں فکر مند ہو چکی تھیں۔ میں گھر واپس نہ آئی تھی۔ لندن سے میری بہن منو کا فون آیا تھا۔ ادھر میں اپنے پاؤں ایک زخمی درندے کے کچھار میں جا گھسی تھی۔ میری زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مصطفےٰ کو فون کیا۔ مصطفےٰ نے اختر خالو سے بات کی۔ "تہمینہ واپس نہیں جا رہی۔ اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" "کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟" "نہیں۔ وہ مصروف ہے --- نصیبہ کے لیے کچھ کر رہی ہے۔"

اختر خالو کو دال میں کالا نظر آیا۔ انہوں نے لندن منو کو مطلع کر دیا۔ منو نے فوراً جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اس نے وزیر اعلیٰ کے گھر فون کیا۔ اخبار والوں سے بات کی۔ میرے دوستوں، جگنو اور نجم سے رابطہ کیا جو "فرائیڈے ٹائمز" نکالتے ہیں۔ یہ سب کچھ لانگ ڈسٹینس کے محفوظ فاصلے سے ہوتا رہا۔ خبر پھیل گئی۔ میری وکیل عاصمہ جہانگیر سے رابطہ کیا گیا۔ وہ اگلی صبح تک انتظار کرنا چاہتی تھی تاکہ مجھے حبس بیجا میں رکھنے اور اغوا کرنے کی کوشش کے الزام میں مصطفےٰ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے جا سکیں۔ میں بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس موقع پر قانونی باریکیوں کو سمجھنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ رہا ہو جاؤں۔ اُدھر باقی لوگ تو میری رہائی کے لیے گفت و شنید میں مصروف تھے، ادھر مصطفےٰ کا بیٹا، بلال، اس کار کا بندوبست کر رہا تھا جس میں ڈال کر مجھے کوٹ ادو پہنچایا جانا تھا۔

مصطفےٰ نے ویلیم کی شیشی اٹھائی، پیچ دار ڈھکنا کھولا، دو گولیاں ہتھیلی پر الٹیں اور میرے حوالے کر دیں۔ جب میں نے کھانے سے انکار کیا تو مجھے انہیں نگل جانے پر مجبور کیا گیا۔ گولیاں زبردستی میرے منہ میں ٹھونس کر وہ اوپر سے پانی انڈیلنے لگا۔ یہ وہی ترکیب تھی جو انگلستان میں اپنے کتوں کے ساتھ استعمال کرتا رہا تھا۔ مجھے اچھو لگ گیا۔ ویلیم کی گولیوں سے میرے اعصاب کو کوئی تسکین نہ ملی۔ میرا تناؤ شدید سے شدید تر ہو

گیا۔

مصطفےٰ سمجھا کہ میں خاصی پُر سکون ہو چکی ہوں۔ وہ دوائیوں کی اثر آفرینی پر خاصا یقین رکھتا تھا۔ اس نے مجھے اجازت دی کہ امی سے فون پر بات کر لوں۔ "انہیں بتاؤ کہ تم میرے پاس رہنے پر راضی ہو گئی ہو۔" میں نے جھوٹ بولا۔ اس کی بات دہرانے کی ہامی بھر لی۔ اس نے فون ملایا۔ میں اپنے قول سے پھر گئی۔ "اگر آپ نے مجھے اس شخص کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ آپ کیسی ماں ہیں؟ میں ساری دنیا کو بتا دوں گی کہ مجھے آپ کے جبر کے سبب خودکشی کرنی پڑی۔"

جب مصطفےٰ کہیں ادھر ادھر ہوا تو میں نے ایک چھوٹا سے رقعہ لکھا۔ وہ میں نے شیری کی پندرہ سالہ بیٹی، آمنہ، کے حوالے کیا۔ پلیز، کہیں جا کر اس نمبر پر فون کرو۔ ان سے کہو کہ یہاں آ کر مجھے بچا لیں۔"

ہماری ننھی سی جان آمنہ۔ ایسی خفیہ کارروائی اس کے مزاج سے بالکل مناسبت نہ رکھتی تھی۔ جب وہ میرا رقعہ ہاتھ میں پکڑے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے یہ دعا مانگ رہی تھی کہ کسی طرح رقعے کو گھر سے باہر سمگل کرنے کا موقع مل جائے تو اس کا خون خشک ہوا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ کہے دیتا تھا کہ وہ کوئی غلط کام کر رہی ہے۔ وہ مصطفےٰ کی نظر میں آ گئی۔ اس نے آمنہ کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے رقعہ چھین لیا۔ رقعہ پڑھنے کے بعد اس نے آمنہ کی خوب خبر لی۔ وہ میری طرف آنسو بھری آنکھوں سے غم زدہ ہو کر دیکھتی رہی۔ "کم از کم میں نے کوشش تو کی۔"

والد صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ ایک سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ مصطفےٰ نے ان سے کہا تھا کہ اگر اسے موقع دیا جائے وہ مجھے اس کے پاس ہنسی خوشی لوٹ آنے پر راضی کر لے گا۔ میں چیخ چیخ کر کہتی رہی کہ مجھے بالجبر روکا جا رہا ہے۔ میری مرضی کے خلاف۔ والد صاحب نے مصطفےٰ سے بات کی۔ دو ٹوک لہجے میں۔ "اسے چھوڑ دو۔ اسی وقت۔"

اس حکم کے فوراً بعد مصطفےٰ نے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھ پر ابھی صدمے کی کیفیت تھی۔ میں باہر آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ مصطفےٰ کسی کا نمبر ملا رہا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کسے فون کر رہا ہے۔ ضرور کسی اہم شخص سے بات کرنا چاہتا ہو گا۔ وہ امی کو فون کر رہا تھا۔ "ماں جی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تہمینہ آپ سے اتنی جلتی کیوں ہے۔ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ آپ اس کے لیے مسئلہ کیوں بنی ہوئی ہیں۔ میں چونکہ آپ کا احترام کرتا ہوں، اس لیے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں وہ اس سے برداشت نہیں ہوتا۔"

میرا جی متلانے لگا۔ یہ شخص بیمار تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اس نے جلدی سے

فون واپس رکھ دیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا اور وہ جھینپا جھینپا نظر آ رہا تھا۔ "میری بیچاری امی۔ تم نے انھیں اور میرے گھر والوں کو جی بھر کے بیوقوف بنایا ہے۔" میں باہر آ گئی۔

میں بچ بچ قلاش ہو چکی تھی۔ میرے پاس نام کو پیسے نہ تھے۔ میں نے زرمینہ سے بات کی اور کہا کہ مجھے تھوڑے سے روپے ادھار دے دو۔ زرمینہ کے خسر، صادق حسینؒ قریشی، کو میری مالی حالت کا پتا چلا تو انھیں صدمہ پہنچا۔ انھوں نے مجھے دس ہزار روپے بھجوا دیے۔ مجھے یاد ہے کہ میں جانماز پر بیٹھی رو رو کر انھیں دعائیں دیتی رہی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنے رحمدل ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں کتنی نجابت ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اصول پرست آدمی ہیں جو حق کا ساتھ دیتے ہیں، باطل کا نہیں۔ یہ توفیق تو والد صاحب کو بھی نہیں ہوئی تھی۔

اب مجھے طلاق اور صرف طلاق درکار تھی۔ اس سے کم پر میں کسی طرح راضی نہ ہو سکتی تھی۔ میں مصطفیٰ کھر کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کا ایک ایک لفظ، ہر لفظ کا ایک ایک رکن کئی کئی بار پڑھ چکی تھی۔ اب زندگی کے اس باب پر تمت لکھنے کا وقت آ گیا تھا۔ والد صاحب مصطفیٰ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔ مصطفیٰ تیار ہو گیا لیکن بعض شرطیں عائد کر دیں۔ وہ چاہتا تھا کہ لندن میں جو املاک ہے وہ اسے مل جائے۔ بچے اس کے پاس رہیں۔ میں نے اسلام آباد میں اپنی جائیداد بیچ کر لاہور میں جو مکان خریدا تھا وہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ مجھے بالکل محتاج کر دینا چاہتا تھا والد صاحب نے اتفاق کیا۔ "تہمینہ کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑو۔"

اپنی بیٹی کے لیے کچھ مانگنا والد صاحب کے لیے باعث عار تھا۔ وہ میرا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ میرے بچوں کو مصطفیٰ کھر لے گیا۔ لندن میں جو املاک تھی اس کے لیے وہ مختار نامہ حاصل کر چکا تھا۔ میرے چھوٹے سے گھر میں وہ آج مقیم تھا۔ میرے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ تھی۔ والد صاحب کے گھر کے دروازے تو خود بخود مجھ پر بند ہو گئے تھے کیونکہ وہ عدیلہ کے لیے کھلے تھے۔ امی کی خواہش تھی کہ میں اس سلسلے میں کوئی سمجھوتا کر لوں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں مطلوب اور اس کے گھر والوں سے ملوں اور انھیں قائل کروں کہ میں پاگل ہو گئی تھی اور اسی دیوانگی کے عالم میں میں نے "بیچاری بے گناہ عدیلہ" پر کیچڑ اچھالا تھا۔ عدیلہ کے معاشقے کی خبر باہر نکل گئی تھی اور اس کی شادی کھٹائی کا شکار تھی۔ امی چاہتی تھیں کہ میں انھیں جا کر بتاؤں کہ میں مصطفیٰ کو چھوڑنے کے لیے بہت بے قرار تھی۔ اسی لیے میں نے اتنی رکیک حرکت کی اور عدیلہ کی عشق بازی کا سارا قصہ خود ہی گھڑ لیا۔ میں اس مضحکہ خیز تجویز پر ایک لمحے

کے لیے بھی غور کرنے کو تیار نہ تھی۔ مجھے متنبہ کیا گیا کہ اگر میں نے ان کے کہے پر عمل نہ کیا تو وہ مالی طور پر میری مدد نہیں کریں گی۔ میں نے اپنی "بیچاری ننھی بہن" کی خاطر مزید جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا۔

میں نے اخباروں کو ایک بیان جاری کیا جس میں بتایا کہ میں طلاق اس بنا پر لے رہی ہوں کہ ہم دونوں میں مطابقت کا فقدان ہے۔ اس کے بعد مصطفیٰ اور میں نے اتفاق کر لیا کہ آئندہ ایک دوسرے کے بارے میں یا اپنی شادی کے متعلق اخباروں کو مزید کوئی بیان جاری نہیں کریں گے۔ میں نے یہ سب کچھ طلاق کی خاطر منظور کر لیا۔ میں مجبور تھی۔ مصطفیٰ کھر، شیرِ پنجاب، کا ایک بار پھر بال تک بیکا نہ ہو سکا۔

وہ طلاق کے کاغذات پر دستخط کرنے آیا۔ میں والد صاحب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ عربی اور تاج الملک اس کے ہمراہ گواہوں کے طور پر آئے تھے۔ مصطفیٰ آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میرے بچوں کو کمرے میں بلا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے بچوں سے کہا۔ "میرے بچو، میں چاہتا ہوں کہ تم گواہ رہو کہ میں تمھاری امی سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ وہ میری گھر والی بنی رہیں۔ مجھے تمھاری امی سے محبت ہے۔ لیکن تمھاری امی مجھ سے الگ ہونا چاہتی ہیں۔"

جوڑ توڑ کا استاد۔ بے حیائی کا برقع اوڑھنے والا سیاست دان جھوٹ موٹ کے آنسو بہا کر میرے بچوں کی عقل پر پردہ ڈالتا رہا۔ میں نے دل میں کہا، مصطفیٰ، تم کس غضب کے اداکار ہو۔ میرا چہرہ تاثر سے عاری تھا۔ میری آنکھوں سے کوئی آنسو نہ ٹپکا۔ مصطفیٰ نے دستخط کر دیے۔ بچے رونے لگے۔ انھوں نے میری منت کی کہ میں ان کے ابو سے الگ نہ ہوں۔ ان کو ابھی ان باتوں کی سمجھ کہاں تھی۔ میں نے دستخط کر دیے۔ میرے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں اب بیگم مصطفیٰ کھر نہ رہی تھی۔ بس فقط تہمینہ۔ والد صاحب کا نام اب بھی میری ذات کو کسی تیزابی مادے کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

ہم بطور میاں بیوی آخری بار ہم کلام ہوئے۔ تاج اور عربی اور میرے بچے ہمارے ارد گرد کھڑے تھے۔ "مصطفیٰ، امید کرتی ہوں کہ تم اپنی کوئی چیز یہاں بھولے تو نہیں جا رہے۔ پندرہ برس گزر جانے کے بعد مجھے امید ہے کہ میں نے تمھاری کوئی چیز رکھ نہیں لی ہوگی۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ شکست خوردہ۔ "تہمینہ مجھ سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی ہو۔" "آج بطور انسان تم نے وہ کچھ کھو دیا جس کی، خواہ تمھیں کتنا کچھ اور مل جائے، کبھی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ تمھارے پاس اور سب کچھ ہے۔ تم نے مجھ سے سب

کچھ چھین لیا ہے۔ لیکن آج کے بعد تم یہ کبھی نہ کہہ سکو گے کہ تہمینہ تمہاری بیوی ہے۔ تم نے مجھے کھو دیا۔ میں نے اپنی ذات کے سوا تمہیں کسی چیز سے محروم نہیں کیا۔ یہ ہے وہ چیز جو تم آج چھوڑ کر جا رہے ہو۔" وہ بچوں کو لے کر چلا گیا۔ میرے خالو نے کہا کہ میں بہت سرد مہر اور سنگدل ثابت ہوئی اور مصطفیٰ نرم دل انسان ہے۔ انہیں حقیقت کا کیا پتہ۔

اخباروں نے عدیلہ اور مصطفیٰ کے بارے میں ایک بیہودہ سی کہانی چھاپ دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ کہانی انہیں مجھ سے ملی ہے۔ میں نے اس کی تردید کی۔ میں نے حقائق پر پردہ ڈالنا چاہا۔ میں نے عدیلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایسی بہن ہے جس سے میں پیار کرتی ہوں، جس کا خیال رکھتی ہوں۔ جھوٹ بول کر مجھے سخت اذیت پہنچی۔ لیکن عدیلہ کی شادی کی خاطر میں جھوٹ بولنے پر مجبور تھی۔ مطلوب نے مجھے برا بھلا کہا۔ کہانی عام ہو چکی تھی۔ لوگوں نے عدیلہ کو مصطفیٰ کے ساتھ دیکھا تھا۔ ان کی عاشقانہ ملاقاتیں اتنی خفیہ نہ تھیں جتنی وہ سمجھے بیٹھے تھے۔ ہماری طلاق سے قیاس آرائیوں کا سیلاب امڈ آیا۔ میں نے بند باندھنے کی کوشش کی تاکہ نقصان کم ہو۔ تسنیم نے مطلوب کو بتایا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سچ ہے۔ مطلوب کو عدیلہ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اس کی کائیاں بیوی نے اس پر خوب منتر پھونکا تھا۔ اسے کسی بات پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ لیکن اسے جلدی پتہ چلنے والا تھا کہ جسے وہ سچ سمجھتا رہا تھا وہ جھوٹ ہے اور جسے جھوٹ سمجھتا رہا تھا وہ سچ ہے۔

زرمینہ، منو اور روبینہ نے چٹان بن کر میرا ساتھ دیا۔ میرے خالو عزیز، ان کی بیگم خالہ یاسمین، خالہ ثمر اور میری رشتے زاد نگین، سب نے بڑی استقامت دکھائی۔ اختر خالو کے پاؤں تو خاص طور پر ایک دفعہ بھی نہ لڑکھڑائے۔ مجھے اپنی زندگی دوبارہ شروع کرنی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں سے اور کیسے آغاز کروں۔

عاشورہ کے روز میں نے امی کو فون کیا اور کہا۔ "میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ آج محرم کی دس تاریخ ہے۔ میں ان سب لوگوں کو بددعا دیتی ہوں جنہوں نے مجھ پر ظلم ڈھائے۔ میں خدا سے دعا کروں گی کہ جس طرح یزید کو امام حسین پر ظلم ڈھانے کی سزا ملی تھی اسی طرح انہیں بھی سزا ملے جنہوں نے مجھے ستایا۔" میں نے والدین کو بتایا کہ میں ان سے تعلق ختم کر رہی ہوں۔ میں ان کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔

میں نے مصطفیٰ کو فون کیا اور یہی باتیں اس کے آگے دہرائیں۔ میں نے اسے بتایا۔ "والد صاحب نے تمہیں جو مختار نامہ دیا تھا اسے منسوخ سمجھو۔ میری مسٹر

درانی سے اب کوئی شناسائی نہیں۔ میں یہ ماننے سے انکاری ہوں کہ میرا بھی کوئی خاندان ہے۔ ہم سے متعلق ان کے ساتھ تم جو بھی معاملات طے کرتے رہے ہو گے وہ کالعدم قرار پاتے ہیں۔ اب ایسی کسی بات کی کوئی حیثیت نہیں رہی جسے والد صاحب تمہاری خاطر انجام دینے کو اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھتے ہوں۔"

میں انکل صادق حسین قریشی سے ملی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ مصطفیٰ سے کہیں کہ وہ لاہور میں میرا مکان خالی کر دے۔ مصطفیٰ انکل صادق سے ملنے آیا۔ سودے بازی کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ اگر لندن والی املاک اسے دے دی جائے تو اس کے بدلے مکان خالی کر دے گا۔ میں نے بھی اسی جیسے ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ میں بھی بہت کچھ سیکھ چکی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفیٰ کھر بن کر دکھاؤں گی۔ ایک دفعہ اور سہی۔ اب کسی بات کی اہمیت تو رہی نہ تھی۔ ذاتی مفاد اور بچانے ذات کو اولیت حاصل تھی۔ سچ ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میں بزور اسے مکان سے بے دخل نہیں کر سکتی۔ مکان میری بیٹیوں کے نام تھا۔ بیٹیاں اس کی تحویل میں تھیں اور مکان پر وہ قابض بھی تھا۔ نواب صادق حسین قریشی نے ضمانت دی کہ میری لندن کی املاک مصطفیٰ کے حوالے کر دی جائے گی۔ میں نے مختار نامے پر دستخط کر کے مصطفیٰ کو تھما دیا۔ میں نے مختار نامے کی برطانوی سفارت خانے سے تصدیق نہیں کرائی۔ جہاں تک برطانوی قانون کا تعلق ہے یہ دستاویز کاغذ کے بیکار پرزے سے زیادہ نہ تھی۔

عدت کے تین مہینوں کے دوران مصطفیٰ مجھے بے وقر کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے ان تمام جگہوں کو نشانہ بنایا جہاں سے مجھے مالی طور پر سہارا مل سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر میں نے خود کو مالی اور جذباتی طور پر غیر محفوظ محسوس کیا تو پھر اس کے در پر حاضر ہو جاؤں گی۔ اسے یقین تھا کہ بعض لوگ رفتہ رفتہ مجھ سے کنارہ کر لیں گے اور بہت سے اچانک میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ ایک اور سطح پر وہ چاہتا تھا کہ مجھے اس اہانت کا تجربہ ہو جو مطلقہ کے حصے میں آتی ہے۔ اسے پتہ تھا کہ میرے گھر والوں کو میری نئی حیثیت سے جلد ہی گھن آنے لگے گی اور وہ مجھ پر مصطفیٰ کے پاس لوٹ جانے کے لیے دباؤ ڈالیں گے۔

مصطفیٰ اب مجھے دق کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے میری کار چھین لی۔ اب ایک ہی مالی سہارا رہ گیا تھا جس پر میں اس وقت تکیہ کر سکتی تھی جب بچاؤ کی اور کوئی صورت نظر نہ آئے۔ مصطفیٰ اس مالی سہارے کی بیخ کنی میں مصروف ہو گیا۔ وہ بار بار میرے والدین کے پاس گیا اور انہیں قائل کر کے چھوڑا کہ عدیلہ کے بارے میں ساری کہانی

سن گھڑت تھی۔ اسے میں نے بیٹھ کر گھڑا تھا۔ وہ یہی تو سننا چاہتے تھے۔ فوراً یقین لے آئے۔ ان کے سینے سے بوجھ اتر گیا۔ امی کو عدیلہ اور اس کی شادی کو ہر قیمت پر بچانے کے چکر میں کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اس لیے وہ مصطفےٰ کے کہے پر ایمان لے آنے کے لیے اور بھی زیادہ بے قرار تھیں۔ وہ ہنسی خوشی اس کے جھکے میں آگئیں۔ والد صاحب الگ تھلگ رہے۔ زرمینہ، منو اور روبینہ اس سیاسی ڈھکوسلے کے ہاتھوں جھانسا کھانے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ مجھے نانی اماں کی کمی پہلے سے بھی زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ان لوگوں کے دام میں نہیں آؤں گی۔ امی امید لگائے بیٹھی تھیں کہ میں پھنسی کہ پھنسی۔

نعمی اور جیلو لندن گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں جگنو اور نجم نے ان کی جگہ پُر کی جو "فرائیڈے ٹائمز" نامی ہفت روزہ کے کرتا دھرتا ہیں۔ انھوں نے میرے پاس باقاعدگی سے آتے رہنے کا خاص خیال رکھا حالانکہ ان پر اہل لاہور کو اپنے حکمرانوں کی کارستانیوں سے باخبر رکھنے کا بڑا دباؤ تھا۔ وہ اپنے قارئین کو بتاتے رہتے تھے کہ حکمرانوں نے کتنے کام بنائے، کتنے بگاڑے۔

اپنی وکیل عاصمہ سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ میں نے طلاق کے سلسلے میں دوبارہ اسی سے رجوع کیا تھا۔ اس نے اپنی حیرت کا زبانی اظہار کیا۔ پوچھنے لگی کہ کیا اس بار میں واقعی طلاق لینا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے چہرے کے تیور دیکھ کر بھانپ گئی کہ میں کچھ ٹھان کر آئی ہوں۔ اس نے میرا مقدمہ لے لیا اور میری جانب سے مصطفےٰ کا مقابلہ کرنے میدان میں اتر آئی۔

دن گزرتے گئے۔ اس اثنا میں میں نے اپنے ان تمام تعلقات کا جائزہ لینا شروع کیا جو آج تک میں نے قائم کیے تھے۔ مجھے یہ بات خاص طور پر محسوس ہوئی کہ ناانصافی کرنے میں میرے گھر والے مصطفےٰ سے کم نہ تھے۔ کوئی میری مدد کرنے کے لیے آگے نہ آیا تھا۔ ایک وہ وقت تھا جب میں ننھی سی تھی اور گرتی پڑتی پھرتی تھی اور انھوں نے بڑے فخر سے مجھے چلنا سکھایا تھا اور میں بے یقینی کے عالم میں پہلی بار چند قدم چلی تھی۔ اب وہ مجھے رینگتے دیکھ رہے تھے اور اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔

زرمینہ کی حیثیت خصوصی تھی۔ اس نے نانی اماں کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی۔ وہ جبلی طور پر سمجھ جاتی کہ اس سے کس بات کی توقع کی جارہی ہے اور اپنا کردار پوری طرح نباہتی۔ نانی اماں نے ہمیں ایک رشتے میں پرو دیا تھا۔ ہم ساتھ ساتھ رہے، ہمیں کوئی جدا نہ کر سکتا تھا کیونکہ ہم دونوں کو نانی اماں سے محبت تھی جو آج بھی ہماری نگہبان ہیں، ہمیشہ کی طرح، ہمیشہ کے لیے۔

جس دوران میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی، لڑکھڑاتی تھی، گر پڑتی تھی اور پھر، ذرا گڑبڑا کر، اٹھ کھڑی ہوتی تھی، مصطفےٰ برابر مجھ سے ملتا رہا۔ ایک بار وہ اپنے بھائیوں اور ان کی بیگمات کا وفد لے کر میری پاس آیا۔ انھوں نے مجھے پرچانا شروع کیا تاکہ میں اپنا ارادہ بدل لوں اور لوٹ آؤں۔ بھائیوں نے مصطفےٰ کی وکالت کی۔ میں ان کا مطالبہ تسلیم نہ کر سکی۔ میں نے اپنی طرف سے ایک مطالبہ پیش کر دیا۔ میں چاہتی تھی کہ مصطفےٰ اپنے اہل خاندان کی موجودگی میں اعتراف کرے۔ میں چاہتی تھی کہ جو کچھ اس کے اور عدیلہ کے درمیان ہوا تھا ٹھیک ٹھیک بیان کر دے۔ اپنی سالی سے زنا کاری کی گھٹیا تفصیلات سے پردہ اٹھا دے۔ مصطفےٰ یہ اعتراف کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

وہ ایک بار اور مجھ سے ملنے آیا۔ اکیلا۔ اس ملاقات کے دوران جب اس کے اپنے ضمیر، میرے اور اللہ کے سوا کوئی گواہ نہ تھا اس نے سب کچھ پوست کندہ بیان کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ عدیلہ سے تین بار ملا تھا۔ اس میں وہ موقع بھی شامل ہے جب میں نے ان دونوں کو ساتھ واپس آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مان لیا کہ وہ اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی اس پر شیطان چڑھ گیا تھا اور اسے معصیت پر اکساتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شہوت کی وجہ سے اسے اپنے پر قابو نہ رہا تھا اور اس نے میرے ردعمل کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ یہاں تک کہ میں واقعی اسے چھوڑ گئی۔ وہ رو پڑا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے معاف کر چکی ہوں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور فوراً مجھ سے واپس آجانے کے لیے کہا۔ میں شاید کمزوری دکھا جاتی لیکن اس فوری ردعمل نے مجھے بچا لیا۔ اس طرح کے ردعمل سے مجھے بارہا سابقہ پڑ چکا تھا۔ جب بھی وہ کوئی غلط حرکت کرتا تو بعد میں آکر میرے قدموں میں لوٹنے لگتا اور میرے جذبۂ ترحم کو ابھار کر اپنا کام نکالنا چاہتا۔ جونہی میں اسے معاف کرتی، وہی پرانا مصطفےٰ دوبارہ جی اٹھتا۔ جس معاملے پر ناچاقی ہوئی تھی اسے بھلا دیا جاتا۔ اس کی زندگی پرانے ڈھرے پر چلتی رہتی۔ وہ ایسا مرد تھا جو اجتماعی شعور سے محروم تھا۔ اس کی یادداشت تختۂ سیاہ جیسی تھی اور میری معافی بھیگی ہوئی پونچھن۔ میں نے مصطفےٰ پر واضح کر دیا کہ میں نہ تو کبھی لوٹ کر آؤں گی نہ اسے معاف کروں گی نہ ان زیادتیوں کو بھلاؤں گی جو میرے ساتھ روا رکھی گئی تھیں۔ خواہ کچھ ہو جائے۔

اس نے اپنے حملے کا رخ اب میرے کردار کی طرف موڑ دیا۔ وہ لوگوں سے ملتا، خاندان اور احباب کے پاس جاتا اور انھیں بتاتا کہ میرے الگ ہونے کی وجہ یہ ہے

کہ میں "مادر پدر آزاد" عورت بننے کی خواہاں ہوں۔ اس نے یہ بے پر کی بھی دہرائی کہ اسے چھوڑ جانے کے لیے مجھے کوئی بہانہ درکار تھا۔ میں نے مدیحہ کو بدنام کر کے اپنا کام نکال لیا۔ ہوا اصل میں کچھ بھی نہ تھا۔ سب میرے ذہن کی اختراع تھی۔

اس نے مجھ پر یہ بھپی ہوئی چوٹیں اس وقت کیں جب یہ سب کچھ کہنے سے پہلے وہ میرے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر چکا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو رہی سہی عزت باقی ہوگی اسے بھی مصطفیٰ نے خود اپنی کارستانی سے خاک میں ملا دیا۔ میری نظر میں مصطفیٰ کھر بے معنی ہو کر رہ گیا۔ میں اسے کیا سمجھتی رہی اور وہ کیا نکلا۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ وہ میرے ذہن میں قائم تصور کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

میرا گھر مجھے واپس مل گیا تھا۔ اس بات سے مجھے بڑا سکون پہنچا۔ مجھے دوسروں کے گھروں میں رہنا ناپسند تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے میں ازسر نو جلاوطن ہو گئی ہوں۔ بچوں کی خاطر میں نے مصطفیٰ کے ساتھ شریفانہ تعلق برقرار رکھا۔ میں علی کی سالگرہ کے موقع پر اس کے کینال بینک والے گھر گئی۔

ہماری لنچ پر ملاقات ہوئی۔ مصطفیٰ چاہتا تھا کہ میں آؤں اور بچوں سے ملوں۔ یہ اہم ملاقات ثابت ہوئی۔ میں نے خود ترحمی کے بغیر، اپنے پر رقت طاری کیے بغیر، اس سے بات کی۔ "مصطفیٰ، تمہیں پتہ بھی ہے کہ تم مجھ سے سب کچھ چھین چکے ہو۔ پندرہ سال پر محیط جدوجہد۔ میرا خاندان، میرے بچے، میری جوانی، تم خود اور ہر وہ چیز جس پر مجھے یقین تھا۔ مجھے ازسر نو زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں نے جو کچھ تم سے سیکھا ہے اسے کام میں لانا چاہیے۔" مصطفیٰ نے سیاست دانوں والا رویہ اپنا لیا۔ جواب ندارد۔

وہ آخر کار پی پی پی میں شامل ہو گیا۔ پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے اس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ اسلام آباد سے فون پر مجھ سے کہا کہ داتا صاحب جا کر اس کے لیے دعا کروں۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہاری دعا یہی ہوگی کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اللہ سے دعا کی کہ مصطفیٰ کو سیدھی راہ دکھائی جائے۔ میں نے خلوص سے دعا مانگی۔ میرے دل میں کوئی چھل کپٹ نہیں تھی۔ میں قدرت کو فریب دینے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

ایک اور مرتبہ اسلام آباد سے جب مصطفیٰ نے مجھے فون کیا تو لگتا تھا۔ اس کا اضطراب دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ وہ فون پر سسکیاں لیتا رہا۔ "پلیز، یاد رکھنا، میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جس طرح میں نے تمہیں چاہا ہے اس طرح کسی عورت کو نہ چاہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں گنوا بیٹھا ہوں۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

میں اسے کوئی امید نہ دلانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ذرا ہوش میں آئے اور اس حقیقت کو قبول کر لے کہ ہمارے درمیان تعلق ختم ہو چکا۔ لنچ پر میں بار بار مصطفیٰ سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوال کرتی رہی۔ میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ میرا مستقبل اسے کیسا نظر آ رہا ہے۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ شاید میں کہیں پر کام کرنے لگوں۔ سماجی بہبود میں خود کو مشغول کر لوں۔ میں نہیں چاہتی کہ جو کچھ میں نے سیکھا اور محسوس کیا ہے وہ رائیگاں چلا جائے۔" اس نے میری طرف رخ کیا اور تحقیر آمیز لہجے میں بڑے سکون سے کہا۔ "تہمینہ، تم اب کچھ بھی نہیں۔ کسی زمانے میں تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تم بیگم تہمینہ مصطفیٰ کھر تھیں۔ اب تم محض تہمینہ درانی ہو۔ حد یہ کہ جب تم لوگوں کو فون کرتی ہو تو خود کو میری سابقہ بیوی کے طور پر متعارف کرانے پر مجبور پاتی ہو۔ تمہیں دوسروں کو بتانا پڑتا ہے کہ تم ایک زمانے میں مصطفیٰ کھر کی بیوی رہ چکی ہو۔ تم مسز کھر ہوا کرتی تھیں۔ لوگ تم سے ملتے ہیں کیونکہ تم انہیں میرے بارے میں دلچسپ قصے سنا سکتی ہو۔ تمہاری ان کہانیوں کا ذخیرہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ شاید ایک سال تک کام دے جائے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ پھر تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ اس کے بعد تم اپنے تمام نام نہاد دوستوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ وہ تم سے اکتا جائیں گے۔ عورتیں تمہیں اپنے گھروں میں قدم نہ رکھنے دیں گی کیونکہ انہیں تم سے ڈر لگتا رہے گا۔ تم ان کی شادیوں کے لیے خطرہ ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ سیاسی طور پر کام کر سکتی ہو اور اس میدان میں قدم رکھنا تمہارے لیے ممکن ہے تو بھی تم سے دفتروں کے باہر گھنٹوں انتظار کرایا جائے گا۔ وجہ یہ کہ تم نے اپنے نام سے میرا نام الگ کر دیا ہے۔"

میں آنسو پی کر یہ تجزیہ سنتی رہی۔ غالب کا ایک شعر بھٹک کر میرے ذہن میں آ نکلا:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

میں نے جو باتیں سنیں ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ وہ دستانہ اتار کر میرے مقابلے میں ڈٹ گیا تھا۔ اس نے میرے منہ پر اس دستانے سے طمانچہ رسید کیا تھا۔ میں گھر لوٹی تو اس کے الفاظ بدستور میرے کانوں کو ڈس رہے تھے۔ میں نے اپنی زندگی پر دوبارہ غور کیا۔ کسی زخمی پرندے کی طرح آخری بار فضا میں بلند ہوئی اور نیچے اتر آئی۔ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے۔

میں بے قید تھی۔ میں آزاد تھی۔ مسز کھر نہ رہی تھی۔ مجھے استعمال کیا جا چکا تھا۔ اب مجھے بیکار سمجھ کر پھینکا جا رہا تھا، جیسے گنے کے چبائے ہوئے پھوک کو تھوک دیا جاتا ہے۔ اس نے میری طاقت سے جلاوطنی اور اسیری کے دوران کام لیا تھا۔ اس وقت میں اس کی واحد حلیف تھی۔ اسے میری ضرورت تھی۔ وہ اپنی محرومیوں کا غصہ مجھ پر نکالا کرتا تھا تاکہ پُر سکون پبلک امیج کے ساتھ دنیا کا سامنا کر سکے۔

میں نے عدیلہ کے ساتھ اس کے تعلقات پر غور کیا۔ میرے لیے ان تعلقات کی وجوہ سمجھنا ضروری تھا۔ وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ ایسے وقت نمودار ہوئی جب اس پر اپنی حد سے بڑھی ہوئی توانائی کا دورہ پڑا ہوتا تھا۔ کتے یا کنیزیاں یا کبوتر نہ سہی، عدیلہ سہی، اس بات سے کہ ایسا تعلق رکھنا حرام ہے اسے اور انگیخت ہوتی۔ اس فعل کی نری خباثت اسے زیادہ بڑے پیمانے پر توانائی خارج کرنے کا موقع فراہم کرتی تھی۔ یوں وہ ہمارے طبقے سے اپنا انتقام لے رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ عدیلہ کی جو کھم بھری دلکشی کا نتیجہ ابتری کی صورت میں برآمد ہوگا۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں موجود ہوں اور میں استحکام پیدا کرنے والے عامل کا کام انجام دوں گی۔ ایک انتہا درجے کی صابر و شاکر عورت جو شہوت کا طوفان گزر جانے کے بعد ہمارے بگڑے ہوئے گھر کی تعمیر نو میں چپ چاپ منہمک ہو جائے گی۔ صبر شاید میرے اوصاف حمیدہ میں شامل ہو لیکن وہ یقیناً لامحدود نہیں تھا۔ میں نے چار دفعہ اس سے قطع تعلق کیا۔ ہر بار اس نے مختلف انداز میں میرے خلاف انتقامی کارروائی کی جب اس نے میرے بچوں کو اغوا کر کے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا تھا تو اسے ایسا کرنے پر اس کے "بھارتی رابطے" نے اکسایا اور ورغلایا تھا۔ میں اچانک اس کی سلامتی کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔ اس نے ٹھیٹ جاگیر دار کا سا ردعمل ظاہر کیا جس کے لیے تاوان کی غرض سے اغوا کرنا زندگی بسر کرنے کا ایک انداز ہے۔ جیل میں رہ کر اسے لگا کہ وہ بالکل غیر محفوظ ہے اور اس کیفیت کے زیر اثر مجھے کھو بیٹھا۔ وہ مجھ سے ضرورت سے زیادہ کام لینا چاہتا تھا۔ جب میں خود اپنے سیاسی عہد و پیمان کے بہکائے میں آ کر اس کے پاس لوٹ آئی تو وہ سمجھ گیا کہ مجھے اپنے پہلو میں رکھنا ضروری ہے۔ اس نے اپنے عدم تحفظ کے احساسات پر قابو پایا اور مجھے مردوں کی اسی دنیا میں بھیج دیا جس کے خیال سے اس کے دل میں اندیشے جنم لیتے تھے۔ یہ مصطفیٰ کا "نظریۂ ضرورت" تھا۔ کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچائے رکھنے کی جبلت نے اسے میرے ذہن کو اپنے ڈھب کا بنانے پر مجبور کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس کے کہے پر اسی صورت میں عمل کروں گی جب مجھے اس پر یقین ہوگا۔ اس نے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ میرے یقین محکم اور اصول پسندی کی بدولت اسے رہائی نصیب ہوئی ورنہ

عالم یہ تھا کہ اسے خود بھی رہا ہونے کی امید نہ رہی تھی۔ رہائی کے بعد اسے وہی پر تیخ کرنے پڑے جو اس نے میرے لیے وضع کیے تھے۔ اب میں ایک نئی عورت تھی۔ لیکن پہلے سے مختلف مجھے ان مقاصد پر یقین تھا جو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ انہیں حاصل کرنا ممکن ہے۔ میں ذہنی طور پر اس سے زیادہ بالغ ہو چکی تھی۔ مجھے نیچا دکھانا اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ اسے عدیلہ درکار تھی جس پر اس کا رعب رہے گا جیسے میں بائیس برس کی عمر میں اس کے رعب میں رہتی تھی۔

محفوظ ہونے کا احساس اور محنتِ شاقہ۔ مصطفیٰ کے ہاں دونوں کا فقدان تھا۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے اقتدار تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جب آدمی شارٹ کٹ سے اقتدار حاصل کرنے کا متمنی ہو تو سب سے پہلے اس کی اصول پسندی مجروح ہوتی ہے۔ مصطفیٰ کے آدرش محض چارا تھے جن سے سادہ لوحوں کو پھنسانا مقصود تھا۔ عوام بیلٹ بکس کا پیٹ بھرنے کے لیے تھے۔ انہیں ایک دفعہ الو بنانا کافی تھا۔ وہ اپنے کو غیر طبقاتی بنانا نہ چاہتا تھا۔ اس کے پاس معاشرے کے ڈھانچے کی تنظیم نو کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اسے پتہ تھا کہ جس نئے نظام کا وہ رندھی ہوئی آواز میں ذکر کرتا رہتا ہے اس میں اس جیسوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ میں اس کے ضمیر میں چبھنے والا کانٹا تھی۔ میں اس کے حلق میں پھنس گئی تھی۔ میں اسے ہر وقت یاد دلاتی رہتی تھی کہ کیا کرتا ہے۔ میں بوجھ بن گئی تھی۔ وہ اس طرح اپنا کام نہیں چلا سکتا تھا کہ میں اس کے کندھوں پر سے یا میز کے نیچے جھانکتی رہوں۔ اس کی خواہش بس اتنی تھی کہ آخر کار اسے وزارت، جھنڈے والی کار اور پروٹوکول مل جائے۔ چاہے یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے اپنے حلیفوں سے بے وفائی کرنی پڑے اور حلیفوں کے جسموں کو روندنے کے بعد اقتدار کے بابِ عالی میں حکمران کی حیثیت سے قدم رکھنے کا موقع ملے۔

مجھے تباہ کرنا مصطفیٰ کے لیے ضروری ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی اور عورت آ جاتی تو مجھے تباہ نہ کر سکتی تھی۔ میں اس سے نمٹ لیتی۔ لیکن عدیلہ! بات صرف اتنی نہ تھی کہ عدیلہ کو وہ اس لیے کام میں لانا چاہتا تھا کہ وہ نوجوان اور خوبصورت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بھی الٹے قدموں چل کر ماضی کی تہمینہ بن جاؤں۔ بات بات پر سمجھوتہ کرنے والی، خوف زدہ، فرماں بردار اور دامن سے چمٹی رہنے والی تہمینہ۔ ایسی تہمینہ جس میں اعتماد نام کو نہ ہو۔ وہ کامیاب رہا۔ عدیلہ کے منظر پر دوبارہ ظاہر ہونے سے میری ازدواجی زندگی کی بنیادیں ہل گئیں۔ لیکن اس بار میں زیادہ مضبوط تھی۔ مجھے اپنا کردار بنانا تھا۔ یہ میں ان آنکھوں میں دیکھ چکی تھی جن کی میں نے تصویریں بنائی تھیں۔ ہمارے وطن کے ایمان دار، سادہ اور افلاس زدہ عوام کی آنکھوں میں، جن کی بدنصیبی یہ

ہے کہ انہیں مصطفیٰ کھر جیسے رہنما ملے ہیں۔

جو ضربیں خوب تاک تاک کر اس نے مجھ پر لگائی تھیں میں ان کے نتیجے میں تقریباً چت ہو گئی۔ ویسی ہی بن گئی جیسی وہ مجھ سے توقع رکھتا تھا۔ میں نے اس سے علیحدگی اختیار نہ کی۔ میں نے ان کی عشق بازی کو روکنا چاہا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی شادی کو بچانے کی سعی کی۔ اپنے مقام سے گر کر پھر وہی قابل رحم، شبہات کی ماری، حاسد اور ناشاد و نامراد بیوی بن کر رہ گئی۔ مجھ سے نامعقول حرکتیں سرزد ہوئیں، مثلاً عدیلہ سے دو بدو ہوئی، مصطفیٰ کو یہ ثابت کرنے پر مجبور کیا کہ وہ مجھے عدیلہ پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے خاندان سے ٹکرا گئی۔ میری سمجھ میں آگیا کہ مصطفیٰ کتنا خبیث ہے، وہ کس طرح میری شخصیت کو کچل رہا ہے، اس عفریت کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر رہا ہے جسے اس نے خود خلق کیا تھا۔ لیکن وہ یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ مجھ میں کتنی لچک ہے۔ میں دل میں یہی دہراتی رہی کہ لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر، کیا کیجے۔ میں غیظ و غضب کے ایسے پیکر میں تبدیل ہو گئی جس پر وہ قابو نہ پاسکا۔ غیظ و غضب کا ایسا پیکر صرف وہی عورت بن سکتی ہے جس کی تذلیل کی گئی ہو۔ اگر میری نفرت مجھے دھکیل کر اس کے گھر سے باہر لے گئی تو اپنے آدرشوں سے میری محبت نے مجھے اس کے دروازے سے دور نکل جانے کا رستہ دکھایا۔ میں بچ گئی ورنہ زہر میری رگ و پے میں سرایت کر جانے کو تھا۔ زہر کی چند خوراکیں اور ملتیں تو میری روح مردہ ہو جاتی۔ ہمیشہ کے لیے۔

میرے بارے میں مصطفیٰ کھر نے جتنے تخمینے لگائے تھے سب غلط نکلے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے حصے میں جو عظمت آئے گی میں بھی اس میں شریک ہونا چاہوں گی۔ اس نے میرے کردار کا جو اندازہ لگایا تھا وہ سطحی اور بھونڈا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میرا ردعمل بھی اس کے اپنے ردعمل جیسا ہو گا اور اقتدار کے ان روکھے سوکھے ٹکڑوں کو دیکھ کر، جواب اسے ڈالے جا رہے تھے، میری رال ٹپکنے لگے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جس پوزیشن پر فائز ہے اس کا مستحق نہ تھا۔ اس مقام تک وہ سمجھوتوں اور شارٹ کٹوں کے ذریعے پہنچا تھا۔ عوام کو فریب دے کر پہنچا تھا۔ ایسے آدمی سے مزید راہ و رسم رکھنا میرے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ ہم نے علیحدگی اس بنا پر اختیار کی تھی کہ ہم میں مطابقت موجود نہیں۔ زیادہ بچے تلے انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم میں کیا ذہنی، کیا سیاسی، کیا اخلاقی، کسی قسم کی ہم آہنگی نہ پائی جاتی تھی۔ اگر وہ جلاوطن ہوتا یا جیل میں پڑا ہوتا یا اپنے عوام کے ساتھ ہوتا تو میں بدستور اس کا ساتھ دیتی رہتی۔ لیکن میں اس بنا پر نہیں رہ سکتی تھی کہ اس کے پاس اقتدار ہے، دولت ہے، اثر و رسوخ ہے۔ میری نظر میں یہ وقتی فائدے کی خاطر اپنی اہلیت کا سستا سودا کرنے کے مترادف تھا۔

میں سہمی سہمی، بے گھر، بچوں کے بغیر، کنگال، اکیلی اسے چھوڑ کر چل دی لیکن شکر ہے، ہر طرح کے بگاڑ سے بچی رہی۔ میں نے عین وقت پر رشتہ توڑ لیا تھا۔

اکیلے میں جب میں اپنے تتر بتر خیالات کو یکجا کرنے لگی تو پتہ چلا کہ مصطفیٰ ایک بار پھر صاف بچ نکلا۔ اسے جھوٹوں بھی سزا نہ ملی۔ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ قسمت نے ایک خاص مقصد کے لیے مجھے اس پرپیچ راہ پر لاکھڑا کیا ہے۔ میں مصطفیٰ کو مکافات کو پہنچاؤں گی۔ اس کی آخری تباہی کا ذریعہ بنوں گی۔ میرا ہتھیار میری سچائی ہو گی۔ ہمارا معاشرہ بہت گھٹا ہوا ہے۔ یہاں اگر کوئی عورت اپنے بہت ہی نجی رازوں سے پردہ اٹھا دے تو یہ حرکت بہت سوں کو فحش معلوم ہو گی۔ لیکن خاموش رہنا زیادہ بڑا جرم ہے۔ خاموش رہ کر آپ ناانصافی کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے ہم میں خوئے غلامی پرورش پاتی ہے اور ایک ناپاک منافقت پروان چڑھتی ہے۔ مصطفیٰ کھر اور دوسرے جاگیردار ہماری خاموشیوں کی وجہ سے پنپتے رہتے ہیں۔

میں نے اس کی سیاسی قلابازیوں کا حساب لگایا۔ جو تصویر سامنے آئی وہ ایک بزدل، ناکام اور غلطیوں پر غلطیاں کرنے والے انسان کی تھی۔ لاہور کے حلقہ چھ سے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے والا، 1977ء کے انتخابات میں باہر بیٹھا رہنے والا، جنرلوں سے سودے بازی کرنے کے بعد جلاوطن ہو جانے والا، جنرلوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان سے پھر جانے والا، بھارتی جاسوسی ایجنسیوں سے اٹکھیلیاں کرنے والا، ہماری فوج کو برا... کی سازش کرنے والا، پی پی پی کو ہائی جیک کرنے کا منصوبہ بنانے والا، ایک اور سودے بازی کے بعد پاکستان لوٹ آنے والا کیونکہ اس کے سوا چارہ کار نہ تھا، جیل جانے والا، فوج سے سمجھوتے بازی کرنے والا، بے نظیر کے عروج پر منہ چھپا لینے والا، عدم اعتماد کے ووٹ سے ذرا پہلے اپنے دوست جتوئی صاحب سے بے وفائی کرنے والا، دوبارہ پی پی پی میں شامل ہونے والا اور آخر کار اپنا خنجر، جس سے پہلے ہی لہو ٹپک رہا تھا، پارٹی کی پیٹھ میں گھونپنے والا۔ اس نے خطابت کے زور شور سے ان تمام کارناموں اور غلط کاریوں پر پردہ ڈال دیا۔ جو اس پر یقین رکھتے تھے ان کے دل سے مصطفیٰ بالکل اتر گیا۔ اس نے ایک قابل حصول آدرش کو غیر حقیقت پسندانہ خواب میں تبدیل کر دیا تھا۔

جس روز مصطفیٰ نے میرے سفید لباس کا مذاق اڑایا تھا میں اسی دن سمجھ گئی تھی کہ اس کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔ وہ محض اور نرا موقع پرست ہے، ایک بونا پارٹسٹ جسے تاج کا لالچ محض اس لیے ہے کہ وہ اس کے سر پر خوب سجے گا۔ جسے ذہانت اور بصیرت سے تعبیر کیا جاتا تھا وہ حیلہ سازی اور مکاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ملک کے ساتھ وہی سلوک کرے جو میرے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ کر چکا تھا

اسے روکنا ضروری تھا۔

میں نے آخر کار اس کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی ٹھان لی۔ میں نے میاں نواز شریف سے رابطہ قائم کیا۔ جب میں اس کے دفتر میں داخل ہوئی تو مجھ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ وہ ہمارا سب سے بڑا دشمن رہ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیسی ستم ظریفی ہے کہ میں اس حیثیت میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ایک دن مصطفیٰ آپ کی جگہ پر ہوگا اور میں اس کے پہلو میں۔" میں نے اسے بتایا کہ میں جاگیردارانہ ذہنیت اور عورتوں کے استحصال کے خلاف میدان میں اترنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ مصطفیٰ نواز شریف کا سب سے کٹر دشمن تھا۔ صوبے پر وزیر اعلیٰ کی مضبوط گرفت ختم کرنے کے لیے مصطفیٰ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کو تیار تھا۔ مصطفیٰ کو اپنے رقیب کے خلاف پی پی پی نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پی پی پی اس پوزیشن کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہشمند تھی جو نواز شریف نے اپنی فراست سے پنجاب میں جیت لی تھی۔

نواز شریف جاگیردار طبقے کے لیے بالعموم اور مصطفیٰ کھر کے لیے بالخصوص خطرہ بن چکا تھا وہ نوجوان تھا اور اس نے خود کو اہل منتظم ثابت کیا تھا۔ پاکستانی سیاق و سباق میں، طبقاتی اصطلاح میں، وہ ترقی پسند تھا کیونکہ بورژوا اور چھوٹے بورژوا طبقے کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ خود صنعت کار تھا جس نے سیاست میں قدم رکھا تھا، اس سیاست میں جسے کسی زمانے میں ہمارے ملک کے اندرونی زرعی علاقے کے فارغ البال صاحبان کا کھیل تماشا سمجھا جاتا تھا۔ بطور سیاست دان وہ رو بہ ترقی تھا، رو بہ زوال نہیں۔

عورتوں کے بارے میں اس کے کیا خیالات ہیں، اس سلسلے میں مجھے کچھ تشویش تھی۔ میں آزاد خیال انگریزی اخبارات پڑھتی رہی تھی۔ ان کا نواز شریف کو پیش کرنے کا جو انداز تھا اس میں مدح و ثنا کا کوئی پہلو نظر نہ آتا تھا۔ میں نے دیکھا عورتوں کے موضوع پر نواز شریف کے نقطہ ہائے نظر ترقی پسندانہ اور جدید ہیں۔ مجھے ایک مضبوط پلیٹ فارم مل گیا۔ مجھے تحفظ دینے کے لیے اتنا کافی تھا۔ اب میں مصطفیٰ کھر اور ان تمام چیزوں سے ٹکر لے سکتی تھی جن کی وہ نمائندگی کرتا ہے میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئی۔ یہی وہ جماعت تھی جو پاکستان بنانے میں پیش پیش رہی تھی۔ وہ قائداعظم کے آدرشوں کی امین تھی۔ میں مصطفیٰ پر جتا دینا چاہتی تھی کہ میں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ اسے پتہ چل جائے کہ میں اس کے دشمنوں کے ساتھ ہوں، دوستوں کے ساتھ نہیں۔

میرے فیصلے پر مصطفیٰ جھینپا بھی گھبرایا بھی۔ اس کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ میں میاں

نواز شریف کے ہاتھوں بک گئی ہوں۔ مصطفیٰ نے اس بازار میں خاصی عمر گزاری ہے جہاں اصولوں کے سودے ہوتے ہیں۔ میاں نواز شریف نے نہ تو مجھے کوئی پیشکش کی تھی نہ میں نے کہا تھا کہ میری مادی یا کسی اور قسم کی مدد کی جائے۔ میں مصطفیٰ اور اس ذہنیت کے خلاف، جس کی وہ علامت بن چکا ہے، نبرد آزما ہو گئی۔

اس اثنا میں عدیلہ کے شوہر مطلوب کو اپنی بیوی اور مصطفیٰ کے یارانے کا ٹھوس ثبوت مل گیا۔ جب شبہات نے مطلوب کو زیادہ برانگیختہ کیا تو اس نے اپنا ٹیلی فون ٹیپ کرنا شروع کر دیا۔ مصطفیٰ اور عدیلہ کی گھنٹوں لمبی گفتگو مقناطیسی ٹیپ پر منتقل ہو گئی۔ مطلوب روز گھر آتا، کیسٹ نکالتا، اسے اپنی کار کے کیسٹ پلیئر میں ڈالتا اور کراچی میں بے مقصد ڈرائیونگ کرتے ہوئے سنتا رہتا کہ کس طرح وہ دونوں اس کی شادی کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں، سازشیں کر رہے ہیں۔ جب آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے ہوتے تو اس کے لیے خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ آنسوؤں کی تپش سے اس کے رخسار سلگ اٹھتے۔ کسی کی بے وفائی پر بہنے والے آنسو ہی اس طرح رخساروں کو جلا سکتے ہیں۔ مطلوب نے مصطفیٰ سے ٹکر لینے کی ٹھان لی۔ اس نے یہ ٹیپیں اپنی بیوی اور میری امی کو سنائیں پھر زنا کاری کے ثبوت سے لیس ہو کر لاہور آ گیا۔

اس نے عدالت میں ایف آئی آر درج کرائی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ زنا کاری کے مقدمے میں کوئی جاگیر دار کسی دوسرے جاگیردار کو عدالت میں کھینچ لایا ہو۔ یہ بھی پہلی بار تھا کہ حدود آرڈیننس کے تحت زناکاری کا مقدمہ ایسی عورت کے خلاف درج ہوا جو ہمارے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

مطلوب نے ترقی پسندانہ موقف اختیار کیا تھا۔ اپنی عزت آبرو کی بحالی کے لیے اس نے غصے سے اندھے ہو کر کوئی جرم کرنے کے بجائے عدالت سے رجوع کیا تھا۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے انصاف کی ترازو طاقتور اور بااثر فریق کے حق میں جھک گئی۔ مصطفیٰ کھر کو داد و تحسین سے نوازا گیا اور پی پی پی کے کارکن اسے کندھوں پر اٹھا کر عدالت کے کمرے سے باہر لائے۔ پی پی پی کے رہنما، طارق رحیم، احمد سعید اعوان اور سلمان تاثیر اس کے جلو میں تھے۔ مصطفیٰ کی زنا کے مقدمے میں ضمانت ہو گئی تھی۔ پاکستان میں غریب اور مراعات سے محروم طبقے کے افراد کو اسی طرح کے مقدمات میں فوراً حوالات بھیج دیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مطلوب نے غلط وقت چنا تھا۔ مصطفیٰ اس وقت پی پی پی کا اہم ترین رہنما تھا۔ وہ پنجاب میں، لاہور-99 سے، ایک ایسے الیکشن میں مشغول تھا جس میں ہر فریق یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا زور زیادہ ہے۔ مصطفیٰ یہ عذر لایا کہ مقدمہ اس کے سیاسی حریف، میاں نواز شریف، کے اکسانے پر دائر کیا گیا تھا۔ اس نے

کہا کہ جاگیرانی فاؤل کھیل پر اتر آئے ہیں اور اب وہ زخمی شیر کی طرح لڑے گا۔ مقدمے کی ایسی تیسی ہو گئی۔ مصطفےٰ کھر پھر بچ نکلا لیکن مجھیں آج تک چیخ چیخ کر کہتی ہیں مجرم، مجرم"۔

مطلوب بہت افسردہ خاطر ہوا۔ اسے اپنے قدامت پسند خاندان اور قبیلے کے قہر کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے خاندان والوں نے الزام لگایا کہ وہ میرے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے مصطفےٰ اور عدیلہ سے انتقام لینے کے لیے مطلوب کو مہرے کے طور پر استعمال کیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ ایف آئی آر میں کیا لکھوایا گیا تھا۔ مصطفےٰ نے مطلوب پر الزام لگایا کہ اسے میاں نواز شریف نے خرید لیا ہے، حالانکہ مطلوب وزیر اعلیٰ سے ملا تک نہیں تھا۔ کیچڑ اچھالنے کی اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ ٹھوس ثبوت کو غیر معتبر بنا دیا جائے۔

میں نے طے کیا کہ کھری کھری سنانے کا وقت آگیا ہے۔ تباہ حال مطلوب میرے پاس آیا۔ وہ برباد ہو چکا تھا۔ بے وفائی کی وجہ سے پہنچنے والے دکھ نے اسے معقول انداز میں سوچنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ وہ اب بھی اپنی بیوی سے پیار کرتا تھا اور اس وجہ سے اس کا کرب کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ عدیلہ اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے وزنی کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ ہم اس مستطیل کے وہ دو ضلع تھے جنہیں بڑی بے دردی سے کھاڑ پھینکا گیا تھا۔ ہمارے ساتھ ہونے والی بے وفائی ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔

مصطفےٰ بڑی بے حیائی سے اکڑتا پھرتا رہا۔ پی پی پی کا ہیرو جو ٹھہرا۔ آزاد خیال لوگ اس کی حمایت کرنے لگے اور اس کی ہر خطا معاف کرنے کو تیار ہو گئے۔ ان کی نظر میں مصطفےٰ وہ آدمی تھا جو پنجاب سے ضیاء حکومت کی باقیات کا صفایا کرنے آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دوست پیچھے ہٹنے لگے ہیں۔ مصطفےٰ سیاسی طور پر ہر کسی کے لیے اتنا اہم ہو چکا تھا کہ انہیں توفیق ہی نہ ہوئی کہ ٹھہر کر ذرا سوچ لیں کہ اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے مجھ پر الزام لگا کہ میں اپنے خود غرضانہ اور پیچ پوچ مقاصد کے لیے جمہوریت کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہوں۔ مطلوب کی کارروائی کا ان دانشوروں نے مذاق اڑایا جو ہماری رائے عامہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ "نواز شریف جانے نہ پائے" کی مہم کہیں زیادہ اہم تھی۔ مجھ پر الزام لگا کہ نواز شریف کا پچھورے کرتبوں والا بریگیڈ میری مدد اور مجرمانہ اعانت کر رہا ہے۔

میں نے تیرہ سال میں پہلی بار پریس کانفرنس طلب کی۔ وہ بات جو محض افواہ تھی میں نے اس کی سچائی کی تصدیق کر دی۔ میں نے سب کچھ پوست کندہ بیان کر

دیا۔ میں نے کہا کہ مطلوب سچ بول رہا ہے۔ میں نے مصطفےٰ اور عدیلہ کی وجہ سے طلاق لی تھی۔ پہلے ان باتوں سے میں اپنی بہن کا گھر بار اور خاندان کی خاطر انکار کرتی رہی تھی۔ میں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ مصطفےٰ نے اپنی سالی سے زنا کر کے نہ صرف قرآن کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ از روئے قانون زنا بالجبر کا مرتکب بھی ہوا ہے۔ اس نے عدیلہ سے جنسی تعلقات تیرہ سال پہلے قائم کیے تھے۔ اس وقت میری بہن ابھی بچی تھی۔ میری باتوں کا بہت برا مانا گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ مجھے پُر وقار رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے معاشرے کی ان لکھوکھا عورتوں کی طرح محسوس کیا جن کے ساتھ زبردستی زنا کیا جاتا ہے اور وہ جائے واردات سے اٹھ کر چلی جاتی ہیں، محض اس لیے کہ کسی سے کہیں گی تو جگ ہنسائی ہوگی۔ کسی پاپی کو ہرگز یہ اجازت نہ ملنی چاہیے کہ اس کے جرم پر صرف اس لیے پردہ پڑا رہے کہ معاشرہ بہت نازک مزاج ہے اور ایسی باتیں سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ عورتوں کو چاہیے کہ یا تو آواز بلند کریں یا پھر جوتیاں کھاتی رہیں۔

عدیلہ بچ گئی۔ خاندان نے اسے تحفظ دیا۔ سب کے سب وہی پرانا راگ الاپتے رہے۔ میں پاگل ہو چکی ہوں۔ دل سے باتیں گھڑتی رہتی ہوں۔ مجھے اور مطلوب کو میاں نواز شریف نے خرید لیا ہے۔

ان سب نے وہ مجھیں سنی تھیں۔ اتنی بار سنی تھیں کہ ان کی طبیعتوں کی حساسیت بھی، کند اور سخت ہو جانے کے باوجود، پکار اٹھی تھی کہ "بس" میں نے یہ مجھیں سنی تھیں۔ جب مجھیں گھوم گھوم کر الزام کی تصدیق کرنے والی گواہی اگل رہی تھیں تو میری انتڑیاں الٹنے لگیں۔ مجھے لگا کہ میں قے کرنے والی ہوں۔

مصطفےٰ نے انتقامی کارروائی کی۔ مجھے بچوں سے ملنے سے روک دیا۔ میں نے اخباروں کے ذریعے ان کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ میں نے وزیراعظم کو تار بھیجا۔ وہ خود بھی ماں ہے۔ بات اس کی سمجھ میں آنی چاہیے۔ اگر وہ اپنے پلیٹ فارم پر جمع رہنماؤں کا کنٹرول نہیں کر سکتی تو اسے چاہیے کہ انہیں اس بنا پر اپنی نام نہاد جمہوری پارٹی سے نکال دے کہ وہ قانون اور میرے قانونی حقوق کا پاس نہیں کرتے۔ مصطفےٰ راضی ہو گیا کہ بچے محدود وقت کے لیے مجھ سے مل سکتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ مصطفےٰ ایک نہ ایک دن ٹھوکر کھائے گا۔ میں اس کا ذہن پڑھ سکتی تھی۔ میں پی پی پی کے اعلیٰ عہدے داروں کو خبردار کر چکی تھی۔ کہ وہ پارٹی کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور یہ کہ اگر وہ اس مساعی میں ناکام رہا تو پارٹی کے دشمنوں کی طرف دست تعاون بڑھا کر پارٹی کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ

اپنی بت سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ وہ جتوئی صاحب کو دغا دیتے ہوئے ذرا نہ ہچکچایا حالانکہ وہ اس کے وفادار دوست تھے۔ انہوں نے سالہا سال اس کا ساتھ دیا تھا۔ عدم اعتماد کی تحریک سے ذرا پہلے وہ بک گیا اور اس طرح اس نے جتوئی صاحب کو آئینی ذرائع سے وزیراعظم بننے سے محروم کر دیا۔ اس نے اپنی قلابازی کے جواز میں کہا کہ بے نظیر کو ہٹانے کی تحریک جمہوریت کے خلاف ووٹ ڈالنے کے مترادف تھی۔ جب وہ اسمبلی ٹوٹنے اور اپنی قائد کی وزیراعظم کے عہدے سے برطرفی کے بعد جتوئی صاحب کے ماتحت نگران حکومت کے وزیر کے طور پر حلف اٹھا رہا تھا تو میں حیران ہو کر خود سے پوچھنے لگی۔ "جمہوریت آخر کہاں گئی؟"

مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ میں اتنی آسانی سے بیوقوف کیوں بنتی رہی؟ اس کی دروغ گوئیوں، بے وفائیوں اور تشدد کے باوجود مصطفیٰ پر میرا یقین متزلزل کیوں نہ ہوا؟ مصطفیٰ کے جال میں پھنسنے والی صرف میں ہی نہیں ہوں۔ اسے دوسروں کو قائل کرنا کل بھی آتا تھا، آج بھی آتا ہے اس نے بھٹو صاحب، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، جنرل ضیاء، بے نظیر بھٹو، غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام اسحاق خان کو قائل کر کے چھوڑا۔ یہ کل ملا کے پانچ وزرائے اعظم اور دو صدر ہوئے۔ حکومتوں اور ملکوں کے ان سربراہوں کے علاوہ مصطفیٰ ان لوگوں کو بھی اپنا وفادار بنائے رکھنے میں کامیاب رہا جنہوں نے برسہا برس تعذیبی کیمپوں اور قید خانوں میں گزارے۔ اس کی باتیں عوام کے ایک بہت بڑے حصے کو قابل اعتبار معلوم ہوتی رہیں۔ گو وہ بڑی ڈھٹائی سے دائیں بائیں ہوتا رہا ہے لیکن عوام نے اس کے بارے میں گرم جوشی ظاہر کی ہے۔ میں تو آخر اس کی بیوی تھی۔

اس بیہودہ الجبیڑے سے اڑنے والی گرد ابھی بیٹھی نہ تھی کہ مصطفیٰ نے ایک اور شادی کر لی۔ یہ حرکت سوچ سمجھ کر کی گئی تھی تاکہ اپنے اوپر لگنے والے الزاموں اور تہمتوں کا رخ موڑا جاسکے۔ دیدہ دلیری دیکھیے کہ اپنی بہت سی شادیوں کے جواز میں کہا کہ رسولؐ اللہ نے بھی بہت سی شادیاں کی تھیں۔ اس کی نئی بیوی بائیس برس کی تھی۔

اس کی شادی سے ذرا پہلے ہم نے بچوں کے مستقبل پر بات چیت کرنے کے لیے ملاقات کی۔ اس نے پیشکش کی کہ لکھو تو بے نظیر سے بات کر کے تمہیں کوئی کام دے کر باہر کے کسی ملک بھجوا دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے امید ظاہر کی کہ یہ اس کی آخری شادی ثابت ہو گی۔ کہنے لگا۔ "جس لڑکی سے شادی کر رہا ہوں اس میں مجھ سے پیار کرنے کی جتنی صلاحیت ہے تم میں کبھی نہ تھی۔" میں اس کی سطحیت پر ششدر رہ گئی۔ میں نے اس شخص سے محبت کی تھی، یہ پروا کیے بغیر کہ وہ میرے ساتھ

کیا کرتا رہا ہے۔ میں نے اس شخص سے محبت کی تھی، یہ خیال کیے بغیر کہ وہ اصل میں کیا ہے۔ ہم نے ابتلا کے پندرہ سال ساتھ گزارے تھے۔ اس بیچاری معصوم لڑکی کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مصطفیٰ ہے کیا بلا۔ اسے مصطفیٰ کے بارے میں وہی کچھ پتہ تھا جو مصطفیٰ نے خود بتا دیا تھا۔ ان کی صرف ایک مہینے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس دن میں نے دو فیصلے کیے۔ میں نے اسے بتایا۔ "اب میں تمہارے بارے میں کوئی بیان جاری نہیں کروں گی۔" وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ "میری شادی کے بارے میں بھی کچھ نہ کہو گی؟" میں نے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔"

دوسرا فیصلہ اس دن میں نے یہ کیا کہ یہ کتاب لکھوں گی۔ میں نے طے کیا کہ اپنی زندگی کے ان پندرہ برسوں کو رائیگاں نہ جانے دوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں اوروں کو شریک کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ شاید ہمارے لوگوں کو ہماری سیاست سے، ہماری قیادت سے، قائدین کی اقدار، ذہنیت، ان کے اسلامی اصولوں اور عورتوں کے بارے میں ان کے خیالات سے آگاہی حاصل ہو جائے۔ میں نے سوچا کہ اس ریاکاری کو پہلا پتھر میں ماروں گی جو ہمارے خاموش رہنے کی وجہ سے بیماری کی طرح ہمیں چمٹ گئی ہے۔ میں بیٹھ گئی۔ میں نے لکھنا شروع کر دیا۔